استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات

(مع ۱۴ مزید تقاریر)

دار الثقلین

اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات

(مع ۱۴ مزید تقاریر)

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار الثقلین
DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات

تقاریر: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ: مجلسِ مترجمین

ناشر: دار الثقلین

تاریخ اشاعت: صفر ۱۴۲۷ھ مارچ ۲۰۰۶ء

قیمت: ۱۰۰ روپے

انتساب

بنام

صاحب تفسیر المیزان

مفکرِ اسلام علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

فہرست

عرضِ ناشر ۔۔۔۔ ۱۵
۱۔ اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات ۔۔۔۔ ۱۷
قانونِ ضرورت ۔۔۔۔ ۱۸
فرمانِ رسول ۔۔۔۔ ۲۰
آج کے انسان کی ضرورت ۔۔۔۔ ۲۱
نفاق ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مظہر ۔۔۔۔ ۲۲
ایمان تمام مقدسات کی بنیاد ۔۔۔۔ ۲۳
حالیہ زمانوں میں دین سے روگردانی کی بنیاد ۔۔۔۔ ۲۴
کلیسا کی غلطیاں ۔۔۔۔ ۲۶
یورپی تہذیب پر اسلام کے اثرات ۔۔۔۔ ۲۶
ان تینوں اصولوں کے شواہد ۔۔۔۔ ۲۹
۱۔ انسانی حیثیت کو اہمیت دینا ۔۔۔۔ ۲۹

۲۔حدودِ دین میں عقل کا حق ــــــ ۲۹
۳۔عمل اور سخت کوشی کا احترام ــــــ ۳۰
اقبال کی نظر میں آج کے انسان کی ضروریات ــــــ ۳۲
قانونِ ضرورت کے تین ارکان ــــــ ۳۴
۲۔اسلامی قوانین کا جدید دنیا کی ترقی و تغیر سے موازنہ ــــــ ۳۹
معاشرے کے تین گروہ ــــــ ۴۰
تاریخ انسانی کے تحول کا سبب ــــــ ۴۳
اصولِ تغیر پر مبنی منطق ــــــ ۴۴
جواب ــــــ ۴۵
دوسری منطق: انسانی زندگی کا قانون متغیر ہے ــــــ ۴۶
جواب ــــــ ۴۸
ثباتِ اخلاق ــــــ ۵۰
زمانے کی عصمت کا مسئلہ ــــــ ۵۱
ہماری ذمے داری ــــــ ۵۵
اسلام میں عقل کا اصول ــــــ ۵۷
اسلام کا زندگی کی شکل کی بجائے اسکی روح پر توجہ دینا ــــــ ۵۹
آقائے شیخ علی زاہد کا واقعہ ــــــ ۶۰
۳۔غدیر اور مسلمانوں کو اندر سے درپیش خطرہ ــــــ ۶۵
پہلا نظریہ ــــــ ۶۸
دوسرا نظریہ ــــــ ۶۸
حکمِ الٰہی کے نفاذ میں حضرت علی کے غیر لچکدار طرزِ عمل کی ایک مثال ــــــ ۶۹
صحیح نظریہ: مسلمان فریب کھا گئے ــــــ ۷۰

اتمام اور اکمال کے درمیان فرق ـــــ ۷۲
مشیت الٰہی کی کیفیت ـــــ ۷۴
پیغمبر اسلام کی دو حدیثیں ـــــ ۷۶
ایک دوسری حدیث ـــــ ۷۸
اسلامی معاشرے کو داخلی خطرہ درپیش ہے ـــــ ۷۹
امیر المومنین کی مشکلات ـــــ ۸۰
حضرت علی کے اکابر اصحاب کا تردد ـــــ ۸۲
نتیجہ ـــــ ۸۴
۴۔ اسلام کی آزادی بخش تحریک (۱) ـــــ ۸۷
اسلام کی دعوت کا نقطۂ آغاز ـــــ ۸۹
آزادی اور غلامی' دونوں کی دعوت ـــــ ۹۱
آزادی کا صرف نعرہ کافی نہیں ہے ـــــ ۹۴
ایک تربیت یافتہ بلی کا قصہ ـــــ ۹۵
آج کی دنیا کی غلطی ـــــ ۹۶
قرآن و حدیث میں آزادی کے نعرے ـــــ ۹۸
اسلام نے آزادی کی بنیادیں فراہم کی ہیں ـــــ ۱۰۰
لوگوں کی آزادی تین پہلوؤں سے سلب ہوتی ہے ـــــ ۱۰۴
سلب آزادی کو روکنے کے لئے اسلام کا طریقہ ـــــ ۱۰۵
زبوں پروری کے خلاف اسلام کی جنگ ـــــ ۱۰۷
۵۔ اسلام کی آزادی بخش تحریک (۲) ـــــ ۱۱۱
آزادی کی اہمیت ـــــ ۱۱۱
انسان کے بارے میں ملائکہ کی رائے ـــــ ۱۱۴

کیا علم آزادی مہیا کرسکتا ہے — ۱۱۶
بوذرجمہر اور نوشیرواں کا واقعہ — ۱۱۸
آج کے انسان میں منافقت کی زیادتی — ۱۱۹
ہابز کا قول — ۱۲۰
حقیقی تحریکیں انبیا اور ان کے پیروکاروں کی ہیں — ۱۲۲
اسلام کی دی گئی آزادی کی دو خصوصیات — ۱۲۵
آج کی دنیا کا تضاد — ۱۲۹
۶۔ مسئلۂ نفاق (۱) — ۱۳۳
منافقین کے درمیان ہم آہنگی — ۱۳۵
ہمارا دور منافقت کا دور ہے — ۱۳۷
نفاق کے لغوی معنی — ۱۳۸
منافق کی تعریف — ۱۳۹
نفاق کی ماہیت — ۱۴۱
منافقت انسان کا ایک اختصاص — ۱۴۲
منافقت کا خطرہ — ۱۴۶
رسول اللہ اور حضرت علی کی پیشرفت میں فرق کی وجہ — ۱۴۶
امیرالمومنین کا قول — ۱۴۸
منافق کے ہتھیار — ۱۴۹
حادثۂ کربلا میں منافقت کا کردار — ۱۵۰
امام سجاد کی ایک حدیث — ۱۵۱
۷۔ مسئلۂ نفاق (۲) — ۱۵۷
قیادت کی تین طریقے — ۱۵۹

بدگوئی کرنے والوں کے مقابل رسول کریم کا طرزِ عمل ـــــ ۱۶۳
ہمارے اندر موجود بیماری ـــــ ۱۶۴
کیا پیغمبر سب کے لئے رحمت ہیں یا صرف مومنین کے لئے؟ ـــــ ۱۶۹
اولین منافقین ـــــ ۱۷۳
بعد کے منافقین ـــــ ۱۷۴
آیت کی شانِ نزول، منافقین کا خطرناک ارادہ ـــــ ۱۷۵
آیات کا مفہوم ـــــ ۱۷۷
۸۔ ۱۳ کے عدد کا دفاع ـــــ ۱۷۹
۱۳ کے عدد کی نحوست کے خیال کی بنیاد ـــــ ۱۸۱
قرآنِ کریم کا بیان ـــــ ۱۸۲
دو حدیثیں ـــــ ۱۸۴
قومِ عاد کے بارے میں آیاتِ قرآن ـــــ ۱۸۵
ہماری حالت ـــــ ۱۸۶
بعض علما کی غلطی ـــــ ۱۸۸
روایات پر ایک نظر ـــــ ۱۸۹
۹۔ شعائرِ اسلامی کا احترام (۱) ـــــ ۱۹۵
تو ابین کا شعار ـــــ ۱۹۶
اسلامی شعائر ـــــ ۱۹۸
کاموں کی ابتدا کے لئے شعار ـــــ ۲۰۱
نام رکھنے کا مسئلہ ـــــ ۲۰۴
امام حسین کی عزاداری منانے کا مقصد ـــــ ۲۰۷
یزیدی حکومت میں عیسائیت کا اثر و رسوخ ـــــ ۲۱۰

عبیداللہ ابن زیاد کا کردار ۲۱۲
عمر سعد کی کمینگی ۲۱۷
۱۰۔ شعائرِ اسلامی کا احترام (۲) ۲۲۱
اصولِ معاد کے لئے ہمارے شعار ۲۲۲
ایک منٹ کی خاموشی ۲۲۳
احترامِ مسجد ۲۲۶
شعارِ اذان ۲۲۷
اسلام کا کوئی تصویری شعار نہیں ۲۲۸
لفظی شعائر ۲۳۰
اسلام میں عددی شعار بھی نہیں ۲۳۱
سلام کا شعار ۲۳۳
ہجری تاریخ کا شعار ۲۳۵
شبِ عاشور ۲۳۸
امام حسین کے خطبات ۲۴۰
امام حسین کی شہادت ۲۴۳
۱۱۔ حقیقت کی جستجو ۲۴۹
شک ۲۵۰
مقدس شک ۲۵۱
تقلید کے خلاف قرآن کی جنگ ۲۵۳
غزالی کا قول ۲۵۴
اللہ کا وعدہ ۲۵۷
درد کا فلسفہ ۲۵۹

مقدس شک یا روحانی درد ۲۶۰
حضرت علی کا کلام ۲۶۲
غیر مقدس شک ۲۶۳
اصولِ دین میں وسوسہ ۲۶۷
جوانوں کے مذہبی افکار وعقائد میں بحران ۲۶۸
دینی راہنماؤں کی مشکل ذمے داری ۲۶۹
۱۲۔ اسلام کے بین الاقوامی تعلقات ۲۷۳
تعلقات کی اقسام ۲۷۳
مسلکِ صلحِ کُل اور دین ایک انفرادی وجدانی معاملہ ہے ۲۷۴
غیر متعصب روشن فکری کا اصول ۲۷۵
بے تعصبی یا بے مسلکی ۲۷۶
سب سے محبت ۲۷۶
انفرادی اور ذوقی مسائل ۲۷۶
نظریے کے ساتھ ذمے داری بھی ہے ۲۷۹
یہ قبولیت ذمے دار اور پابند بنا دیتی ہے ۲۷۹
ذمے داری اور طاقت کا استعمال ۲۸۱
دین اور خطرے سے بچنے کی ضرورت ۲۸۲
دین، طاقت اور جبر ۲۸۲
جہاد ۲۸۳
ضوابط ۲۸۴
شادی بیاہ ۲۸۶
اسپین کے زوال میں عورت اور شراب کا کردار ۲۸۶

سورہ ممتحنہ کی آیات ۲۸۷
حاطب بن ابی بلتعہ کی داستان ۲۸۸
۱۳۔ انسان کی نجات اور آزادی ۲۹۱
تعظیم قرآن ۲۹۲
آزادی کے دو ارکین ۲۹۵
اسلامی آزادی ۲۹۷
آزادی کی دو اقسام ۲۹۷
قرآن و حدیث میں معنوی آزادی ۲۹۹
آج کی دنیا کی غلطی ۳۰۲
سماجی آزادی ۳۰۲
صدر اسلام کے مسلمانوں کا پیغام ۳۰۴
سماجی غلامی کی دو جڑیں ۳۰۶
ظالم اور مظلوم کے لئے اسلام کا حکم ۳۰۶
حق لینے والی چیز بھی ہے اور دینے والی چیز بھی ۳۰۹
۱۴۔ تاریخی تغیرات میں دین کا کردار ۳۱۱
انسان کی معاشرتی زندگی میں کمال وارتقا ۳۱۳
انسانی تہذیب وثقافت کا نقل وانتقال ۳۱۴
انسان کی اجتماعی زندگی میں تنازع ۳۱۵
قرآن کی نظر میں انسان کا مستقبل ۳۱۷
تضادات اور جنگوں کی ماہیت ۳۱۹
حق وباطل کی جنگ ۳۲۱
بعض لکھنے والوں کی غلطی ۳۲۲

قرآن کی نظر میں جنگوں کا سبب ــــــــــ ۳۲۳
علی الوردی کا قول ــــــــــ ۳۲۵
تاریخی مثالیں ــــــــــ ۳۲۷
۱۵۔ اسلامی تاریخ کے تغیرات میں واقعۂ کربلا کا کردار ــــــــــ ۳۳۱
تاریخ میں ایک شخص کا داخل ہونا ــــــــــ ۳۳۳
رسول اور امام کا فریضہ ــــــــــ ۳۳۴
فکری اور انقلابی تحریکوں میں نفاق کا خطرہ ــــــــــ ۳۳۵
بعد از رسول منافقانہ تحریک کی جانب قرآن کا اشارہ ــــــــــ ۳۳۶
بنی امیہ حضرت علی کی نظر میں ــــــــــ ۳۳۹
اسلام کی تباہی کے لئے ان کے اقدامات ــــــــــ ۳۴۱
امام حسین کی تحریک تاریخِ اسلام کا ایک اہم موڑ ــــــــــ ۳۴۵
اسلام اور اسلامی خلافت میں جدائی ــــــــــ ۳۴۷
نویں محرم کی عصر کے واقعات ــــــــــ ۳۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

زیر نظر کتاب استاد شہید مرتضیٰ مطہری علیہ الرحمۃ کی پندرہ تقاریر کا مجموعہ ہے۔ مختلف مقامات اور مختلف مناسبتوں سے کی جانے والی ان تقاریر کے موضوع بھی مختلف ہیں۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ''انتشارات صدرا'' کی جانب سے ''پانزدہ گفتار'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

یہ تقاریر اب سے تیس' پینتیس برس قبل ایران میں کی گئی تھیں لیکن انہیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج ہی اور ہمارے ہی معاشرے میں کی جارہی ہیں' ان میں جو مسائل اٹھائے گئے ہیں وہ اپنے گردوپیش ہی کے مسائل معلوم دیتے ہیں۔ البتہ یہ خصوصیت استاد شہید مرتضیٰ مطہری کے تمام ہی آثار کی خاص بات ہے۔ لہٰذا بلاجھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ استاد مطہری کی تقریباً تمام ہی کتب میں پرانے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان میں کی گئی باتیں آج ہی کی باتیں اور آج ہی کی ضروریات محسوس ہوتی ہیں۔

ان تقاریر کی سامع وہ نسل تھی جس نے ایران میں اسلامی انقلاب بپا کیا ہے۔ ایک انقلاب کے لیے کس قسم کی ذہن سازی کی ضرورت ہوتی ہے' کن کن امور پر اذہان کو صاف کرنے' کن خصوصیات کے حامل افراد تیار کرنے اور کون کون سے شعبوں میں اصلاح اور

منصوبوں پر کام کیا جانا چاہئے'ان تقاریر سے ان میں سے بھی کچھ امور کی جانب اشارات ملتے ہیں۔لہذا اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر ان افراد کے لئے نہایت مفید اور راہنمائی کا حامل ہوگا جو معاشرے کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل کے خواہشمند ہیں'اور جو مختلف سماجی موضوعات کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور ان تعلیمات کے عملی نفاذ کے لئے افرادِ معاشرہ میں لازماً پائی جانے والی خصوصیات سے واقفیت چاہتے ہیں۔

امید ہے قارئین کتاب کے مضامین' اسکے ترجمے اور اس کی طباعت کے بارے میں اپنی آراء'تجاویز اور مفید مشوروں سے ضرور آگاہ فرمائیں گے۔

اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"الحمد للّٰه ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلوۃ و السلام علی عبداللّٰه ورسوله وحبیبه وصفیه سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد (صلی اللّٰه علیه وآله وسلم) و علی اله الطیبین الطاهرین المعصومین."

اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم

"فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ."(۱)

اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات (کے موضوع میں گویا) یہ فرض کیا گیا ہے کہ عصرِ حاضر کی کچھ ضروریات ہیں اور وہ ضروریات بھی عالمی سطح کی ہیں نہ کہ مثلاً ملی، قومی یا انفرادی سطح کی۔

☆ یہ تقریر ۱۹۶۸ء میں حسینیہ ارشاد میں کی گئی۔

۱۔ پس جھاگ تو خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے۔ (سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۷)

دوسری بات یہ کہ محترم سامع کے ذہن میں یہ بات خود بخود آ جائے گی کہ جب کہا جاتا ہے کہ اسلام اور آج کی عالمی ضروریات'' تو گویا گفتگو کرنے والا شخص اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے کہ عالمی سطح پر یا عالمی پیمانے پر کچھ ضروریات اور مشکلات پائی جاتی ہیں اور صرف اسلام ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان عالمی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے اور ان مشکلات کا ازالہ کر سکتی ہے۔

قانونِ ضرورت

ضرورت و احتیاج کا قانون ایک ایسا قانون ہے جو فلسفے اور سائنس میں بہت سے مقامات پر استعمال ہوتا ہے' اور کائنات دراصل ضرورت و احتیاج کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک علت کی طرف محتاج ہونے کا معیار نیاز مندی' احتیاج اور ممکن ہونا ہے' ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ حتیٰ جزئی علوم میں بھی ضرورت و احتیاج کا کردار غیر معمولی طور پر واضح ہو چکا ہے۔

ہم اس تمہیدی گفتگو میں الجھے رہنا نہیں چاہتے' صرف اتنا اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ نظامِ خلقت میں صرف وہ چیز باقی رہ سکتی ہے جس کی ضرورت ہو اور کسی چیز کی اس ضرورت کا ہونا اسکی بقا کی ضمانت ہے۔ بالفاظ دیگر صرف وہ چیز قابل بقا ہے جو دیگر اجزائے عالم اور پیکرِ جہاں کے لئے اچھا اور مفید اثر رکھتی ہو۔ اگر وہ بے خاصیت اور بے تاثیر ہو تو اس کا زوال' فنا اور نیستی یقینی ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

''فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ.''

''پس جھاگ تو خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے۔'' (سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۷)

(قرآن مجید) پہلے ایک مثال پیش کرتا ہے۔ پہاڑوں پر برسنے والی بارش کی مثال دیتا ہے۔ وہاں سے پانی کا ایک ریلا جاری ہو جاتا ہے۔ یہ سیلاب دریاؤں اور ندیوں کو بھر دیتا ہے۔

(پانی کے) اس ریلے کے (اپنے راستے میں پڑی چیزوں سے) ٹکرانے اور مختلف آمیزشوں کی وجہ سے اس پانی پر جھاگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی بلکہ ہمیشہ ہی یہ جھاگ بہتے پانی کو ڈھانپ لیتا ہے۔

قرآنِ مجید مثال دیتا ہے کہ جو چیز مفید اور حق ہوتی ہے اسکی مثال اس بہتے پانی کی سی ہے اور جو چیز مفید و موثر نہیں اور غیر ضروری ہے اسکی مثال پانی کے اوپر کے اس جھاگ کی سی ہے۔ جھاگ ختم ہو جاتا ہے، ہوا ہو جاتا ہے لیکن پانی باقی رہتا ہے اور نتیجہ بخش ہوتا۔

پھر (قرآنِ کریم) بطورِ کلی فرماتا ہے: وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ "(اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے)

ماہرینِ حیاتیات ایک زندہ جسم کے اعضا و جوارح کے بارے میں کہتے ہیں کہ قانونِ خلقت کسی بھی عضو کو صرف اسی وقت تک باقی رہنے کی اجازت دیتا ہے جب تک وہ موثر و مفید ہے اور اسکی ضرورت پائی جاتی ہے۔ جوں ہی وہ عضو غیر موثر ہو جاتا ہے اور پھر اسکی ضرورت نہیں رہتی، تو خلقت کی منظم، خود کار اور ہدایت شدہ (Guided) مشینری اسے ختم کر دیتی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ اب تمہاری ضرورت نہیں، تمہیں ختم ہو جانا چاہئے۔ اقتصاد میں بھی ہمیشہ وہی جنس باقی رہ سکتی ہے اور بازار میں لائی جاتی ہے، جس کی ضرورت ہو۔

معاشرہ، جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس میں بھی یہی قانون چلتا ہے۔ ہر وہ چیز جس کی معاشرے کو ضرورت ہو اور جو معاشرے کے لئے مفید ہو اور معاشرے کو خیر اور کمال کی طرف لے جائے وہ نظامِ خلقت میں باقی اور انسانی معاشرے میں محفوظ رہتی ہے۔ اور اگر اس چیز کی ضرورت نہ ہو، تو اسے زبردستی، زور اور جبر سے باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔

اگر قرآنِ مجید یہ کہتا ہے کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۹) تو دلالتِ التزامی سے گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ: انسان کو اس قرآن کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ لہٰذا ہم اسے ہمیشہ محفوظ رکھیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری اور آپ کی ذمے داری ہے، ہم پر بہت بھاری ذمے داری عائد ہوتی

ہے لیکن ایک بات ہے (اور وہ یہ کہ) اگر اسلام کی اپنی ذات اور طبیعت میں عالم بشریت کی ضروریات پوری کر سکنے کی طاقت نہ ہو اور انسان کے درد کی دوا نہ بن سکے' تو ہم آپ اور حسینیہ ارشاد (۱) جیسے ہزاروں مراکز بھی اگر زبردستی اسکی حفاظت کرنا چاہیں تو ایسا ممکن نہیں القسر لا یدوم (۲) لیکن اگر اسلام میں یہ قدرت وطاقت پائی جاتی ہو' تو وہ باقی رہے گا۔ ہماری ذمے داری فقط یہ ہے کہ ہم انسان کے اندر یہ احساسِ ضرورت بیدار کریں اور یہ چیز جس کی انسان کو ضرورت ہے' اسے اس کے محتاج انسان کے سامنے پیش کریں۔ حسینیہ ارشاد جیسے مراکز کا کردار یہ ہے کہ انسان میں یہ احساسِ ضرورت بیدار کریں' اسے آگاہ کریں اور اسے متوجہ کریں کہ اسے اسلام کی ضرورت ہے۔ اسکے بعد اسلام کو صاف ستھری اور خالص صورت میں اسکے سامنے پیش کریں۔ بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد اسلام ہم سے نہیں کہے گا کہ ہم اسکی حفاظت کریں' وہ اپنی جگہ خود بنالے گا۔

فرمانِ رسول

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے' اس حدیث کو فقہا نے بھی معتبر قرار دیا ہے۔ شیخ انصاری علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ: اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن کیونکہ قدیم زمانے سے فقہا اسے سند قرار دے رہے ہیں "منجبر بعمل الاصحاب" (۳) اسلئے ہماری فقہ کی معتبر احادیث میں سے ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْاِسْلَامُ یَعْلُو وَلَا یُعْلیٰ عَلَیْہِ."

"اسلام بلند ہوتا ہے اور کوئی چیز اس پر برتری حاصل نہیں کرتی۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جملے کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ فقہا نے

۱۔ تہران کا وہ مرکز جس میں یہ خطاب کیا گیا۔

۲۔ زبردستی اور جبر کو دوام نہیں۔

۳۔ علما کے اس پر عمل کی وجہ سے اس کے نقص کا ازالہ ہو گیا ہے۔

اپنے حساب سے اس جملے کو اصطلاحاً ''انشا'' قرار دیا ہے اور اس سے تکلیفی اور وضعی حکم (۱) کے لئے استفادہ کیا ہے۔ ہم اس مسئلے پر بحث نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح ہمارا اپنا موضوع رہ جائے گا۔ متکلمین نے اسے علمِ کلام کے زاویے سے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حجت تمام حجتوں پر غالب ہے۔

اس حدیث کا ایک اور پہلو بھی ہے اور ہم اسے اسی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام میدانِ عمل میں 'میدانِ ضرورت واحتیاج میں' تنازع بقا میں (۲) فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ کے میدان میں (برتر ہے اور کوئی چیز اس پر برتری نہیں رکھتی)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے یہ بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے کہ دنیا کی ضروریات کیا ہیں اور اسلام ان عالمی انسانی ضروریات کو بہتر انداز میں پورا کرتا ہے۔

فی الحال ہم اس بحث کو بھی چھوڑتے ہیں۔

آج کے انسان کی ضرورت

یہ زمانہ جو علم وفکر' روشنی اور عقل کا زمانہ ہے' قانون کا زمانہ ہے اور نظریوں اور فلسفوں کا دور ہے۔ کیا اس زمانے کے انسان کو دین وایمان' اور وہ بھی ایک روحانی ایمان کی ضرورت ہے' یا نہیں؟ یہ خود بحث کا ایک موضوع ہے۔

ایک ایمانِ صحیح آج کے انسان کی واضح ترین ضرورت ہے' انیسویں صدی نے یہ خیال کر کے غلطی کی کہ سائنس' عقل' صنعت' فن اور ٹیکنالوجی دین وایمان کی جگہ لے سکتے ہیں۔ اس نے یہ تصور کر کے غلطی کی تھی کہ انسانی ذہن کے بنائے ہوئے نظریاتی نظام انسان کی ہدایت ورہنمائی

۱۔ اصولِ فقہ کی اصطلاحات ہیں۔

۲۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ قانونِ تنازع بقا صرف انسانوں اور حیوانوں میں نہیں بلکہ مذاہب' مسالک' ادیان' عقائد اور افکار میں بھی موجود ہے۔

کر سکتے ہیں۔ آج یہ غلطی مکمل طور پر سامنے آ چکی ہے۔

یورپی دنیا اور امریکہ میں روحانی ایمان' انبیا کے پیش کیے گئے ایمان کی ضرورت کا جو احساس پیدا ہو چکا ہے ہم اسکے بارے میں گفتگو نہیں کرتے۔ آپ کو فقط کتاب ''محمد خاتم پیامبران'' کے پہلے مقالے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ کتاب حسینیہ ارشاد کی جانب سے شائع کردہ پہلی کتاب ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ آج کی دنیا میں دین کی کیا صورتحال ہے۔ یورپی دنیا میں اس پیاس اور تشنگی کا کیا عالم ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم خود وہاں جا کر دیکھیں۔ دنیا خود ہمارے سامنے ہے۔

نفاق' ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مظہر

ہمارے زمانے کا سب سے نمایاں امتیاز' ہمارے زمانے کے معاشرتی مظاہر میں سے نمایاں ترین مظہر (Phenomena) اور ہمارے زمانے کی سب سے زبردست صنعت کیا ہے؟ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مظہر نفاق ہے۔ نفاق یعنی یہ کہ انسان کے دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ اور۔ یعنی دل اور زبان کے مابین فاصلہ۔ ہم ہمیشہ طبقاتی فاصلے کی بات کرتے ہیں۔ فلاں کیوں ارب پتی ہو اور فلاں کیوں خاک نشین؟ گو کہ یہ غلط ہے لیکن اس طبقاتی فاصلے سے زیادہ فاصلہ دل اور زبان کے مابین یہ فاصلہ ہے جو آج کے انسان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ ظاہر اور باطن کے مابین فاصلہ ہے' یہ دعوے اور عمل کے مابین فاصلہ ہے' یہ گفتار اور کردار کے مابین فاصلہ ہے۔

کس عصر اور کس زمانے میں اس قدر مقدس انسانی مفاہیم استعمال کیے گئے ہیں؟ کس عصر اور کس زمانے میں اخلاق' صلح' امن' آزادی' مساوات' اخوت' برابری' انسانیت اور حقوق انسانی کا اس قدر دم بھرا گیا ہے؟ اور ہمارے زمانے جتنا کس زمانے میں ان مفاہیم کو کھلونا بنایا گیا ہے اور ان سے کھیلا گیا ہے؟ دنیا کے دوسرے سرے سے اپنے ہوائی جہاز پر آتے ہیں اور بے گناہ لوگوں پر آتش گیر بم برساتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ آزادی کے دفاع کے سلسلے میں امریکہ کا عزم محکم ہے۔ اس دوسرے بلاک کو بھی آپ نے چیکوسلواکیہ میں دیکھا ہے۔

ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مظہر نفاق ہے اور ہمارے زمانے میں جو سب سے بڑی صنعت قائم ہوئی ہے وہ حقائق کو بدلنے کی صنعت ہے۔

یہ ہے انسانوں کی سب سے بڑی ضرورت۔ اور عصر حاضر میں انسانوں کی تمام ضروریات کی ماں۔ انسان کو لاحق تمام مشکلات بیرونی دنیا کی جانب سے نہیں ہیں۔ بلکہ بیشتر اسکی اپنی جانب سے ہیں۔ بعض امور انسانی طبیعت سے نچلی سطح کے ہیں۔ یعنی ان پر اسکی طبیعت حکومت کرتی ہے اور وہ انسانی طبیعت کے ہاتھ میں اوزار (tools) کی حیثیت رکھتے ہیں اور اوزار کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ سائنس انہی امور میں سے ہے۔ سائنس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ انسانی طبیعت پر مسلط ہو جائے۔ سائنس جس درجے پر بھی پہنچ جائے انسانی طبیعت اسے اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے' اس سے خدمت لیتی ہے اور ایک اوزار کی مانند اس سے استفادہ کرتی ہے۔ عقل' قانون' فلسفہ' فکر اور صنعت اسی قبیل سے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اسی قوت کی مدد سے انسان آسمانوں کی جانب سفر کے بارے میں سوچتا ہے اور چاند کی طرف جارہا ہے۔ سمندر' صحرا اور فضا میں کوئی نقطہ ایسا نہیں ہے جسے وہ تسخیر نہ کرسکتا ہو۔ لیکن ایک جگہ جو بچی رہ گئی ہے اور اسے تسخیر کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتا وہ خود اس کا اپنا نفس اور اسکی اپنی روح ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس قدر ترقی کے باوجود آدمیت' انسانی مزاج اور انسانیت کے پہلوؤں میں انسان کتنا آگے بڑھا ہے؟ ایک قدم بھی نہیں۔ کیونکہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا کام نہیں' ایمان کا کام ہے۔

آج کی دنیا کو مطلق طور پر ایمان کی جو ضرورت اور احتیاج ہے' یہ اس مسئلے پر ایک مختصر گفتگو ہے۔ کیونکہ ہم اپنی اس گفتگو کو ہر ممکن اختصار کے ساتھ ختم کرنا چاہتے ہیں' اس لئے اس مسئلے پر مزید گفتگو نہیں کر سکتے۔

ایمان تمام مقدسات کی بنیاد

انسان کن چیزوں کو مقدس قرار دیتا ہے؟ عدالت ایک ایسی چیز ہے جسے انسان مقدس سمجھتا

ہے' آزادی بھی انسانی مقدسات میں سے ہے' احسان بھی انسانی مقدسات کا حصہ ہے' امن و امان بھی انسانی مقدسات سے تعلق رکھتا ہے۔ سچائی' درستی اور امانت بھی انسانی مقدسات میں شامل ہیں۔ بے شک یہ سب ایمان سے وابستہ ہیں اور انسان کے پاس ایمان ہی نہیں ہے۔ اب یہ کونسا ایمان ہے؟ یہ ایمان ہم کہاں سے حاصل کریں؟ ایمان فرضی اور قراردادی نہیں ہوتا۔ ایمان یعنی وہ وسیلہ جو ہماری روح کو اپنی طرف کھینچ سکے اور جذب کر سکے۔ یعنی جو ہمارے ضمیر پر حکومت کر سکے۔ اس (ایمان) کی پہلی شرط یہ ہے کہ کم از کم ایک واضح آسمانی کتاب موجود ہو جس کے بارے میں انسان کو کم از کم یہ یقین ہو کہ یہ کتاب خود صاحبِ کتاب ہی کی طرف سے ہے۔ آقائے (محمد تقی) شریعتی کے بقول اگر ہم وحی قرآن اور نبوتِ خاتم کو دنیا سے اٹھالیں تو کوئی نبوت یکسر قابلِ اثبات نہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان ایک آسمانی کتاب پر ایمان رکھے۔ یعنی اگر ایک آسمانی کتاب موجود ہو جس پر ایک بے تعصب آدمی کم از کم غور ہی کر سکے تو وہ قرآن ہے۔ آپ کسی بھی اور کتاب کو دیکھتے ہیں تو آپ کو نظر آتا ہے کہ اس میں یہ پہلی شرط ہی نہیں پائی جاتی۔ اسکی اپنے صاحبِ کتاب سے نسبت ہی اصلاً معلوم نہیں۔ انجیل' تورات اور اوستا ایسی ہی کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر شریعتی کے بقول جن کتابوں کو آریائی پیغمبروں کی طرف نسبت دی گئی ہے' وہ ایسی ہی ہیں۔ دنیا میں وہ واحد کتاب جس کے بارے میں اس آفتاب اور اس چراغ سے روشن تر قطعیت اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسکے لانے والے کی طرف سے ہے' وہ قرآن ہے۔

حالیہ زمانوں میں دین سے روگردانی کی بنیاد

اس مقام پر زیادہ اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس بارے میں ایک اجمالی جائزہ اور مطالعہ کریں کہ حالیہ زمانوں میں انسان میں بطور کلی دین کے حوالے سے جو سرد مہری پیدا ہوئی ہے اسکی بنیاد کیا ہے؟

بلاشبہ تین چار صدیوں سے آج تک دین کے بارے میں مجموعی طور پر انسان میں ایک

طرح کی روگردانی پائی جاتی ہے اور خود عالم اسلام بھی کم و بیش اس بحران سے دوچار ہے۔ اس مسئلے کی بنیاد کیا ہے؟ کبھی کبھی بعض افراد سوال کرتے ہیں کہ آپ کے بقول دین بطور کلی انسان کی فطرت میں ہے، اگر ایسا ہے تو پھر بہت سے لوگوں نے دین سے منھ کیوں موڑ لیا ہے؟ ایک فطری امر سے تو رخ نہیں موڑا جا سکتا۔ ان دونوں سوالات کا جواب ہم اکٹھا عرض کرتے ہیں۔

انسان میں مختلف جبلتیں (instincts) موجود ہیں۔ اس میں مختلف ضروریات اور احتیاجات ہیں۔ ان تمام احتیاجات اور ضروریات کا سرچشمہ اس کی طبیعت و فطرت ہے۔ اگر آپ انسان کی ان تمام انفرادی و اجتماعی ضروریات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے پورا کریں تو انسان اپنے تمام فطری امور کی راہ پر رواں دواں ہوگا۔ لیکن بسا اوقات مختلف جبلی خواہشات کے درمیان، مختلف ضروریات کے درمیان جنگ پیدا کر دی جاتی ہے۔

فرض کیجیے کہ انسان کی طبیعی ضروریات میں سے ایک جنسی ضرورت ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ ایک روحانی اور باطنی ضرورت بھی ہے۔ اگر آپ ان دونوں ضروریات کو ان کی اپنی حد میں پورا کریں، تو کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا۔ لیکن بعض اوقات آپ ان دونوں کے مابین جنگ کھڑی کر دیتے ہیں، باہم ٹکراؤ پیدا کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں یا دینی جذبے اور اپنے دین کو پس پشت ڈالوں اور جنسی جذبے کی تسکین کروں، شادی کروں، گھر بساؤں، یا پھر اسکے برعکس اپنے دینی جذبے کی تسکین کروں اور اپنے آپ کو اس جنسی جذبے کی تسکین سے آلودہ نہ کروں۔ اس مقام پر لازماً ان میں سے ایک جذبہ جاتا رہتا ہے۔ یا آپ ایک کے پیچھے چل پڑتے اور دوسرے کو بیکار کر ڈالتے ہیں، یا دوسرے کو پورا کرتے اور پہلے کو بیکار کر لیتے ہیں۔

اسی طرح اگر آپ علم کے جذبے اور ایک اور جذبے کے مابین جنگ چھیڑ لیں۔ یا اگر آپ چاہیں کہ مال کی خواہش جو ایک انسانی جبلت ہے اور ایک اور جبلت کے مابین جنگ کھڑی کر دیں تو تشویش پیدا ہو جائے گی۔ اگر معاشرے میں احترام کے جذبے اور کسی اور خواہش علم دین یا اخلاق کے مابین جنگ چھیڑ لیں تو بھی یہی کچھ ہوگا۔

دنیا میں ادیان کی شکست کی ذمے داری ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے دین اور دیگر

انسانی ضروریات کے مابین جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ہمیں سب سے زیادہ کلیسا کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ یہ کلیسا ہے جس نے ایک مصنف کے بقول عبادات اور معاملات تک میں جدائی ڈال دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عبادات کا تعلق ایک دنیا سے ہے اور معاملات کا تعلق دوسری دنیا سے۔ تم یا عبادات کے ذریعے اس دنیا کے ہو جاؤ یا معاملات کے ساتھ اس دنیا کی طرف چلے جاؤ۔

کلیسا کی غلطیاں

کلیسا نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ (renaissance) کے زمانے میں سائنس کے ظہور کی ابتدا میں چند بڑی بڑی غلطیاں کیں۔ اس نے دین اور اعتدال پر مبنی آبرومندانہ دنیاوی زندگی کے درمیان نزاع پیدا کر دیا۔ اس نے دین اور سائنس کے مابین جنگ چھیڑ دی۔ دین اور عقل کے مابین تنازعہ کھڑا کر دیا۔ اس نے کہا کہ اصول دین کی اساس دائرۂ عقل سے خارج ہے یہ عقل کے لئے ممنوعہ علاقہ ہے۔ تم آنکھیں بند کر کے کہو کہ مبدائے عالم تین ہیں اور تین ہوتے ہوئے وہ ایک ہے اور ایک ہونے کے باوجود تین ہیں۔ بار بار اسے دُہراؤ۔ اگر تم نے کہا کہ میں کس طرح تین خداؤں یا ایک خدا پر ایمان لاؤں تو وہ کہتا: اسی طرح کہو اور اسی پر ایمان رکھو اگر تمہاری عقل قبول نہ کرے تو اس سے کہو کہ: بگو اس بند کر دخل در معقولات نہ کر۔

یورپی تہذیب پر اسلام کے اثرات

کلیسا نے جس غلطی کا ارتکاب کیا اسلام کو بھی بعد ازاں مجبوراً کسی حد تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ کیونکہ لوگ تمیز نہ کر سکے انہوں نے خیال کیا کہ مجموعی طور پر دین کی خاصیت ہی یہ ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا میں ایک ایسے دین نے ظہور کیا ہے جس نے اپنی نہایت عالی روحانیت کے ساتھ ساتھ ایک تہذیب کو بھی وجود بخشا ہے ایک تمدن کا خالق ہوا ہے۔ جس نے طرح طرح کی مختلف قوموں کو آپس میں جوڑ دیا ہے اور دنیا کی تہذیبوں میں سے عظیم ترین تہذیب کو وجود بخشا ہے۔ وہ تہذیب جو آج کی یورپی تہذیب پر ایک بہت عظیم حق رکھتی ہے اور خوش قسمتی سے آہستہ

آہستہ یورپی دنیا اس کا اقرار و اعتراف کر رہی ہے۔ اگر آپ ول ڈیورانٹ کی کتاب ''تاریخ تمدن'' کے فارسی ترجمے کی گیارہویں جلد کا مطالعہ کریں' تو آپ پر کسی حد تک یہ بات واضح ہوجائے گی۔ گستاولوبون نے ایک حد تک کتاب ''محمدؐ خاتم پیامبران'' کی دوسری جلد میں یہ بات کی ہے۔ یہ کتاب حسینیہ ارشاد نے شائع کی ہے۔ ایک مقالہ جس کا عنوان ''کارنامۂ اسلام'' ہے جو بعد میں کتاب کی صورت میں آئے گا اور جسے یونیورسٹی کے ایک استاد نے لکھا ہے' میرا دل چاہتا ہے کہ آپ اس مقالے کو پڑھیں اور دیکھیں کہ اسلام نے کیسی درخشاں تہذیب کو وجود بخشا ہے اور یورپی دنیا اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسلام کی کس قدر مقروض ہے۔

اسی کتاب کے مقدمے میں ہم نے شیخ محمد عبدہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ: یورپی دنیا نے جس دن اپنے دین سے منہ موڑا اسی دن سے کامرانی کی طرف قدم بڑھایا ہے اور دنیائے اسلام نے جس روز اپنے دین سے رُخ پھیرا ہے اس دن سے بدنصیبی کا شکار ہوئی ہے۔ یہ ہے ان دو ادیان کا فرق۔ ہم نے ایک چیز کا اضافہ کیا ہے۔ یہ دنیائے یورپ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دین سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ ہاں' اس نے اپنے دین سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے' لیکن (اسکے بعد) کس طرف کو چلی گئی ہے؟ اسلام کی طرف۔ تہذیبوں کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیجئے۔ یورپی تہذیب کی ایک وجہ پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقے کی پیدائش ہے۔ انہیں عیسائی مذہب کے ماننے والوں میں مسلمانوں کے شیعہ سمجھا جاتا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک ہزار پانچ سو سال بعد آئے ہیں لیکن تشیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے ہے۔ اس فرقے کی تعداد ابھی تک کیتھولک (Catholic) کے برابر نہیں ہے' تاہم قابلِ لحاظ تعداد کے حامل ہیں۔ انہوں نے عیسائی مذہب میں بنیادی اصلاحات کی ہیں۔ ان کے حوالے سے جن اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں یہ تین چیزیں سرِفہرست ہیں:

ا۔ انسان اور خدا کے درمیان سے فاصلے کا خاتمہ۔ سید جمال الدین اسد آبادی (۱) اور دیگر افراد

ا۔ جنہیں ہمارے یہاں جمال الدین افغانی کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

کے بقول انسانی حیثیت کو اہمیت دینا۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کا کیا مفہوم ہے کہ پوپ واسطہ ہے؟ اللہ سب بندوں کے قریب ہے۔ اللہ کی عبادت کسی کشیش (پادری) بلکہ کسی بھی بندے کے واسطے کے بغیر کیجئے۔ اللہ سب بندوں کے نزدیک ہے۔ وہ ہر بندے کا درد دل سنتا ہے۔ اے انسان! اللہ سے رابطے کے لئے تجھے کسی بھی واسطے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ وہ دین کی حدود میں عقل کے حق کے قائل ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ دین کے وہ مسائل اور اصول جو عقل کے خلاف ہیں' انہیں اٹھا پھینکنا چاہیے۔

۳۔ عمل' معاش کی طرف توجہ اور سعی و کوشش' وہ بھی انتہائی حدوں تک۔ قرآن کی تعبیر میں جہاد' سخت کوشی اور معاش کی بہتری بھی عبادت ہے۔

یہ تین اصول' تینوں کے تینوں براہ راست اسلام سے لئے گئے ہیں۔ صلیبی جنگوں اور مشرق و مغرب کے رابطے کے بعد جب وہ اسلامی اقدار سے آشنا ہوئے' تو انہوں نے اسلام سے یہ تین اصول اخذ کئے اور اصلاحات کے نام پر انہیں عیسائی مذہب میں داخل کر لیا۔ اگرچہ ابھی تک خصوصاً پہلے حصے کو وہ مکمل طور پر ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں۔

بعض مقامات پر ہمیں تاریخ تمدن کی کتابوں میں ملتا ہے کہ یورپی تہذیب کے ظہور میں آنے کی ایک وجہ پراٹسٹنٹ فرقے کی پیدائش ہے۔ پراٹسٹنٹ مذہب کی پیدائش کا سبب عیسائیت کا اسلام سے رابطہ اور ان کا اسلام کے بنیادی اصول اپنانا ہے۔ یورپی تہذیب کی پیدائش کی ایک بنیادی اور اہم وجہ پراٹسٹنٹ مذہب کی پیدائش ہے۔ یعنی یہ اسلام ہے جس نے یورپی تہذیب کے لئے براہ راست تقدیر ساز کردار ادا کیا ہے۔ اب بعد ازاں خود ان کی طرف سے بلاواسطہ اور بالواسطہ سازشیں ہوئیں' کہ اپنے ناپاک افکار انہوں نے ہمیں دے دیئے اور ہماری جگہ پر آ گئے۔ جہاں ہم تھے وہاں وہ آ پہنچے' جہاں وہ تھے انہوں نے ہمیں وہاں پہنچا دیا۔ یعنی اپنے افکار ہمیں دے دیئے اور ہمارے افکار خود لے لئے۔ اب اس بات کو چھوڑیئے۔ خوش قسمتی سے یورپیوں میں کچھ انصاف پسند افراد بھی ہیں۔

ان تینوں اصولوں کے شواہد

ا۔ انسانی حیثیت کو اہمیت دینا

جو موضوعات ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیے ہیں' ان میں سے ایک موضوع انسانی حیثیت کو اہمیت دینا ہے۔ کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس بارے میں آپ کے سامنے قرآنی حوالوں کے ساتھ بات کریں؟ کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم آیت: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ. (۱) پڑھیں؟ کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ آیت: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. (۲) آپ کے سامنے دُہرائیں؟ کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ: وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِه. (۳) کی تلاوت کریں؟

۲۔ حدودِ دین میں عقل کا حق

عقل کے بارے میں۔ ہائے افسوس! آپ کو دنیا میں کونسی ایسی مذہبی کتاب دکھائی دیتی ہے جو قرآن کے برابر عقل کے لئے احترام کی قائل ہو؟ جو افتخار فقہ اسلامی' خصوصاً شیعہ فقہ کو حاصل ہے' آپ کو دنیا میں کہاں دکھائی دیتا ہے؟ جب ہم شرعی احکام کے منابع (sources) کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں: کتاب' سنت' اجماع (یعنی ایسا قطعی عمل جو اس امر کی دلیل ہو کہ یہ بات پیغمبر سے پہنچی ہے) اور عقل' وہ عقل جسے عیسائی دنیا مذہب کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی' اسلام اسے اپنے منابع تشریع میں سے ایک شمار کرتا ہے۔

قرآن میں ہمیں ایک دو جگہ کے سوا کہیں بھی کوئی تلخ اور سخت لفظ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا

۱۔ اور ہم نے بنی آدم کو عزت و تکریم عطا کی ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۰)

۲۔ اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں' تو میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۶)

۳۔ اور اللہ سے اسکے فضل کا سوال کرو۔ (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۳۲)

(سخت) لفظ ایک جگہ ان افراد کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے: وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (وہ ان لوگوں کو خباثت میں مبتلا کر دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۱۰۰)

ایک اور نقطہ بھی بہت جاذب ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب دوسروں کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کی خرابی یا قبیح پہلو بیان کرنا ہوتا ہے' تو ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے: اے بے غیرت' دوسرا کہتا ہے۔ اے بے دین۔ ہمارے زمانے میں حال ہی میں ایک روشن فکرانہ جملہ پیدا ہوا ہے' روشن فکر حضرات جب دوسروں کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: جا رجعت پسند! جا کہنہ فکر' جا مقلد! روشن فکر بن۔ دنیا کی وہ پہلی کتاب جس نے جب دوسرے کی تحقیر کرنا چاہی تو اسے رجعت پسندی سے نسبت دی' قرآن ہے۔ قرآن جب کافر کی تحقیر کرتا ہے تو کہتا ہے: جا بے شعور' جا آباؤ اجداد کے مقلد' جا تجزیہ و تحلیل نہ کر سکنے والے: افلا یعقلون (۱)' افلا یفقھون (۲)' تیری عقل کہاں ہے تو تو "اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ" (۳) کہنے والا ہے۔ جا اپنا کام کر۔ قرآن کے سوا آپ کو کونسی ایسی کتاب ملتی ہے جو اس منطق اور ایسے لہجے کی حامل ہو؟

۳۔ عمل اور سخت کوشی کا احترام

تیسرا اصول کام کا احترام' محنت و کوشش کا احترام' وہ بھی سخت کوشی اور قرآن کی تعبیر کے مطابق جہاد۔ جب زندگی کی طرف کسی بھی قسم کی توجہ کو عبادت اور خدا پرستی کے منافی اور خدا فراموشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا' اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْكَادُّ عَلٰى عِيَالِهٖ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ."

"جو کوئی اپنے عیال کی معاش کے لئے اپنے آپ کو زحمت میں ڈالے وہ راہِ خدا

۱۔ کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟

۲۔ کیا وہ سمجھتے نہیں؟

۳۔ ہم نے اپنے آبا کو ایک طریقے پر پایا ہے۔

میں تلوار چلانے والے کی مانند ہے۔'' (وسائل۔ ج ۱۲۔ص ۴۳)

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر طرح کی گداگری' بے کاری اور دوسروں پر بوجھ بننے کے خلاف سخت جنگ کی ہے۔ یہ متواترات میں سے ہے کہ رسولِ اکرم نے فرمایا ہے:

''مَلعونٌ مَنْ اَلقیٰ کَلَّہُ علیَ النّاسِ.''

''رحمتِ خدا سے دور ہے وہ شخص جو اپنی معاش کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر لاد دے۔'' (وسائل۔ ج ۱۲۔ص ۱۸)

یہ تیسری حدیث جو میں پڑھوں گا' اس مضمون کی اب تک شاید مجھے دس احادیث مل چکی ہیں۔ پہلے میرا یہ خیال نہیں تھا کہ اس کا یہ مطلب ہے جواب میں سمجھتا ہوں لیکن اتنی زیادہ احادیث مل گئیں کہ پھر اب مجھے شک نہ رہا۔ پندرہ اقوال پر مشتمل ایک پرچہ جو انشاءاللہ حسینیہ ارشاد کی طرف سے حاضرین محترم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا اس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی پندرہویں صدی کے آغاز کی یاد میں ہم نے پندرہ اقوال شائع کیے ہیں۔ یہ مختلف موضوعات پر ہیں: مساوات' اخلاق' عبادت' خدمتِ خلق' اتحاد و اتفاق' انسان کے کام اور محنت کرنے کے بارے میں اور عورتوں کے حقوق کا احترام۔ البتہ ہم نے ان اقوال کی تشریح نہیں کی ہے۔ کُل پندرہ اقوال ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے:

''اَصْلِحوا دُنیاکُمْ وَاعملوا لِآخرتِکُمْ کَاَنَّکُمْ تموتونَ غداً.''

پیغمبر اکرم نے فرمایا: اپنے دنیاوی امور کی اصلاح کرو (اصلاح کرنا اور ہے اور حریص بننا اور دولت پرست بننا دوسری بات)' صحیح اور درست کام کرو اور اپنی دنیا کی بہتری کے لئے کوشش کرو۔ لیکن اپنی آخرت کے لئے اس طرح فکر کرو کہ گویا کل ہی تمہیں مرجانا ہے۔ (ایک لمحے کی غفلت بھی نہ کرو)

یہ ہیں معنی دین اسلام کی جامعیت' وسطیت اور توازن کے۔

پر اٹسٹنٹ نے یہ اصول اسلام سے اخذ کئے۔ اس کے بعد یورپی تمدن وجود میں آیا۔ کل رات محترم ڈاکٹر شریعتی نے کہا تھا کہ یورپی دنیا عیسائیت کی افراط پر مبنی روحانیت سے روگرداں

ہو کر کس طرح مادیت پرستی کی طرف آئی کہ اب اسے ایک اور مسیح کی ضرورت ہے' جو اسے واپس لے جائے۔ کیونکہ ان کا دین ایک عقلی دین نہ تھا' اس لئے وہ توازن قائم نہ رکھ سکے۔ اس کا نتیجہ سرمایہ داری کی صورت میں نکلا' جس کا محور یہ ہے کہ: پیسہ ہدف ہے' پیسہ معبود ہے' پیسے کی پوجا کی جائے اور اسی قسم کے (دوسرے) انحرافات۔

اقبال کی نظر میں آج کے انسان کی ضروریات

(علامہ) اقبال لاہوری نے عمدہ بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کی دنیا کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ (وہ یہاں اسلام کے بارے میں بھی گفتگو کرنا نہیں چاہتے)

۱۔ آج کی دنیا کائنات کی مادی تفاسیر سے تنگ آ چکی ہے۔ اسکی تمام بدبختیوں کا سرچشمہ یہی ہے۔ آج کے انسان کو کائنات کی ایک روحانی تفسیر کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ جان سکے کہ اس کائنات کا ایک مالک ہے' جس کا نام اللہ ہے۔ جب تک انسان کے ذہن میں یہ فکر پیدا نہیں ہوگی' جب تک انسان اس خلقت کو عبث سمجھتا رہے گا اور جب تک زندگی کو بے مقصد جانتا رہے گا' وہ ایسا ہی رہے گا جیسا کہ ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ انسان کو ایک ایسی فکر' عقیدے اور ایمان کی ضرورت ہے جو کائنات کی ایک روحانی صورت میں تفسیر کرے' جو اسکے لئے ایک آغاز اور انجام کا قائل ہو: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (یقیناً ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۶)

۲۔ انسان جو اتنی بہت سی آزادیاں رکھتا ہے' اسے روحانی آزادی کی بھی ضرورت ہے۔ ہم ہمیشہ آزادی آزادی کہتے رہتے ہیں۔ ہم اسکی تائید کرتے ہیں' لیکن جو انسان اپنی روح کی جانب سے آزاد نہیں' کیا کسی صورت ممکن ہے کہ وہ سماجی آزادی کو پہنچنے کا موقع دے گا۔ انسان کو اپنے روحانی پہلو سے آزاد کئے بغیر معاشرتی آزادی کی جستجو کرنا ایک فضول بات ہے۔ دوسری ضرورت روحانی آزادی ہے۔

۳۔ تیسری ضرورت ایک ایسا قانون ہے جو ارتقا پذیر ہو۔ یعنی انسان کو کمال کی طرف لے جائے۔

لیکن اسکے ساتھ ساتھ اس کا سرچشمہ ایک روحانی ایمان ہوتا کہ ہر ظاہری مظہر کو روحانی رنگ دے سکے۔

کیا آپ کو اسلام کے علاوہ کوئی اور ایسا مکتب نظر آتا ہے جو ان ضروریات کو پورا کر سکے؟ قرآن کیا خوب کہتا ہے۔ یہ قرآنی تعبیرات بار بار دُہرائی گئی ہیں۔ جو مجھے یاد ہے وہ سورہ صف میں ہے۔

"هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ"

"کیا میں تمہاری رہنمائی ایسی تجارت کی جانب کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے۔ اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لے آؤ۔ (سورہ صف ۶۱۔ آیت ۱۰، ۱۱)

ایمان باللہ۔ اللہ پر ایمان سے کیا مراد ہے؟ یعنی اس کائنات کا ایک مالک ہے جس کا نام اللہ ہے۔ کائنات کی روحانی تفسیر۔ اللہ کے رسول پر ایمان۔ اللہ پر ایمان، یعنی اسکے اللہ ہونے پر ایمان، اسکی الوہیت پر ایمان، اس بات پر ایمان کہ: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (وہ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، امان دینے والا، نگرانی کرنے والا، صاحب عزت، زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔ سورہ حشر ۵۹۔ آیت ۲۳)

ایمان بالرسول۔ یعنی ان کی رسالت پر ایمان، ان کے قانون پر ایمان، وہ قانون جو بشریت کو کمال تک پہنچانے کی ضمانت دیتا ہے۔

"وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ."

"اور راہِ خدا میں اپنے جان اور مال سے جہاد کرو۔" (سورہ صف ۶۱۔ آیت ۱۰)

اللہ کے راستے میں مجاہدہ کرو۔ یہاں محنت کی بات کر رہا ہے۔ سخت کوشی کی بابت کہہ رہا ہے۔ البتہ مادی سخت کوشی نہیں، بلکہ فی سبیل اللہ۔ ایک عالی مرتبہ پہلو کی نشاندہی کر رہا ہے۔ کام کرو، زحمت اٹھاؤ، سرگرمی دکھاؤ، جہاد کرو، دلیر اور بہادر بنو، جدوجہد کرو، البتہ اللہ کی راہ میں۔

قانونِ ضرورت کے تین ارکان

قانونِ ضرورت میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی چیز کی ضرورت ہو، دوّم یہ کہ کوئی اور چیز اس ضرورت کو پورا نہ کر سکے اور سوم یہ کہ اس ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے۔

اس قسم کے اداروں (۱) کے حوالے سے ہماری ذمے داری ہے کہ ہم انسان کو متوجہ کریں کہ اے انسان! تو ضرورت مند ہے۔ انسان کسی ایسے بیمار کی طرح نہ رہے جسے ضرورت تو ہو لیکن وہ اپنے آپ کو بیمار نہ سمجھتا ہو۔ اسکے بعد ہم ضرورت پورا کرنے کے لئے اعلیٰ درجے پر وسیلہ بھی فراہم کریں۔

یہ خیال نہ کیجئے گا کہ (اس مقصد کے لئے) اس مقدار میں اجتماعات کا انعقاد کافی ہے۔ اس سے بہت زیادہ (کام) کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اسلام کو صحیح تبلیغات کی ضرورت ہے، اسکی تعلیمات عام کرنے کی ضرورت ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے بچے اور ہمارے بڑے دینِ اسلام کی تعلیم اس طرح حاصل کریں جیسے ایک کلاس میں تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ تحقیقات کی ضرورت ہے۔ ہمارے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن پر سے بالخصوص آج کے دور میں پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں بہت زیادہ تحقیق ہونی چاہئے۔ یہ ادارہ اسی طرح کے عزائم رکھتا ہے۔

میں دعا کرتا ہوں، آپ آمین کہئے: یا اللہ! اولاً ہم سب کی نیتوں کو خالص قرار دے۔ یا اللہ! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے مکرم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان اہداف کے راستے میں مفید اور موثر قدم اٹھائیں۔

آج کی دنیا کو بھی پیغمبر اکرم کی اسی طرح ضرورت ہے جیسے آج سے چودہ سو برس پہلے کی دنیا کو تھی۔ میں نے ابھی تک دو کتابوں میں برنارڈ شا کا یہ مشہور جملہ پڑھا ہے۔ اس نے کیسی عالی

۱۔ حسینیہ ارشاد۔

بات کہی ہے (وہ کہتا ہے): میری طرح کا انسان اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اپنے ملک اور معاشرے کے بارے میں پیش گوئی کرے۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ کل کا یورپ دینِ محمد کی طرف مائل ہو جائے گا۔ پھر وہ کلیسا کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے: کلیسا ماضی میں خیانت کا مرتکب ہوا۔ اس نے اس عظیم انسان کا چہرہ بگاڑ دیا۔ یورپ کے لوگ (ان سے) واقف نہیں تھے۔ پھر کہتا ہے: صرف ان جیسا شخص دنیا کا حکمران بنے اور دنیا پر حکومت کرے تو دنیا کی مشکلات حل کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کوئی اور دنیا کی مشکلات حل کرنے پر قادر نہیں۔

یہ بات ایک انتہائی غیر معمولی مصنف نے کی ہے، جس کے حالاتِ زندگی میں لکھتے ہیں کہ اس کے ہر لفظ کی قیمت ظاہراً ایک پاؤنڈ دی جاتی تھی اور جو ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے فوت ہوا ہے۔

آج کی دنیا کو بھی رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اُس زمانے کی دنیا کو تھی۔ میں آپ کی خدمت میں حضرت علی علیہ السلام کے چند جملے پیش کرتا ہوں، لیکن ان کا ترجمہ نہیں کرتا۔ ان کا ترجمہ مولانا روم کے اشعار ہی ہوں گے جو اس مرد نے انتہائی عاشقانہ انداز میں کہے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اس زمانے کے بارے میں کہتے ہیں:

"اَرْسَلَهُ عَلیٰ حِینِ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ وَطُولِ هَجْعَةٍ مِنَ الْاُمَمِ وَاعْتِزَامٍ مِنَ الْفِتَنِ وَانْتِشَارٍ مِنَ الْاُمُورِ وَتَلَظٍّ مِنَ الْحُرُوبِ. وَالدُّنْیَا کَاسِفَةُ النُّورِ. ظَاهِرَةُ الْغُرُورِ. عَلیٰ حِینِ اصْفِرَارٍ مِنْ وَرَقِهَا وَاِیَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَا وَاغْوِرَارٍ مِنْ مَائِهَا." (۱)

میں نہیں سمجھتا کہ مولانا روم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں اس سے بہتر کوئی چیز نظم کی ہو۔ کیا عالی کہا ہے۔ مجھے وہ پورا زبانی یاد نہیں۔ چند اشعار یاد ہیں، کیونکہ بعثت

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اس وقت بھیجا جب رسولوں کی آمد کا سلسلہ رکا ہوا تھا اور ساری امتیں مدت سے پڑی سو رہی تھیں۔ فتنے سر ابھار رہے تھے۔ سب چیزوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دنیا بے رونق و بے نور تھی اور اسکی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس وقت اسکے پتوں میں زردی دوڑی ہوئی تھی اور پھلوں سے ناامیدی تھی۔ پانی زمین میں تہ نشین ہو چکا تھا۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۷۔ ترجمہ مفتی جعفر حسین)

سے متعلق ہیں اس لئے آپ کے سامنے عرض کر کے اپنی معروضات تمام کرتا ہوں۔ قرآن میں ہے: یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً (سورۂ مزمل ۷۳۔ آیت ۲،۱) ایک اور جگہ فرماتا ہے: یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (سورۂ مدثر ۷۴۔ آیت ۲،۱) وہ کہتے ہیں:

خواند مزمل نبی را زین سبب | کہ برون آی از گلیم ای بوالھرب
سر مکش اندر گلیم و رو مپوش | کہ جہان جسمی است سرگردان، تو ہوش (۱)
ھین قم اللیل کہ شمعی اے ہمام | شمع دائم شب بود اندر قیام
بی فروغت روز روشن ہم شب است | بی پناھت شیر اسیر ارنب است
باش کشتیبان در این بحر صفا | کہ تو نوح ثانی ای مصطفیٰ
خیز و بنگر کاروان رہ زدہ | غول، کشتیبان این بحر آمدہ

پھر وہ آنحضرت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

نی تو گفتی قائد اعمی بہ راہ | صد ثواب و اجر یا بد از الٰہ
ھر کہ او چل گام کو ری را کشد | گشت آمرزیدہ و یابد رَشَد
ھین بکش تو زین جہان بی قرار | جوق کوران را قطار اندر قطار (۲)

۱۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ عالم ایک سرگرداں جسم ہے اور اسکے لئے عقل و ہوش قرآن ہے۔

۲۔ (اشعار کا مفہوم) نبی کو اس لئے مزمل یعنی چادر میں لپٹے ہوئے کہہ کر خطاب کیا کہ اے پیکار کرنے والے اس چادر سے باہر نکل۔ چادر کے اندر سر نہ لے جا اور چہرہ نہ چھپا کہ یہ دنیا سرگرداں ہے اور تو اسکے لئے سمجھ اور عقل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیکھ! رات کو اٹھ کھڑا ہو کہ اے دلیر! تو ایک شمع ہے اور شمع رات بھر قیام میں اور کھڑی رہتی ہے۔ تیری روشنی کے بغیر روز روشن بھی شب ہے اور تیری پناہ نہ ہو تو شیر بھی اسیر خرگوش ہے۔ اس بحر صفا کے لیے تو کشتی بان اور ملاح بن جا' کہ اے مصطفیٰ تو نوح ثانی ہے۔ اٹھ اور راہ میں پڑے کاروان کو دیکھ اٹھ چل اے کشتی بان کہ یہ بحر آ پہنچا ہے۔ کیا تو نے یہ نہ کہا تھا کہ جو اندھے کو راستہ دکھائے گا وہ اللہ سے سو نیکیاں اور اجر پائے گا۔ جو بھی اندھے کی عصا کو پکڑ کر چلے گا وہ بخشا جائے گا اور کامیابی پائے گا۔ دیکھ اس بے چین دنیا کو تھام کر لے چل کہ اندھوں کا گروہ قطار اندر قطار موجود ہے۔

ہم ایک مرتبہ پھر قسم دیتے ہیں: یااللہ! تجھے حقیقتِ رسولِ اکرم کی قسم دیتے ہیں کہ ہمیں اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔ ہم سب کی چشمِ بصیرت کھول دے۔ ہمیں رسولِ اکرم کی مقدس تعلیمات کی پیروی کی توفیق عنایت فرما۔ ہم سب کی شرعی حاجات پوری فرما۔

وصلّی اللّٰہ علی محمدوا لہ الطاھرین

اسلامی قوانین کا جدید دنیا کی ترقی وتغیر سے موازنہ ☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

موضوع گفتگو ہے "اسلامی قوانین کا جدید دنیا کی ترقی اور تغیر سے موازنہ"۔ اس موازنے کے دوران ہم اپنے آپ کو دو چیزوں کے سامنے پاتے ہیں۔ ہمارے ایک طرف اسلامی قوانین ہیں اور دوسری طرف ایک تاریخی حقیقت ہے جو جدید دنیا کی ترقی اور تغیر ہے۔ البتہ مراد یہ نہیں ہے کہ جدید دنیا میں ترقی اور تغیر کے نام سے کوئی استثنائی چیز سامنے آئی ہے۔

ترقی اور تغیر انسانی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔ جس دن سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کو وجود بخشا ہے اسی دن سے وہ مسلسل تغیر وتبدل اور ترقی وپیشرفت کے حال میں ہے۔ وہ کئی مراحل طے کرنے کے بعد موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ البتہ عصر جدید اور دنیائے جدید میں تغیر وتبدل میں ایک ایسی جست (Jump) آئی ہے کہ شاید گزشتہ زمانوں میں اس عظمت ووسعت کے ساتھ کوئی جست رونما نہیں ہوئی۔

☆ یہ تقریر تقریباً ۱۹۷۱ء میں دانش کدہ الہیات مشہد یونیورسٹی میں کی گئی۔

اس گفتگو کی ضرورت یہ ہے کہ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہمیں یہ دونوں چیزیں عزیز ہوں۔ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہمیں اسلام عزیز ہو اور یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ ہمیں دنیا کی ترقی اور تبدل اور تہذیب کا ارتقا عزیز ہو۔ تاہم ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ ہم حقیقی طور پر مسلمان بھی رہیں اور دنیا کے تغیر اور ترقی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر بھی چلیں؟ یا نہیں ایسا ممکن نہیں ہے؟

معاشرے کے تین گروہ

ہمارے معاشرے میں تین طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو دینداری سے اپنا تعلق کچھ زیادہ ہی ظاہر کرتا ہے اور ہمارے معاشرے میں' جو ایک اسلامی معاشرہ ہے' اسلام کے ساتھ زیادہ وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اور دیندار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ نئی وجود میں آنے والی چیزوں اور زمانے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا جائے' انہیں ایسے امور کے طور پر دیکھیں جو دین کے خلاف وجود میں آئے ہیں۔ لہٰذا پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ معاشرے سے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ یعنی جب جدید معاشرتی مظاہر کے سامنے مکمل طور پر شکست کھالیتے ہیں تب انہیں تسلیم کرتے ہیں۔ گزشتہ شب ایک مقالے میں ہم نے ایک عربی شعر پڑھا تھا' جو ایسے افراد کی حالت کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ شعر کچھ یوں تھا:

ذوالجهل يفعل ما ذوالعقل يفعله

في النائبات ولكن بعد ما افتضح

جو کام عاقل کرتا ہے وہ جاہل بھی کرتا ہے۔ البتہ جاہل اس قدر ڈٹا اور جما رہتا ہے کہ رسوا ہو جاتا ہے اور اسکے بعد وہی کام انجام دیتا ہے۔ جبکہ عاقل حوادث کے آگے آگے چلتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے بھی نہج البلاغہ میں ایک ایسی ہی بات کی ہے۔ آپ اپنے اصحاب سے شکایت کرتے ہیں کہ کیوں نہ ہم میں اور آپ میں اقدام اور سبقت کرنے کی قوت موجود ہو۔

"اَیُّهَا النَّاس اِنَّا اَصْبَحْنَا فِی دَهْرٍ عَنُودٍ وَزَمَنٍ کَنُودٍ. یُعَدُّ فِیهِ الْمُحْسِنُ مُسِیئاً وَیَزْدَادُ الظَّالِمُ فِیهِ عُتُوّاً."

"اے لوگو! ہم ایک ایسے کج رفتار زمانے اور ناشکر گزار دنیا میں پیدا ہوئے ہیں' جس میں نیکوکار کو خطاکار سمجھا جاتا ہے اور ظالم اپنی سرکشی میں بڑھتا ہی جاتا ہے۔"

یہاں تک کہ فرماتے ہیں:

"لَا نَنْتَفِعُ بِمَا عَلِمْنَا وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا جَهِلْنَا وَلَا نَتَخَوَّفُ قَارِعَةً حَتّٰی تَحِلَّ بِنَا."

"جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور جن چیزوں کو نہیں جانتے انہیں دریافت نہیں کرتے اور جب تک مصیبت آ نہیں جاتی ہم خطرہ محسوس نہیں کرتے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۲)

ہم (سے مراد معاشرہ ہے) جو کچھ جانتے ہیں اس سے نفع نہیں اٹھاتے اور جس چیز کو نہیں جانتے اسکے بارے میں پوچھتے نہیں' تاکہ جان لیں۔ اور جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں جب تک وہ آن نہ پڑیں اس وقت تک ہم انہیں دور کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ ہم ہمیشہ انہیں ختم اور برطرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ ہمیں پہلے سے دیکھتے رہنا چاہئے اور جو چیز ابھی تک واقع نہیں ہوئی ہے اس کے وقوع سے قبل اس کا سدِباب کرنا چاہئے۔ کافی کی "کتاب العقل والجہل" میں امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"اَلْعَارِفُ بِزَمَانِهِ لَا تَهْجُمُ عَلَیْهِ اللَّوَابِسُ."

"جو شخص اپنے زمانے سے واقف ہوتا ہے وہ غلطیوں کا شکار نہیں ہوتا۔"

ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو دین کے نام پر تہذیب اور زندگی کی ترقی سے کٹا ہوا ہے۔ اسکے مدمقابل ایک اور گروہ ہے جس نے تہذیب' سائنسی ترقی اور زمانے کے تقاضوں کے نام پر اپنے

آپ کو دین اور دینی حقائق سے کاٹ لیا ہے۔ یہ لوگ ہر اُس چیز سے گریزاں رہتے ہیں جس سے قدامت کی بو آتی ہے۔ اس گروہ کی نظر میں لفظ ''قدامت'' جس کے معنی زیادہ پرانے زمانے کا حامل ہونا ہے' کہنگی کے مساوی ہے۔ حالانکہ یہ دو مختلف مفہوم ہیں۔ کہنگی یعنی فرسودگی اور بوسیدگی اور قدامت یعنی زیادہ مدت کا حامل ہونا۔

یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک چیز جو قدیم ہو' یعنی پرانے زمانے سے ہو' وہ فرسودہ وکہنہ بھی ہوگئی ہو اور منہدم کردینے کے قابل ہو۔ پہلے جس جگہ بھی قدیم کا لفظ آتا تھا اس سے ایک تقدس کی مہک آتی تھی۔ کہتے تھے یہ ایک قدیمی چیز ہے لہٰذا کچھ زیادہ تقدس رکھتی ہے۔ اب معاملہ برعکس ہوگیا ہے۔ ایک گروہ کی نظر میں جونہی کسی چیز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیمی ہے' تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے کہنگی' شکستگی اور بوسیدگی کی بو آتی ہے۔

اس مقام پر ایک درمیانی طبقے کی ضرورت ہے' جو کم وبیش معاشرے میں موجود ہے۔ اس مقام پر ہمارے طبقے پر ایک بھاری اور دشوار ذمے داری عائد ہوتی ہے' اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک مکمل اور گہری تحقیق کریں اور دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ ایک شخص مسلمان اور متدین بھی ہو اور زمانے کے تقاضوں اور زندگی کی ترقی سے ہم آہنگ بھی ہو۔ یا پھر ایسا ممکن نہیں؟

کسی بھی دوسرے دین سے زیادہ اسلام کو اس مشکل کا سامنا ہے۔ کیونکہ اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ دائمی ہے اور اب دفترِ نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے اور ابد تک اس دین کے علاوہ کوئی اور دین نہیں آئے گا۔ اسکی دوسری خصوصیت خود اس دین کی ترقی وتوسیع ہے۔ اگر اسلام نے دوسرے ادیان کی طرح چار عبادی احکام اور چار اخلاقی احکام ونصائح پر اکتفا کرلیا ہوتا اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے ضوابط وضع نہ کئے ہوتے' تو اس مشکل سے ہرگز دوچار نہ ہوتا۔

جہاں تک عبادی مسائل کا تعلق ہے' یہ معاملہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ لوگ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک خاص شکل میں عبادت کرتے ہیں۔ یا چار اخلاقی نصیحتیں ہوں' تو بھی معاملہ اہم نہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا دین ہے جو حلال وحرام کے بہت سے احکام لایا ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ

ایسا نہیں جس کے بارے میں اسلام نے کوئی قانون وضع نہ کیا ہو اور حکم نہ لایا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس بحث کے نکتۂ نظر سے اسلام اور ہم مسلمانوں کا کام بہت زیادہ دشوار ہے۔ خاص طور پر یہ کوئی ایسی بحث نہیں جس کے تمام تر مسائل کو ایک نشست میں پیش کر کے ان کا تجزیہ کیا جا سکے اور سمجھا جائے کہ بات تمام ہو گئی ہے۔ اس سے تو فقط مطالعے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس بارے میں ہم نے پہلے سے کچھ یادداشتیں لکھ رکھی ہیں اور مشہد سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوستوں میں سے ایک دوست (۱) نے وہ مجھ سے لے لی ہیں تاکہ انہیں ''اسلام اور مقتضیاتِ زمان'' کے نام سے ایک کتاب کی صورت دے سکیں۔ ایک زمانے میں ہم نے اس بارے میں تقریباً پچیس تقاریر کی تھیں۔ انہوں نے انہیں استخراج کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی کچھ یادداشتیں ہیں جنہیں انہوں نے لے لیا ہے تاکہ انہیں ایک کتاب کی صورت دے سکیں۔ بہر حال ہم اس کتاب کو اس موضوع کے تمام مسائل کے لئے کافی و وافی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا ہماری گفتگو زیادہ تر ایک فہرست مرتب کرنے، راہنمائی کرنے، متوجہ کرنے اور اس مشکل کے حل کے لئے ایک کلید پیش کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخِ انسانی کے تحول کا سبب

ہم نے عرض کیا ہے کہ ہماری گفتگو کے دو حصے ہیں۔ ایک ہے تاریخ میں ترقی اور تحول کا معاملہ جو انسانی زندگی کے ناگزیر اصولوں میں سے ہے۔ کیونکہ انسانی تاریخ متغیر ہے اور اس کا ایک سبب ہے۔

کسی بھی حیوان، یہاں تک کہ اجتماعی زندگی بسر کرنے والے حیوانات مثلاً شہد کی مکھی کی زندگی بھی متغیر اور متحول نہیں ہوتی۔ علما نے لکھا ہے کہ کئی ہزار سال قبل بھی شہد کی مکھی کی زندگی اسی نظام اور اسی وضع پر تھی جیسی آج ہے۔ لیکن انسان بہت جلدی جلدی اپنی زندگی کے نظامات اور

۱۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی۔

وضع تبدیل کرلیتا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو اپنی زندگی کا آپ مختار ہے۔

دیگر موجودات' یہاں تک کہ اجتماعی زندگی بسر کرنے والے حیوانات کی راہنمائی' سرپرستی اور معلمی طبیعت (اور جبلت) کرتی ہے۔ ایک لحاظ سے اندھی اور جابر جبلتیں ان پر مسلط ہیں اور انہیں کسی ندرت (اور تخلیق) کا حق نہیں دیا گیا ہے اور زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے کسی قسم کا کوئی اختیار بھی انہیں نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن انسان ایک ایسا موجود ہے جس کی زندگی ضعف اور کمزوری سے شروع ہوتی ہے اور اسے اپنے کمال کا سفر خود سے' (البتہ انبیا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق) اپنی ندرت' اپنی طاقت اور اختیار کے ساتھ طے کرنا چاہئے۔

اصولِ تغیر پر مبنی منطق

انسانی زندگی کے تغیر کے حوالے سے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض افراد (جن سے یقیناً آپ کا واسطہ پڑا ہوگا' یا آپ نے ان کی تحریروں میں انہیں پڑھا ہوگا) جب اس مسئلے میں داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام ہمارے زمانے کے لئے کافی نہیں ہوسکتا' تو وہ ایک فلسفی اصول سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا بنیادی قانون تغیر و حرکت ہے۔ اس کائنات کی کوئی چیز ثابت اور جامد نہیں ہے۔ یہاں تک کہ دو لمحوں میں بھی وہ ایک حال پر نہیں رہتی۔ مثلاً خود ہم' جو یہاں بیٹھے ہیں' سمجھتے ہیں کہ ہم جو کل تھے وہی سو فیصد آج ہیں' جبکہ اپنے کل کی نسبت (آج) ہم بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ البتہ یہ تبدیلی غیر محسوس ہے۔ جیسے ہم (گھڑی میں) گھنٹے کی سوئی کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں رکی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہم کتنا ہی غور سے دیکھیں اسکی حرکت ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن ایک گھنٹے بعد دیکھتے ہیں تو وہ دائرے کا ایک بٹے بارہ حصہ طے کرچکی ہوتی ہے۔

آنکھ سے نظر نہ آنا کسی چیز کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ فلاسفہ نے کائنات میں حرکت کے مسئلہ پر بہت سی باتیں کی ہیں۔ اصولاً اس کائنات کی ماہیت ہی حرکت اور تغیر و تبدل ہے۔

یہاں تک کہ آپ دیکھیں کہ اسلامی حکما حرکت جوہریہ کے قائل نظر آتے ہیں اور انہوں نے کائنات کو حرکت و تغیر کے مساوی قرار دے دیا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب اس کائنات کا بنیادی ترین اصول تغیر ہے اور اس دنیا کی کوئی چیز دائمی نہیں' تو دین بھی ان چیزوں میں سے ایک ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ہمیشہ رہے۔ اس دنیا کی ہر چیز ہمیشہ رہنے کی ضد ہے۔

جواب

اگر مسئلے کو اس صورت میں' خالص فلسفی شکل میں پیش کیا جائے' تو اس کا بہت سادہ سا جواب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کائنات میں جو چیز متغیر ہے وہ دنیا کے مادّی مظاہر ہیں۔ اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ مظاہر متغیر ہیں۔ لہٰذا پیغمبر جو خود مظاہرِ عالم میں سے ایک ہے' متغیر ہے۔ یعنی ایک نومولود کی طرح پیدا ہوتا ہے' بچپن کا زمانہ گزارتا ہے' جوان ہوتا ہے' بوڑھا ہوتا ہے اور وفات پا جاتا ہے۔ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُم مَّیِّتُوْنَ.

لیکن ہماری گفتگو قوانینِ عالم کے بارے میں ہے۔ کیا قوانینِ عالم بھی متغیر ہیں؟ ہمارا سورج یقینی طور پر بوڑھا ہو جائے گا اور ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ستارے بھی اسی طرح ہیں۔ دنیا میں موجود تمام نباتات اور حیوانات اس امر میں شامل ہیں۔ لیکن کیا یہ بات اس امر کی دلیل بن جاتی ہے کہ فزکس اور بائیلوجی کے قوانین بھی پرانے ہو جائیں گے؟ اسلام قانون ہے' مظہر نہیں۔ اور جو چیز متغیر ہے وہ مظہر ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اسلام باقی رہے گا لیکن پیغمبر فوت ہو جائیں گے؟

مصطفیٰ را وعدہ داد الطاف حق
گر بمیری تو نمیرد این سبق

''حق تعالیٰ کے الطاف نے مصطفیٰ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر آپ وفات پا گئے تو یہ سبق اور درس نہیں مرے گا۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

"اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ"

"آپ کو بھی موت آنے والی ہے اور یہ سب بھی مرجانے والے ہیں۔"

(سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۳۰)

لیکن خداوند عالم اسلام اور قرآن کے بارے میں کہتا ہے:

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔"

"ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ (سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۹)

ہاں، قرآن کے یہ کاغذ اور جلدیں بوسیدہ ہو جائیں گی لیکن جو چیز باقی رہے گی وہ قرآنی حقائق ہیں۔ اسلام کا تعلق معنی کی قسم سے ہے، صورت کی قسم سے نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں معانی کی رو سے بات کرنی چاہئے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام جو ایک قانون کی صورت ہے، کس حد تک قانونِ طبیعی کی صورت رکھتا ہے۔ یعنی کس حد تک طبیعت کی فطرت اور طبیعت کی عمارت سے ہم آہنگ ہے۔ اسلام قانون بیان کرنے والا ہے۔ قانونِ اسلام درحقیقت ایک (زبردستی کا) بنایا ہوا قانون نہیں ہے، بلکہ ایک طبیعی قانون ہے جو اللہ کی طرف سے بیان کیا گیا ہے۔ اس قانون میں انسان کی اجتماعی طبیعت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ یہ قانون انسانی زندگی کا مدار معین کرتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اسلام اس وجہ سے باقی ہے، (بلکہ) ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر (بہت سے دوسرے افراد کی طرح جو اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں) ہمارا انحصار صرف اس فلسفی اصول، اصولِ تغیر پر ہو، تو فوراً ہمیں جواب دیا جائے گا کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ جو چیز متغیر، کہنہ اور فرسودہ ہو جانے والی، مرجانے اور ختم ہو جانے والی ہے، وہ مظاہر ہیں لیکن قوانین اس میں شامل نہیں۔ قانون کے موضوع پر ہمیں الگ سے بات کرنا چاہئے۔

دوسری منطق: انسانی زندگی کا قانون متغیر ہے

قوانین پر گفتگو کرنے والے بعض لوگ، جو نسبتاً زیادہ گہری نظر رکھتے ہیں، کہتے ہیں: ٹھیک

ہے ہم اس لحاظ سے کہ تغیر و تحول قانونِ طبیعت ہے یہ نہیں کہتے (کہ اسلام جاویداں نہیں) بلکہ اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ کیونکہ اصولاً انسانی زندگی متغیر ہے اس لئے اس کا قانون بھی متغیر ہے۔ کیوں؟ اُسی دلیل کی بنیاد پر جو ہم نے عرض کی ہے کہ کیونکہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو اپنے آپ کا خود مسئول (اور مختار) ہے اور انسانی زندگی متغیر رہتی ہے' انسانی ضروریات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ قانون تو انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بنتا ہے۔ قانون انسانی ضروریات کی تکمیل کا آبرومندانہ اور عادلانہ طریقہ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا قانون کی بنیاد اجتماعی ضروریات ہیں۔

آیئے ہم ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں۔

کیا انسانی ضروریات ہمیشہ ایک سی رہتی ہیں یا ان میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں؟

انسانی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ شکار کے دور میں انسان کی ضروریات ایک خاص طرح کی تھیں۔ کھیتی باڑی کے زمانے میں کسی اور طرح کی ضروریات پیدا ہو گئیں۔ ہمارا زمانہ' جو مشین کا زمانہ ہے' اس میں مشین اپنے ساتھ کچھ اور طرح کی ضروریات لے آئی ہے۔ جب ضروریات بدلتی ہیں تو قدرتی بات ہے کہ قانون کو بھی بدلنا چاہئے۔

اس گروہ کی نظر میں زمانے کے تقاضوں کے مختلف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ضروریات بدلتی ہیں۔ ہم ایک مثال عرض کرتے ہیں۔ کیا ایک سو سال پہلے انسان کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ سڑکوں اور شہر کی ٹریفک کے لئے کچھ قوانین وضع کرے۔ مثلاً دائیں جانب چلیں' چوراہے پر اوورٹیک کرنے والے پر جرمانہ عائد کیا جائے؟

نہیں' اس لئے کہ اسکی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گدھا سواری کے زمانے میں انسان کے لئے ٹریفک کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو گاڑیوں نے (آنے کے بعد) پیدا کیا ہے۔

اسی طرح بہت سے بین الاقوامی قوانین ہیں۔ مثلاً بحری جہازوں کے لئے بین الاقوامی قوانین' کہ سمندری راستوں میں بین الاقوامی حقوق کیا تقاضا کرتے ہیں۔ ماضی میں ان کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ ایک جدید ضرورت ہے اور قانون بھی جدید ہے۔ اسی طرح قوموں کے درمیان فضائی قوانین' مشترک اور عمومی قوانین موجود ہیں۔ کیونکہ ضروریات بدلتی ہیں لہٰذا قوانین

کو بھی بدلنا چاہئے۔

جواب

البتہ یہ ایک اور بات ہے۔ اس موضوع پر گفتگو ہونی چاہئے۔ یہ بات درست ہے کہ انسانی زندگی کے حالات بدلتے رہتے ہیں' انسانی ضروریات بدل جاتی ہیں۔ لیکن معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ انسان کی کچھ ضروریات ثابت اور دائمی ہیں اور کچھ ضروریات متغیر اور عارضی۔ انسان کی تمام ضروریات متغیر نہیں ہیں۔ انسان کی معنوی اور روحانی زندگی سے تعلق رکھنے والی ضروریات ثابت ہیں اور وہ ضروریات جو انسانی زندگی کی شکل وصورت سے تعلق رکھتی ہیں متغیر و تبدیل ہونے والی ہیں۔ انسانی زندگی کی شکل کے ہمیشہ بدلتے رہنے کو آپ اس امر کی دلیل نہیں بنا سکتے کہ زندگی کی روح کو بھی ہمیشہ بدلتے رہنا چاہئے۔ دینی مسائل کا ربط زندگی کی روح سے ہے' اسکی شکل سے نہیں۔ اگر آپ خود اسلام کا مطالعہ کریں (اور یہ اسلام کے امتیازات میں سے ہے) آپ ایک مقام پر بھی نہیں دیکھیں گے کہ اسلام نے زندگی کی شکل وصورت کو مرکز نگاہ قرار دیا ہو اور یہ کہا ہو کہ مجھے یہی صورت درکار ہے' اس صورت کو نہیں بدلنا چاہئے۔ بلکہ وہ زندگی کے روحانی اور معنوی پہلو کو مدنظر رکھتا ہے۔

انسان اور کائنات بھی ایسے ہی ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز متغیر ہے' تو اس طرح سے "ہر چیز" کہنا بھی درست نہیں ہے۔ طبیعت' کائنات کا بدلتا چہرہ ہے لیکن اگر کائنات کا ایک ثابت رُخ نہ ہوتا تو محال تھا کہ اس کا یہ متغیر رُخ ہوتا۔ اگر ہر چیز تغیر پذیر ہوتی جیسا کہ ماضی میں ہراکلیتوس نے کہا ہے اور ہمارے زمانے میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے' تو کوئی چیز بھی' کسی لحاظ سے اور کسی بھی رُخ سے دو لمحوں میں ایک حال پر باقی نہ رہتی۔ گزشتہ اور آئندہ میں کوئی ارتباط برقرار نہیں رہ سکتا تھا اور کائنات میں کوئی قانون نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہی کائنات' اپنی اس متغیر صورت کے ساتھ' (جس کے متعلق ہم نے کہا) کہ طبیعت کائنات کا متغیر چہرہ ہے' ایک ثابت رُخ بھی رکھتی ہے' جو کائنات کے اس متغیر چہرے کا محافظ ہے۔ کیونکہ اگر وہ ثابت رُخ نہ ہوتا' تو اس

متغیر رُخ کا وجود بھی نہ ہوتا۔ جن مسلمان فلاسفہ نے حرکتِ جوہریہ کو پیش کیا ہے انہوں نے کائنات کے رُخِ ثابت کی طرف بھی توجہ کی ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ طبیعت متغیر ہے لیکن اس طبیعت کی ایک روح ہے جو ہمیشہ ثابت ہے۔ اسی حوالے سے مولانا روم کے بلند درجے کے اشعار ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

قرنھا بر قرنھا رفت ای ھمام   وین معانی برقرار و بر دوام
آب مُبدّل شد دراین جو چند بار   عکس آن خورشید دائم برقرار
پس بنایش نیست بر آبی روان   بلکہ بر اقطار عرض آسمان
این صفتھا چون نجوم معنوی است   وان کہ بر چرخ معانی مستوی است

''اے دلیر! صدیوں پر صدیاں بیت گئیں لیکن یہ معانی برقرار ہیں اور دائمی ہیں۔
اس ندی میں پانی کتنی ہی مرتبہ بدل گیا لیکن اس خورشید کا عکس ہمیشہ برقرار ہے۔
لہٰذا اسکی بنیاد آبِ رواں پر نہیں بلکہ عرضِ آسمان کی حدود پر ہے۔
یہ صفات معنوی و روحانی ستاروں کی طرح ہیں اور وہ ہیں جو چرخِ معانی کی ہم سطح اور اسکے برابر ہیں۔''

یوں کائنات میں کچھ حقائق ثابت ہیں اور ایک متغیر صورت ہے۔ خود ہمارے اندر (بھی اسی طرح ہے) ہم اگر ایک روح اور ایک حیاتِ ثابت اور ایک متغیر پہلو کے حامل نہ ہوتے' تو ہمارا یہ متغیر پیکر بھی نہ ہوتا۔ یہ جو ہم ہم ہیں' ہم وہی چالیس سال پہلے والے اور پچاس سال پہلے والے آدمی ہیں' حالانکہ ہمارا یہ بدن کئی مرتبہ تبدیل ہو چکا ہے اور جھڑ چکا ہے۔اس کا کچھ حصہ ناخنوں کی صورت میں کوڑے دان میں جا پڑا ہے اور اسکے دوسرے حصے دوسری صورتوں سے اس سے جدا ہو چکے ہیں۔ ہمارے بدن کی کھال کے خلیے (Cells) پپڑی کی صورت میں جھڑ جاتے ہیں اور دوسری صورتوں سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور ہمارا وہ دس سال پہلے کا بدن اب خدا جانے کن کوڑے دانوں میں پڑا ہے' لیکن ہم ہم ہیں' اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہماری روح باقی ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی بھی ہو بہو انسانی بدن اور ساری کائنات کی طرح ہے۔ اسکی ایک روح ثابت ہے

اور ایک پیکرِ متغیر۔

ثباتِ اخلاق

مثلاً قدیم زمانے سے انسان اپنی جبلتوں کو ایک نظام کے تحت لانے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس میں شہوت کی جبلت تھی' جاہ طلبی کی جبلت تھی' جنسی جبلت تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اس میں حصولِ علم کی جبلت اور کھوج لگانے کی حس بھی پائی جاتی تھی۔ وہ زیبائی کی جبلت کا حامل تھا' نیکی' احسان اور اخلاق کی جبلت رکھتا تھا اور عبادت و تقدیس کی جبلت کا مالک تھا۔ طرح طرح کی جبلتوں اور غرائز کا حامل تھا۔ اس وقت ہم ان کی بنیاد کے بارے میں' کہ ان سب کی جڑ ایک ہے یا نہیں' گفتگو نہیں کرتے۔

انسان کو ضرورت تھی کہ اپنی ان جبلتوں کو کوئی نظام دے۔ ان جبلتوں کو کسی نظام کے تابع کرنے کا نام ''اخلاق'' ہے۔ البتہ اخلاق اور آداب و رسوم میں فرق ہے۔ جو چیز ان جبلتوں کو کسی نظام کے تابع کرنے سے تعلق رکھتی ہے' وہ تبدیل نہیں ہوتی۔

مثلاً انسان کو چاہئے کہ اپنے تربیتی اصول میں ہمیشہ اپنی عقل کو شہوات اور جاہ طلبی پر (قدما کی اصطلاح میں عقل کو نفس پر) حاکم قرار دے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ خواہ بدن کہنہ و فرسودہ ہو جائیں اور کائنات بھی پیکرِ کہنہ ہو جائے لیکن یہ قانون تبدیل نہیں ہوگا۔

اسی طرح (کیا) آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استقامت اور ثابت قدمی جو ایک اخلاقی صفت اور مظہر ہے اب پرانی ہو چکی ہے۔ ہزار سال پہلے استقامت انسان کے لئے اچھی چیز تھی۔ لیکن اب اچھی نہیں ہے۔ خود اعتمادی اور دوسروں کا سہارا نہ لینا قدیم زمانے میں اچھی بات تھی لیکن اب یکسر تبدیلی آچکی ہے' اب اسکے برعکس کرنا اچھا ہے؟ اسی طرح اجتماعی خصوصیات' مثلاً سچ بولنا' جھوٹ نہ بولنا' امانتداری اور خیانت نہ کرنا' یہ سب امور روحِ حیات سے مربوط ہیں۔ یا جنہیں حقوقِ انسانی قرار دیا جاتا ہے' عدالت' آزادی اور مساوات۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید دنیا' اب ان باتوں کو قبول نہیں کرتی۔ اب عدالت فرسودہ ہو چکی ہے۔ اب آزادی پرانی بات ہو چکی ہے'

اب مساوات ماضی کی بات بن چکی ہے' اب انسان دوستی قصۂ پارینہ ہوگئی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آج اگر کسی بھی قوم کو اپنی تاریخ میں کوئی ایسا شخص ملتا ہے جس نے چند ہزار سال پہلے مثلاً آزادی یا مساوات کو احترام دیا تھا' عدالت کا احترام کیا تھا اور کم تر ظلم کیا تھا' تو (یہ قوم) اپنے لئے وجہ افتخار کے طور پر اس کا ذکر کرتی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

کیوں انسان چند ہزار سال قبل سے تعلق رکھنے والے ایک مسئلے کو اپالو اور خلا کے زمانے میں اٹھاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امور روحِ زندگی سے ربط رکھتے ہیں' زندگی کی شکل وصورت سے مربوط نہیں ہیں۔

پس اگر کوئی کہتا ہے کہ انسانی ضروریات تبدیل ہو جاتی ہیں' تو ہم کہیں گے کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا آپ بیان کر رہے ہیں۔ انسان کی ضروریات دو طرح کی ہیں۔ ثابت و دائمی ضروریات اور متغیر ضروریات۔ ایسا نہیں ہے کہ سب ضروریات متغیر ہوں۔

رہا یہ سوال کہ اسلام نے ثابت و متغیر ضروریات کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا ہے' اس پر بعد کی فصل میں بات کریں گے۔

زمانے کی عصمت کا مسئلہ

اس مقام پر ضروری ہے کہ ہم ایک اور معاملے کا بھی جائزہ لیں اور وہ یہ ہے کہ : یورپ کے بعض فلسفی مکاتب فکر میں' خاص طور پر ہیگل کے فلسفے میں' جس میں نیشنلزم اور نسل پرستی کا سہارا لیا گیا ہے' اس میں ایک اور چیز (اگر چہ یہ ہماری دی ہوئی تعبیر ہے) عصمت زمان یعنی زمانے کے معصوم ہونے کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ اُس کا نظریہ ہے کہ ہر قوم کی روح ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اور قوم کی روح کو عقلِ مطلق کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا قوم کی روح غلطی نہیں کرتی۔ ایک فرد غلطی کر لیتا ہے' لیکن روحِ قوم' دوسرے لفظوں میں روحِ زمان غلطی نہیں کرتی۔

لہٰذا بعض لوگوں نے اس بات کو اس شکل میں بیان کیا ہے کہ کلی طور پر انسانی معاشرے کی روح اور روحِ زمان غلطی نہیں کرتی۔

یہ کیسے ہوتا ہے؟

ہمیں اس مقام پر بھی کچھ توقف کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ بات اس طرح نہیں ہے۔ زمانہ خود سے کوئی چیز نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ زمانہ غلطی کرتا ہے یا زمانہ غلطی نہیں کرتا۔ یہ انسان ہے جس کے بارے میں ہمیں گفتگو کرنا چاہئے کہ وہ غلطی کرتا ہے یا غلطی نہیں کرتا؟

انسان' معاشرے میں مختلف چیزیں وجود میں لاتا ہے۔ کبھی وہ ایسے پھول ہوتے ہیں جو عقلِ انسانی، علمِ انسانی اور انسانی تحقیق وجستجو کے ذریعے کھلے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی بعض اوقات انسان غلطی کر جاتا ہے۔ لیکن اگر نسبت کے لحاظ سے حساب کریں تو انسان جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی اسکی غلطیاں کم ہوتی جاتی ہیں اور وہ حقیقت کو کشف کرنے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ زمانے کے بہت سے مظاہر ایسے ہیں جو سو فیصد خالصتاً انسانی علم کا حاصل ہیں اور انسانی تحقیق وعقل کا نتیجہ ہیں۔

یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے لازماً ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ بلکہ بعض پہلو ایسے ہیں کہ انسان کے لئے ناممکن ہے کہ اُن سے ہم آہنگ نہ ہو' یعنی وہ اُن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتا۔ اقتصادی دنیا میں جب کوئی نیا طریقہ پیداوار سامنے آتا ہے' جو ہر پہلو سے سستا تیار ہوتا ہے اور اُس کی طاقت اور عمر بھی زیادہ ہوتی ہے' تو جو کوئی اُسی قدیم طریقے سے پیداوار حاصل کرتا ہے جو اُس سے زیادہ قیمت پر تیار ہوتی ہے' اپنی پیداوار کو وہ لامحالہ مہنگی قیمت پر فروخت کرے گا جبکہ وہ (دوسرا) ارزاں قیمت پر بازار میں لے آتا ہے' اصلاً وہ اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ امور ہیں جو واقعاً جبرِ تاریخ ہیں اور جبرِ تاریخ کے مقابل ٹھہرا نہیں جاسکتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آج کی دنیا میں طرح طرح کے دفاعی وسائل بنائے جانے کے باوجود ایک ملک ضد کرنا چاہے اور کہے کہ میں اپنی حفاظت کے لئے قدیم دفاعی وسائل مثلاً شمشیر و نیزے استعمال کروں گا۔ واضح ہے کہ اس کا مطلب دفاع نہ کرنا اور شکست تسلیم کر لینا ہے۔ محال اور ناممکن ہے کہ قدیم دفاعی اسباب و وسائل

ان جدید اسباب و وسائل کے سامنے ٹھہر سکیں جو مسلسل روز بروز تبدیل ہو رہے ہیں۔

البتہ ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ انسان صرف ایک صاحب علم موجود نہیں اور اسکے کام صرف اسکے غریزۂ علم کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ انسان ایک شہوت پرست' خواہش پرست اور جاہ طلب موجود بھی ہے۔ دنیا میں جو بہت سے مظاہر وجود میں آتے ہیں اور (جن میں سے) بہت سے نئے اور تازہ ہیں' جب ہم اُن پر غور کرتے ہیں کہ ان کی پیدائش علم و عقل کا نتیجہ ہے یا شہوت' حرص' طمع اور جاہ طلبی کی وجہ سے یہ وجود میں آئے ہیں' تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علم کے مولود نہیں ہیں' بلکہ انسان کی جاہ طلبی نے انہیں پیدا کیا ہے' انسان کی شہوت پرستی کا نتیجہ ہیں' یہاں تک کہ انسان کی جاہ طلبی کے ہاتھ میں قید علم کا نتیجہ ہیں۔

میں ایک سادہ مثال عرض کرتا ہوں: ہیروئن ایک جدید مظہر (Phenomena) ہے یا قدیم؟ دنیا کے جدید ترین مظاہر میں سے ایک ہیروئن ہے۔ یہ بنیادی طور پر علم کا نتیجہ ہے۔ لیکن علم آزاد کا نہیں۔ علم و عقل کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ اس علم کا نتیجہ ہے جو شہوت اور جاہ طلبی کے ہاتھ میں اسیر ہے۔ یہ ایٹم بم اور یہ غیر معمولی تباہ کن اسلحے کیا جدید دنیا کی ترقی اور تحول کا نتیجہ نہیں؟ تو پھر کیوں بڑی طاقتیں آپس میں بیٹھ کر مشورہ کر رہی ہیں کہ کیا کوئی راہ حل نکل سکتی ہے کہ اس ترقی کا راستہ روکا جاسکے۔ بلکہ کیا اس ساری تباہ کن قوت و طاقت کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے؟ لیکن باہمی اتفاق رائے کے ساتھ' ایسے نہیں کہ ایک کے پاس رہ جائیں اور دوسرے کے پاس نہ ہوں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ علم کو ایک غلط راستے پر لے گئے ہیں۔ بجلی کشف ہوئی ہے' ایٹم کشف ہوا ہے' بارود اور ڈائنامیٹ کشف ہوئے ہیں۔ جس نے ان چیزوں کو سب سے پہلے کشف کیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان طاقتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے۔

آپ نے دیکھا کہ ڈائنامیٹ ایجاد کرنے والے شخص نے جب یہ دیکھا کہ اسکی ایجاد سے غلط کام لیا جارہا ہے' تو وہ اتنا دکھی ہوا کہ اس نے اپنے اس عمل کے کفارے کے طور پر اپنا نوبل انعام ایسے افراد کو دے دیا جو ایک مفید خدمت انجام دے رہے تھے۔ ہم نے متعدد بار سنا ہے کہ ہمارے دور کا' اور اسی دور میں وفات پانے والا عظیم سائنسدان آئن اسٹائن ہمیشہ اس بات پر

افسوس کرتا رہا کہ اس نے ایٹم کے حوالے سے جو انکشاف کیا' اُسے مفید سے پہلے مضر کام کے لئے استعمال کیا گیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اے کاش میں نے یہ انکشاف نہ کیا ہوتا' تاکہ وہ انسان کی جاہ طلبی اور خواہش پرستی کے لئے استعمال نہ ہوتا۔

لہٰذا زمانہ (کہ جو درحقیقت انسان ہی ہے) اس میں ترقی وکمال کا امکان بھی پایا جاتا ہے اور انحراف وگمراہی کا بھی۔ پس ہم یہ بات قبول نہیں کرسکتے کہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اس مسئلے کا جائزہ لینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانے کے تقاضوں سے مراد انسانی زندگی کے تقاضے ہیں۔ آپ زمانے کے کن تقاضوں سے کہتے ہیں کہ ہم آہنگ ہونا چاہئے؟ کیا ہر نئی پیدا ہونے والی چیز اور ہر وہ چیز جو اس صدی میں ظاہر ہوئی ہے' وہ صحیح ہے؟ یا ہر وہ چیز جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا ذائقہ آج کی دنیا کو بھلا نہیں لگتا' آج کی دنیا اسے پسند نہیں کرتی (وہ غلط ہے؟) آج کی دنیا پسند کرے یا ناپسند کرے۔ کیا دنیا میں یہ بھی کوئی معیار ہے کہ ہم کہیں کہ آج کی دنیا پسند کرتی ہے یا نہیں کرتی ہے۔ آج کی دنیا یعنی لوگوں کی اکثریت' یہ بھی معیار نہیں ہوسکتی۔ زمانے کی سامنے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

ہم نے اپنی تقریر کے آغاز میں یہ آیت پیش کی تھی کہ:

"اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ."

"ہم نے یہ امانت آسمان' زمین اور پہاڑوں کو پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف کا اظہار کیا جبکہ انسان نے اسے اٹھالیا"۔

(سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۷۲)

انسان جو اس بڑی ذمے داری کا حامل ہے۔ اسکی دو ذمے داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ زمانے کے راستے پر آگے بڑھے اور زمانے کی ترقی کی مخالفت نہ کرے' اس کا راستہ نہ روکے' بہت سے لوگوں کی طرح قدامت پرستی نہ کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسکی اتنی ہی بڑی ایک اور ذمے داری بھی ہے' اور وہ یہ کہ زمانے کے انحرافات کا مقابلہ کرے۔

اس مقام پر ایک تیسری ذمے داری وجود میں آ جاتی ہے اور وہ ہے زمانے کی ترقیوں اور انحرافات میں تمیز کرنا۔ تاکہ اس طبقے کی طرح جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے زمانے کی پیشرفت کو انحراف قرار دے کر اس سے جنگ کے لئے نہ اٹھ کھڑا ہو اور اسی طرح زمانے کے انحرافات کو ترقی کا نام دے کر ان کے پیچھے نہ چل پڑے۔

ہماری ذمے داری

ہم جو اپنے آپ کو معارف اسلامی کا نگہبان سمجھتے ہیں' ہمیں اپنے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ قرار دینا چاہئے کہ گہرے علمی' فلسفی' اجتماعی اور وسیع تاریخی مطالعات کی بنیاد پر افراط و تفریط کے شکار ان دو طبقوں کے مابین اپنے معاشرے کے لئے راستہ واضح اور نمایاں کریں (جس طرح ہم زمانے کے انحرافات کو ترقی کے نام پر قبول کرنے والے طبقے کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں) اسی طرح اُس طبقے کے خلاف بھی جدوجہد کریں جو ہر جدید اور نئی چیز کی مخالفت کرتا ہے۔ بعض افراد ایسے تھے کہ گویا ان کی تمام تر وابستگیاں اور عہد و پیمان فرسودہ اور کہنہ چیزوں سے وابستہ تھے۔ مثلاً لکھنے کے لئے روشنائی کا ایک قلمدان ہونا چاہئے اور (اسکے اندر) لیقہ (دھاگے یا ریشم سے بنی ڈوری جسے دوات میں ڈال کر رکھا جاتا ہے) اس خاص شکل کا ہونا چاہئے جبکہ اس روشنائی کی تیاری میں کتنا وقت صرف ہو جاتا ہے اور بار بار قلم کو دوات میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ عمل کتنا وقت مانگتا ہے' پھر قلم کسی جگہ موٹا لکھتا ہے اور کسی جگہ باریک۔ جبکہ اسکی جگہ ایک فاؤنٹین پین کو آدمی انتہائی کم وقت میں ایک مرتبہ بھر لیتا ہے' بعد ازاں مسلسل کئی گھنٹے لکھتا رہتا ہے۔ اس طرح ، کی فکر مسلسل دوات اور قلم میں مشغول نہیں رہتی۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد قدیم زمانے سے ہمیشہ دوات اور قلم سے کام کرتے آئے ہیں' لہٰذا وہ پین سے کام نہیں کرتے۔ جیسے ایک شخص کا کہنا تھا:

"یترکون حمار اللہ و یرکبون شمن دوفر."(۱)

۱۔ فرانسیسی زبان میں Chemin de fer ریل گاڑی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

''اللہ کے گدھے کو چھوڑ دیتے ہیں اور ریل گاڑی پر سوار ہو جاتے ہیں۔''

ہمیں تو یاد نہیں لیکن ہم نے سنا ہے کہ مشہد میں جب شروع شروع میں (امام رضا کے) آستانے میں بجلی لگائی گئی تو کسی نے ہنگامہ برپا کر دیا' لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے بجلی کی تمام لائٹس بند کر دیں۔ کیوں؟ کیا اسلامی منابع (Sources) میں کہیں یہ بات آئی ہے' یا مثلاً قرآن کی کسی آیت میں ہے کہ اے ایمان والو! تیل کے چراغ جلایا کرو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تیل کے چراغوں کو چھوڑ دو۔ اور اے ایمان والو! تم ہمیشہ گدھے کی سواری کیا کرنا اور گدھے کے سوا کسی چیز پر سوار نہ ہونا۔ یہ طرز عمل دین کو لوگوں کے درمیان رائج اُن رسوم و رواج سے مخلوط کر دیتا ہے' جو رفتہ رفتہ مقدس بن جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مقام پر ایک نیا اسکول کھلا تھا۔ (اسکے مخالف) ایک صاحب یوں استدلال کرتے تھے۔ البتہ موضوع سے غیر متعلق بات کرتے تھے اور دراصل مغالطے کا شکار ہوتے ہوئے استدلال کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: جناب عالی! یہ کیا بات ہوئی' کیا وہ لوگ جو مکتب جاتے تھے ملاّ (اور عالم) نہیں بنتے تھے؟ کیا شیخ مرتضیٰ انصاری اسی طرح سے الف زبر آ' الف زیر اِ' الف پیش اُ کے ذریعے سے ملاّ نہیں بنے؟ ہمارے بچے بھی ایسے ہی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ مرتضیٰ انصاری کے شیخ مرتضیٰ انصاری بننے کی وجہ یہی تھی۔ شیخ مرتضیٰ انصاری جو شیخ مرتضیٰ انصاری بنے تو اس کی وجوہات اور تھیں۔ البتہ یہ بھی ان کے راستے کی کوئی بڑی رکاوٹ نہ تھی۔ ان کے لئے بھی اگر تدریس کا کوئی بہتر طریقہ متعین ہوا ہوتا تو وہ جو کچھ بنے اس سے بہت بہتر بنتے۔ یہ کوئی جزوِ اسلام نہیں کہ ہم کسی نوآموز کو تعلیم دینا چاہیں تو اسے الف ب کی اسی ترتیب سے اور پھر بغیر حرکت کے الف اور اسی صرح سے یا کسی اور صورت سے یاد کروائیں۔ اسلام نے ایسی چیزوں پر انحصار نہیں کیا ہے۔

دوسرے حصے میں جبکہ ہم اسلامی مسائل کا ذکر کرنے لگے ہیں' پھر فہرست وار چند نکات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اسلام قانون سازی کے ایک انتہائی عجیب نظام کا حامل ہے۔ (اگر میں اسے جادو کہوں تو ڈرتا ہوں کہ توہین نہ ہو جائے) جس کی وجہ سے وہ زمانے کی مسلسل ترقی کے

ساتھ ہمیشہ ہم آہنگ رہ سکتا ہے' بلکہ اس کا ہادی ورا ہنما بن سکتا ہے اور اسکے ساتھ ساتھ زمانے کے انحرافات کا مقابلہ بھی کرسکتا ہے۔

اس کا اصل راز وہ چیز ہے جسے ایک آیت قرآنی میں بیان کیا گیا ہے' اور سربستہ انداز میں ایک نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو قانونِ خلقت سے جدا نہیں۔ یعنی اس قانون کا بنانے والا اس کائنات کا خالق ہے اور اس نے اس قانون کو خلقت سے ہم رنگ وضع کیا ہے۔ جس کے متعلق اس آیت میں فرماتا ہے:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا"

"آپ اپنے رُخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرتِ الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔"

(سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۳۰)

کہتا ہے کہ دین خلقتِ الٰہی ہے اور کائنات کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہے۔ ایک اور آیت میں کہتا ہے:

"وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ"

"اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے۔"

(سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۷)

اس لئے باقی رہ جاتا ہے کہ لوگوں کے لئے نفع بخش اور مفید ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے۔ اسلام میں ایسی کون سی چیزیں ہیں جنہوں نے اس دین کو خلقت اور قوانین خلقت (جن میں تغیر و تکامل کا قانون بھی شامل ہے) سے ہم آہنگ کر رکھا ہے۔

اسلام میں عقل کا اصول

ان اسباب میں سے ایک سبب وہ اصول ہے جس کا اسلام عقل کے لئے قائل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو کوئی ایسا دین اور کوئی ایسی آسمانی کتاب نہیں ملے گی جس نے اسلام کی

مانند عقل کو اہمیت اور اصالت دی ہو۔ افسوس کہ ہم اپنے دین اسلام کے اچھے مبلغ نہیں بن سکے۔ کیا یہ کوئی مذاق کی بات ہے کہ جب آپ فقہی کتب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اجتہاد و استنباط کے منابع (sources) کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ کتاب، سنت، اجماع اور عقل۔ عقل کو کتاب، سنت اور اجماع کے ساتھ ساتھ ایک منبع (source) قرار دیا گیا ہے۔ اجماع کی بھی اپنی ایک خاص بحث ہے اور ایک معنی کے لحاظ سے یہ عین کتاب وسنت ہے اور اُن سے جدا نہیں ہے۔

یہ ایک بہت بڑا افتخار ہے کہ صدر اسلام میں ہی ایسے علما موجود تھے جو کہتے تھے کہ عقل و شرع میں ہم آہنگی ہے۔ کُلُ ماحکَمَ بِهِ الْعَقلُ حَکَمَ بِهِ الشَّرْعُ وَكُلُّ ماحکَمَ بِهِ الشَّرْعُ حَکَمَ بِهِ الْعَقلُ (ہر وہ چیز جس کا عقل حکم دیتی ہے شریعت بھی اس کا حکم دیتی ہے اور ہر وہ چیز جس کا شریعت حکم دیتی ہے عقل بھی اسی کا حکم دیتی ہے) اُن کا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعاً عقل ایک چیز کشف کرتی ہے اور بالفرض ہمارے پاس اسکی نقلی (شرعی) دلیل نہ ہو تو عقل کا کشف کرنا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اسلام اس کی تائید کرتا ہے، اگرچہ نقلی دلیل ہم تک نہ پہنچی ہو یعنی تھی لیکن ہم تک نہیں پہنچی۔ اسی طرح شریعت قطعی طور پر جس چیز کا حکم کرتی ہے، عقل بھی اس کا حکم کرتی ہے۔ یعنی اس حکم کا کوئی راز اور بھید تھا جو اگر عقل کو معلوم ہو جائے تو اسکی تصدیق کرے گی۔

یعنی اسلام کے احکام مجہولات و مرموزات کی اساس پر استوار اور عقل و فکر کی دسترس سے خارج نہیں ہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کے ایسے فوائد اور نقصانات کی بنیاد پر مقرر کئے گئے ہیں جو عقل کے لئے قابلِ مطالعہ ہیں۔

"کُلُ ماحکَمَ بِهِ الشَّرْعُ حَکَمَ بِهِ الْعَقلُ" (کا قاعدہ) یہ کہنا چاہتا ہے کہ اسلام ایک منطقی دین ہے۔ فرض کیجئے کہ اسکے کسی حکم کا فلسفہ اس وقت عقل کے لئے واضح نہیں، تاہم وہ عالم مجہولات سے تعلق رکھنے والا کوئی مرموز امر بھی نہیں ہے، جو اصلاً کلی طور پر عقل سے متصادم ہو۔ جیسے عیسائیت تثلیث کے بارے میں کہتی ہے کہ ایمان اور چیز ہے اور عقل اور چیز۔ جبکہ ایمان اور

عقل آپس میں جدا نہیں۔ اسلام میں ایمان اور عقل کی جدائی کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسی بات نے فقہ اسلامی کو قوت بخشی ہے۔ (دین اسلام کے اصول بنیادی طور پر عقل پر انحصار کرنے والا علاقہ ہیں جبکہ اسکے برعکس عیسائیت کے اصول دین عقل کے لئے ممنوعہ علاقہ ہیں) یہی وہ بات ہے جو علمائے اسلام کو ایک کھلا میدان مہیا کرتی ہے کہ وہ مسائل میں عقل کو استعمال کریں اور خود یہی امر گزشتہ ادوار میں فقہ اسلامی کی کامیابیوں کا ایک سبب رہا ہے۔ بہت سے بین الاقوامی ادارے جہاں فقہ اسلامی کا مطالعہ کیا گیا ہے انہوں نے فقہ اسلامی میں موجود لچک کی بہت تعریف کی ہے۔ اس میں ایک عجیب لچک موجود ہے۔

اسلام کا زندگی کی شکل کی بجائے اسکی روح پر توجہ دینا

دوسرا سبب جو اسلام میں پایا جاتا ہے (اور جو دنیا کی ترقی و تغیر سے ہم آہنگی کا باعث ہے) وہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اپنی معروضات کے ضمن میں اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی شکلوں اور صورتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اسے اس سے سروکار نہیں کہ وہ زندگی کی کسی خاص شکل کو درست قرار دے اسکی توجہ ہمیشہ زندگی کی روح کی طرف ہوتی ہے۔ اسی لئے اس نے زندگی میں آنے والی ترقیوں کے ساتھ تصادم سے پرہیز کیا ہے۔ جس چیز کو سائنس صنعت اور ٹیکنالوجی آگے بڑھا رہی ہے وہ زندگی کی صورت ہے وہ زندگی کے وسائل ہیں وہ زندگی کی عمارتیں (اور سانچے) ہیں۔ (۱) مثلاً اگر میں پیسے دے کر ان کے عوض کوئی ایسی چیز خرید لوں جس کا مجھے کوئی فائدہ نہ ہو تو اسلام کہتا ہے یہ لین دین باطل ہے تمہیں چاہئے کہ پیسے کے بدلے کوئی مال حاصل کرو جو چیز ثروت نہ ہو اور تمہارے لئے مفید نہ ہو یا اس کا فائدہ تو ہو لیکن اسلام اسے جائز نہ سمجھتا ہو۔

لہذا فقہا کہتے ہیں کہ عین نجس چیزوں سے استفادہ اسلام نے حرام قرار دیا ہے پس ان کی خرید و فروخت جائز نہیں اور وہ باطل لین دین میں سے ہے۔ مثلاً خون اس زمانے میں خون کا

۱۔ اس مقام پر ٹیپ ہونے سے رہ گیا ہے۔

استعمال یہ تھا کہ اسے پیا جاتا تھا۔ اسلام نے خون پینا حرام قرار دیا ہے۔ اب اگر زمانہ بدل گیا ہے اور خون سے کسی فائدے کا حصول پتا چل گیا ہے اور پہلے زمانے میں خون سے جو استفادہ کرتے تھے اسکے بجائے کوئی اور فائدہ معلوم ہوگیا ہے جو اس سے مختلف ہے جسے اسلام نے حرام قرار دیا تھا اور اب جو استفادہ کیا جاتا ہے وہ ایسا ہے جسے خود اسلام نے بھی جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً یہی کہ انسانی خون انسانی جسم کے لئے یا زخمیوں کے لئے کام آتا ہے (اس صورت میں حکم بدل جاتا ہے)۔ اسلام نے کہا تھا کہ خون پینا حرام ہے' یہ نہیں کہا تھا کہ اسے کسی دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا حرام ہے۔ گزشتہ زمانے میں پہلی صورت میں معاملہ اور سودا ہوتا تھا' لہٰذا اس پر "اکل المال بالباطل" کا اصول لاگو ہوتا تھا۔ آج بدل گیا ہے' اب اس پر "اکل المال بالباطل" کا اصول لاگو نہیں ہوتا۔

لہٰذا وہ قانون جیسے خود قرآن میں بیان کیا گیا ہے: لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ (خبردار ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھانا۔ سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۸ اور سورہ نساء ۴۔ آیت ۲۹) وہ ثابت' ناقابل تغیر اور ناقابل تنسیخ ہے۔ لیکن ایک چیز کا ایک روز سودا ہو تو وہ "اکل المال بالباطل" ہے جبکہ دوسرے دن نہیں' اسکی وجہ یہ ہے کہ "اکل المال بالباطل" (کا قانون) اسے کنٹرول کرتا ہے۔ لہٰذا کیونکہ (یہاں) موضوع (جس کی بنیاد پر پہلا حکم تھا) بدل گیا ہے' اس لئے حکم بھی تبدیل ہوگیا ہے۔ البتہ یہ نسخ نہیں ہے۔ اسلام کا قانون منسوخ نہیں ہوا ہے' بلکہ موضوع بدل گیا ہے' اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔

آقائے شیخ علی زاہد کا واقعہ

آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔ ہمارے زمانے کے ایک انتہائی معروف زاہد' جو واقعاً ایک متقی اور پرہیز گار انسان اور عالم فقیہ بھی تھے' وہ جناب مرحوم شیخ علی زاہد قمی تھے۔ وہ نجف میں ہوا کرتے تھے۔ وہ غیر ملکی مصنوعات کے استعمال سے پرہیز کے معاملے میں انتہائی سخت اور کٹر تھے۔ ایک طرح سے گاندھی تھے لیکن اپنے لئے نہ کہ سب لوگوں کے لئے۔ لہٰذا گاندھی کے کام نے جو

اثرات مرتب کیے وہ ان کا یہ عمل مرتب نہ کر سکا۔ انہوں نے خود ہی سے اپنے لئے غیر ملکی اشیا کے استعمال کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ البتہ ایک صحیح نکتۂ نظر کی بنیاد پر۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی مصنوعات موجود ہیں ہم غیروں کی اشیا استعمال نہیں کریں گے۔ جب تک اپنے وطن کا اور اپنے ہاں کا تیار کردہ کپڑا موجود ہوتا وہ باہر کا کپڑا نہیں خریدتے تھے۔ اگر چائے پینا چاہتے' تو چائے بھی باہر کی نہیں پیتے تھے' اپنے ہاں کی پیتے تھے۔ اگر شکر بھی غیر ملکی ہوتی تو اسے استعمال نہ کرتے اور (اسکے بجائے) مثلاً کشمش کھالیتے۔ ایک انگریز خاتون اور اسکی بیٹی مسلمان ہوئے اور انہوں نے کربلا میں سکونت اختیار کرلی۔ وہ لڑکی واقعاً مسلمان ہوگئی تھی کیونکہ آخر تک اسکی زندگی کے بارے میں بعض لوگ گواہ ہیں۔ وہ ایک بہت اچھی اور متدین مسلمان تھی۔ جناب شیخ علی زاہد کی زوجہ وفات پاگئیں۔ اس لڑکی نے خود اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ جناب شیخ علی زاہد سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ جناب شیخ علی نے اس سے شادی کرلی۔

بعد میں لوگ بتاتے تھے کہ انہوں نے اسکے ساتھ ایک اچھی زندگی بسر کی۔ اس ایک یورپی عورت نے' اس زاہد انسان کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح ڈھال لیا تھا کہ کہتے ہیں کہ اسکی وفات کے بعد جناب شیخ علی تقریباً ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ کسی نے ان سے کہا۔ جناب! آپ تو کہتے تھے کہ ہم غیر ملکی اشیا استعمال نہیں کرتے (حاضرین کا قہقہہ)۔ کہنے لگے۔ بیٹا! موضوع بدل گیا ہے۔ (حاضرین کا قہقہہ)۔ بولے: اب وہ باہر کی نہیں رہی' مسلمان ہوگئی ہے' موضوع بدل گیا ہے۔ لہٰذا موضوع کی تبدیلی کا مسئلہ دوسرا ہے۔

ایک اور مثال عرض کرتا ہوں: آپ فقہ میں ایک باب دیکھتے ہیں' جس کا عنوان ہے "سبق و رمایہ" یعنی ہر مسلمان کے لئے گھڑ دوڑ مستحب ہے۔ یہاں تک کہ آپ جانتے ہیں کسی بھی مقام پر پیسوں کی شرط رکھنا جائز نہیں لیکن یہاں جائز ہے۔ لا سَبَقَ اِلّا فی خُفٍّ اَوْ حافِرٍ اَوْ نَصْلٍ۔

"رمایہ" تیر اندازی کو کہتے ہیں' اور یہ بھی مستحبات میں سے ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ فقہ اسلامی کی یہ کتاب "سبق و رمایہ" مکمل طور پر منسوخ ہوچکی ہے۔ کیونکہ اب سوائے ایک تفریح

کے گھڑ دوڑ کی کوئی ضرورت نہیں رہی' اور نہ تیر اندازی اور تیر کمان کی کوئی ضرورت رہ گئی ہے۔ لیکن اگر کوئی مطالعہ کرے تو دیکھے گا کہ "سبق و رمایہ" ایک اصولِ ثابت سے نکلے ہیں اور وہ اصول یہ ہے کہ: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (اور تم سب ان سے مقابلے کے لئے امکانی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑوں کا انتظام رکھو۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۰)

اسلام ایک اجتماعی دین ہے اور ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک زبردست دفاعی قوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دشمن کے مقابلے میں اعلیٰ پیمانے پر طاقتور بنو۔ اس نے گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کو ایک سنت بنا دیا' کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اسکے سپاہی میدانِ جنگ میں قوی اور طاقت ور ہوں۔ اس حکم کی روح "اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ" ہے۔ "سبق و رمایہ" تو ایک لباس (کی مانند) ہے جو اسلام نے اس ثابت اور ناقابلِ تنسیخ اصول کو پہنایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں سبق و رمایہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ کی اجرائی اور عملی شکل ہے۔ "سبق و رمایہ" اس وقت تک سنتِ مستحب ہیں جب تک وہ معاشرے میں اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ جب اس تیر اندازی اور گھڑ دوڑ کی جگہ کوئی دوسری چیز لے لے اور ان کی ذمے داری کوئی اور چیز انجام دینے لگے' تو پھر وہ "اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ" کی اجرائی شکل نہیں رہیں گے' دوسری چیز ان کی جگہ لے لے گی' اور پھر اس حکم پر دوسری صورت سے عمل کیا جانا چاہئے۔

اسلام ثابت (ولا متغیر) ضروریات کے لئے ثابت قانون وضع کرتا ہے۔ لیکن متغیر ضروریات کے لئے متغیر صورت سامنے رکھتا ہے۔ متغیر صورت وہ ہے جس نے اسے قانونِ ثابت سے مربوط کر دیا ہے۔ ایک روشن فکر اسلامی عالم اور دانشور کے لئے کافی ہے کہ کہہ دے کہ موضوع تبدیل ہو گیا ہے' اب جس چیز کا مجھے اجرا کرنا چاہئے' وہ یہ ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اب مقابلہ بندوق کے ذریعے ہوتا ہے؟ بہت اچھا' یہ اپنی جگہ پر ہے ۔ مگ اور فنٹم طیاروں کے ذریعے مقابلہ ہونا چاہئے؟ ہاں' اب مقابلہ اس میدان میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسلام کو تیر و کمان سے عشق نہیں ہے۔ اسلام قوت و طاقت کا عاشق ہے۔ اس نے اس مقصد کی خاطر اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ اس

روح کے لئے ایک قالب و پیکر ہے۔ اس حوالے سے ہمارے پاس بہت سی سائنسی اور غیر سائنسی مثالیں موجود ہیں۔

ہماری معروضات کا ایک اختتامیہ باقی ہے۔ اگر آپ نے اجازت دی تو اس موضوع پر کسی دوسرے موقع پر گفتگو کریں گے۔ قانون سازی کے اسلامی نظام میں کچھ اور پیش بینیاں (foresights) موجود ہیں' جنہوں نے اسلامی قوانین میں ایک تحرک اور ڈائنامزم (dynamism) پیدا کر دیا ہے۔ قوانینِ اسلام میں موجود ڈائنامزم کو خود اسلام سے کشف کرنا' ہماری اہم ترین ذمے داریوں میں سے ہے اور یہی اس مشکل کا بہترین حل ہے۔

وصلّی اللّٰہ علی محمّد و اٰلہ الطاھرین

غدیر اور مسلمانوں کو اندر سے درپیش خطرہ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"الحمد لله رب العالمين بارى الخلائق اجمعين و الصلوة و السلام على عبدالله ورسوله وحبيبه وصفيه سيدنا و نبينا ومولانا ابى القاسم محمد (صلى الله عليه و آله وسلم) و على اله الطيبين الطاهرين المعصومين."

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

"اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا."(۱)

☆ یہ تقریر عید غدیر کی رات ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۶۸ء مرکز تعلیم دین و دانش نجف آباد کی مسجد چہار سوق میں کی گئی۔

۱۔ اور آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔ (سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۳)

سب سے پہلے میں آپ بھائیوں اور مولائے متقیان علی علیہ السلام کے تمام شیعوں کو اس عید سعید پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ میں ایک ایسی محفل میں شریک ہوں جو نوجوانوں اور طلبا کے ایک گروہ کی طرف سے منعقد کی گئی ہے۔ درحقیقت جو بات سب سے زیادہ باعث خوشی و مسرت ہے' وہ عام مسلمانوں اور خصوصاً نوجوان طبقے میں ایک دینی و مذہبی تحریک کی علامتوں کا دکھائی دینا ہے' اپنے ملک میں اسکے ہم خود شاہد و ناظر ہیں۔ وہ بھی طلبا کے جوان طبقے میں جن کے اذہان علمی مفاہیم سے آشنا ہیں' جوانی اور طالب علمی' یہ انتہائی مسرت کا باعث ہے۔ اولاً ہر ملک کے جوانوں کے رجحانات دیکھ کر اس ملک کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ملک کے مستقبل کے لوگ ملک کے جوان ہی ہوتے ہیں۔ بوڑھے اور پورے مرد بن جانے والے' افراد گزر جانے والا طبقہ ہیں اور ماضی سے وابستہ ہیں جبکہ جوانوں کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے' خصوصاً تعلیم یافتہ جوان اور طلبا۔

اگرچہ ایک طرف بعض ناپاک عناصر اپنی سرگرمیوں کے ذریعے اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ ہر ممکن طریقے سے نوجوان طبقے کو برائی کی طرف کھینچ لے جائیں' اور دوسری طرف ایسی سرگرمیاں جاری ہیں جن کا مقصد دین و مذہب اور علم و دانش کے درمیان مصنوعی تضاد ایجاد کرنا ہے۔ جوانوں میں پیدا ہونے والی تحریک کا یہ ہراول دستہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مضر اور خطرناک کوششیں بحمد للہ ناکام ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسی محفل میں شرکت پر خوشی اور افتخار محسوس کر رہا ہوں اور اپنی تمام تر غیر معمولی اور بہت زیادہ مصروفیات کے باوجود میں نے اس محفل میں شریک ہونا قبول کر لیا' حالانکہ میں تہران میں بھی کم کم ہی کسی محفل میں شریک ہوتا ہوں۔

یہ مقدس شب' جو عید سعید غدیر کی رات ہے اور مولائے متقیان علی علیہ السلام سے نسبت رکھتی ہے' اس میں بہت سے موضوعات پر بحث و گفتگو کی گنجائش اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس میدان میں انسان جس طرف سے بھی داخل ہو بحث و گفتگو کی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ خود علی علیہ السلام ایک وسیع اور جامع موضوع ہیں۔ انسان حضرت علی کے وجود کے جس پہلو پر بھی بات کرنا چاہے اسے میدان کھلا دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر غدیر اور خلافت' امامت اور ولایت پر حضرت

علی کے نصب کیے جانے کا موضوع بھی اپنے مقام پر بہت وسیع ہے۔ اس پر مختلف حوالوں سے بات کی جا سکتی ہے۔ جیسے اولاً یہ کہ واقعۂ غدیر ایک تاریخی واقعیت وحقیقت ہے جس کے بارے میں حتیٰ فارسی میں بھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور عربی میں زیادہ لکھا گیا ہے یا جیسے کہ غدیر کے موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان: مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَوْلاہُ (جس کا میں مولا ہوں پس یہ علی بھی اسکے مولا ہیں) سے اس سے پہلے اور بعد کی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے (آنحضرت نے) یہ فرمایا تھا کہ: اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ؟ (کیا میں خود تم پر تم سے اولویت (اور زیادہ حق) نہیں رکھتا؟) کیا میں تم پر حق ولایت نہیں رکھتا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی اس آیتِ کریمہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (نبی تمام مومنین پر اُن سے بڑھ کر حق رکھتا ہے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۶) سب پکارے:۔ بلیٰ بلیٰ (ہاں ہاں ایسا ہی ہے)۔ پھر آپ نے فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَوْلاہُ اور اسکے بعد فرمایا کہ: اَللّٰھُمَّ والِ مَنْ والاہُ وَ عادِ مَنْ عاداہُ (یا اللہ اس سے محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے اور اسے دشمن رکھ جو اس سے دشمنی رکھے)

یہ بھی اپنے مقام پر ایک موضوع ہے کہ دراصل اس حدیث سے کیا مراد ہے اور یہ ولایت کہاں تک وسعت رکھتی ہے۔

وہ تمام نصوص جو اس حوالے سے قرآنِ مجید میں موجود ہیں یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں فرمائی ہیں، بطورِ کلی مولائے متقیان کا باصلاحیت ترین اور لائق ترین ہونا اور آپ کے دیگر فضائل، یہ وہ مسائل ہیں جن پر آج شب کی مناسبت سے بات کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی معروضات کو اس موضوع سے مخصوص کروں جو عملی حوالے سے ہمارے لئے زیادہ سود مند، مفید تر اور زیادہ سبق آموز ہے اور اسکے ساتھ ساتھ غدیر کے مباحث اور فصول میں سے بھی ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ: حضرت علی کی خلافت کے بارے میں فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوا؟

یہ سوال ہر کسی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں رسولِ اکرم کے اس قدر زور دینے اور اصرار کے باوجود اس موضوع پر عمل کیوں نہیں ہوا؟

واقعۂ غدیر اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے درمیان تقریباً ڈھائی ماہ کا فاصلہ تھا۔ آخر کس طرح مسلمانوں نے (اتنی جلدی) حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں رسولِ اکرم کی وصیت نظر انداز کر دی؟

پہلا نظریہ

اس کی توجیہ و تفسیر کئی طرح سے کی جا سکتی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ تمام مسلمانوں نے اپنے قومی اور عربی تعصب کی وجہ سے اسلام اور رسول اللہ سے یکسر منہ موڑ لیا تھا اور باغی ہو گئے تھے۔ جب انہیں اس مسئلے کا سامنا ہوا تو وہ ایک دم اسلام سے روگرداں ہو گئے۔ یہ ایک طرح کی توجیہ و تفسیر ہے۔ لیکن بعد کے واقعات اس بات کی نشاندہی نہیں کرتے کہ مسلمان اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکمل طور پر روگرداں ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں وہ اپنی گزشتہ جاہلیت کی حالت اور بت پرستی کی طرف لوٹ گئے تھے۔

دوسرا نظریہ

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ مسلمان اسلام سے روگرداں ہونا نہیں چاہتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ایک حکم کے بارے میں انہوں نے نافرمانی کا رویہ اختیار کیا۔ بعض وجوہات اور خاص پہلوؤں کے پیش نظر اس ایک حکم و برداشت کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ مثلاً کیونکہ حضرت علی نے (اسلام کی خاطر لڑی گئی جنگوں میں) ان کے باپوں کو قتل کیا تھا، اس لئے اُن کے اندر حضرت علی کے بارے میں کینہ موجود تھا، یا بعض اہلِ سنت کے بقول وہ اس وقت یہ نہیں چاہتے تھے کہ نبوت و خلافت ایک ہی خاندان میں ہو، یا پھر یہ کہ حضرت علی کا عدم تساہل، سخت گیری، دوٹوک رویہ اور غیر لچکدار ہونا بھی اپنے مقام پر ایک وجہ تھی۔ معاصر علمائے اہلِ سنت

میں سے بعض نے اسے بھی ایک سبب قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی مسلمانوں کے درمیان تختی' شدت اور غیر لچکدار ہونے کے حوالے سے معروف تھے' اُن کی اس صفت کی وجہ سے مسلمانوں کی نظریں علی کی طرف نہ اٹھیں (البتہ وہ یہ نہیں کہتے کہ مسلمانوں نے نص رسول کو نظر انداز کر دیا تھا)۔ مسلمان کہتے تھے کہ اگر علی برسرِ اقتدار آ گئے' تو کسی کا لحاظ نہیں کریں گے' کیونکہ علی کی سابقہ زندگی سے یہی واضح ہوتا تھا۔

حکمِ الٰہی کے نفاذ میں حضرت علی کے غیر لچکدار طرزِ عمل کی ایک مثال

حجۃ الوداع ہی کے موقع پر' واقعۂ غدیر سے چند روز قبل' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو یمن روانگی کا حکم دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یمن کے نومسلموں کو اسلام کی تعلیمات پہنچائی جائیں اور وہاں اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ یمن سے حضرت علی مکہ لوٹ کر آئے اور ادھر رسول اکرم بھی مدینہ سے مکہ تشریف لائے۔ مکہ میں وہ ایک دوسرے سے آ ملے۔ حضرت علی اپنی فوج کے ساتھ آ رہے تھے۔ فوج کے ہمراہ یمن کی کچھ نئی قبائیں تھیں۔ حضرت علی یہ قبائیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لا رہے تھے۔ البتہ وہ بعد ازاں تقسیم ہو جاتیں اور پہلے درجے میں انہی سپاہیوں کو ملتیں۔

واپسی پر حضرت علی مکہ سے ابھی چند منزل کے فاصلے پر تھے کہ خود آگے روانہ ہو کر رسول اکرم کی خدمت میں پہنچ گئے' تاکہ اپنے کام کی رپورٹ پیش کر سکیں۔ انہیں پھر واپس آ کر فوج کے ہمراہ پہنچنا تھا۔

اس دوران میں جبکہ حضرت علی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تھے فوجیوں نے خود سے یہ سوچ لیا کہ اب جب ہم مکہ میں داخل ہو رہے ہیں' ہمارے لباس گندے اور پرانے ہیں' کیوں نہ ہم یہ نئی قبائیں نکال کر پہن لیں اور نئے لباس کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں' آخر کار یہ ہم ہی کو تو ملنی ہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

جب حضرت علی لوٹ کر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ لوگ یہ کام کر چکے ہیں۔ آپ نے

فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ رسول اللہ کے پاس پہنچنے سے پہلے تم نے بیت المال میں تصرف کیوں کیا؟ وہ کہنے لگے: آخر کار رسول اللہ یہ ہمیں ہی تو دیتے۔ فرمایا: لیکن تمہیں حق نہیں پہنچتا' یہ خلاف قانون ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ سب اپنے یہ لباس اتار دیں اور دوبارہ اپنے اصل لباس پہن لیں۔

جب فوج مکہ پہنچی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے سوال کیا کہ علی تمہارے لئے کیسے امیر اور سپہ سالار رہے؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! علی کی ہر بات اچھی ہے' لیکن کچھ سخت گیر ہیں۔ پھر ان لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ علی نے ہمارے ساتھ یوں سلوک کیا ہے۔ رسول اکرم کے چہرے پر ناگواری ظاہر ہوئی اور آپ نے علی پر اعتراض کرنے پر ان لوگوں سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ فرمایا: علی کے بارے میں ایسی بات مت کرو انہٗ لَاَخْشَنُ (یالَاُخَیْشِنُ) فی ذات اللّٰہ' جس مقام پر حق کا مسئلہ در پیش ہو یا حکمِ خدا کا معاملہ ہو وہاں علی ایک ایسے وجود میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔ وہی شخص جو سرتاپا نرمی ہے' اپنی نرمی کو حکمِ الٰہی میں ہرگز دخل انداز نہیں ہونے دیتا۔

بہرحال یہ بھی ایک پہلو ہے' جسے بعض نے بیان کیا ہے۔ لیکن صرف اسکے ذریعے اتنے بڑے واقعے کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ تمام مسلمان ایک دم مرتد ہو گئے اور اسلام سے پھر گئے؟ اس ایک مسئلے میں تمام مسلمانوں نے نافرمانی کی' یہ بات بہت زیادہ بعید نہیں ہے' لیکن کیا سب مسلمانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پھر گئے' یا پھر کوئی اور معاملہ بھی ہے اور وہ یہ ہے:

صحیح نظریہ: مسلمان فریب کھا گئے

اس مسئلے میں مسلمان فریب کھا گئے۔ یعنی ایک گروہ نافرمان ہو گیا۔ اس زیرک و نافرمان گروہ نے عامتہ المسلمین کو اس مسئلے میں فریب دیا۔ میں نے شروع میں ایک آیت کی تلاوت کی ہے۔ اس آیت سے ہم اپنی گفتگو کا آغاز کر سکتے ہیں اور اسی آیت سے ہم نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ وہی آیت ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نصب کئے جانے کے بارے میں'

یعنی خلافت کے لئے آپ کے تقرر کے بعد نازل ہوئی۔ یہ آیت ہے: اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ (آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں)

یعنی آج سے کفار اس بات سے ناامید ہو گئے ہیں کہ وہ کفر کے راستے سے دائرۂ اسلام کے باہر سے اسلام پر حملہ کر سکیں گے۔ اب وہ مایوس ہو گئے ہیں کہ اس راہ سے کوئی نتیجہ حاصل کر سکیں گے۔ اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ اسلام کو باہر سے نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ فلا تخشوھم: اے مسلمانو! اب کفار سے خوف نہ کھانا اور پریشان نہ ہونا۔

یہاں تک دو جملے ہیں۔ پہلے جملے میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے جملے میں تسلی دی گئی ہے۔ پہلے جملے میں کہا گیا ہے کہ اب وہ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ ناامید ہو گئے ہیں۔ اب اسکے بعد وہ تگ و دو نہیں کریں گے۔ دوسرے جملے میں تسلی دی گئی ہے کہ اب تم ان کی طرف سے بےفکر رہو۔

قرآن کریم متعدد آیات میں (البتہ اُن آیات میں جو اس سے پہلے اور گزشتہ برسوں میں نازل ہوتی رہیں) مسلسل مسلمانوں کو کافروں کے خطرے سے خبردار کرتا رہا۔ الیہ مقام پر خلافت کے لئے حضرت علی کے تقرر کے واقعے کے بعد کہتا ہے کہ اب اسکے بعد کوئی خطرہ نہیں ہے ان کی طرف سے اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔

بعد کا جملہ بہت عجیب ہے۔ وَاخْشَوْنِ اپنے دین کے بارے میں اُن کی طرف سے فکرمند نہ ہونا البتہ مجھ سے ڈرنا۔ مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے فکرمند ہونا۔

خدا کی طرف سے فکرمند ہونے سے کیا مراد ہے؟ دشمن کی طرف سے فکرمند نہ ہوں البتہ دوست، دین کے مالک اور خدا کی طرف سے فکرمند رہیں، جبکہ اسکے برعکس خدا کی طرف سے تو پر امید ہونا چاہئے۔ پس پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے فکرمند ہو۔ نکتہ اور جانِ کلام اسی مقام پر ہے۔

ہمارے دوبارہ پھر اسی نکتے پر پلٹ کر آنے تک اس بات کو ذہن میں رکھئے گا۔

(پہلا جملہ) "اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ"

(دوسرا جملہ) "فَلَا تَخْشَوْهُم."

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا."

آج کے دن میں نے تمہارا دین سرحدِ کمال تک پہنچا دیا۔

وہ چیز جو اس دین کا کمال ہے' میں نے آج تمہیں وہ عطا کر دی ہے۔ وہ چیز جس کے ذریعے میں نے اپنی نعمت کو پورا کیا ہے' اسے آج میں نے پورا کر دیا ہے۔ آج میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو ایک دین کے طور پر پسند کر لیا ہے۔ یا وہ اسلام جو ہمارے پیش نظر کامل اور مکمل اسلام تھا' وہ یہ ہے جو آج ہم نے تمہیں عنایت کیا ہے۔

اس آیت کے بارے میں ایک مختصر وضاحت عرض کر دوں۔ یہاں پر ہمارے سامنے دو تعبیریں ہیں۔ ایک یہ کہ: اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اور دوسری: اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔ تمہارے دین کو میں نے حدِ کمال تک پہنچا دیا ہے اور اپنی نعمت کا (جو یہی دین کی نعمت ہے) اتمام کر دیا ہے۔

اتمام اور اکمال کے درمیان فرق

اتمام اور اکمال کے درمیان فرق ہے۔ پس میں نے دین کا ''اکمال'' بھی کر دیا ہے اور ''اتمام'' بھی۔ ''اتمام'' اس مقام پر کہا جاتا ہے جب کوئی بنائی جانے والی چیز ابھی ناقص ہو' یعنی اس کے بعض اجزا ابھی نامکمل ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک عمارت تعمیر کریں' تو جن کاموں کے بعد عمارت قابلِ استعمال ہوتی ہے وہ تمام کام ختم ہونے سے پہلے' مثلاً ابھی اسکی چھت باقی ہو' یا ابھی اسکے دروازے نہ لگائے گئے ہوں' تو ایسی عمارت کو ''نامکمل'' کہتے ہیں۔ لیکن ''اکمال'' ایک دوسری چیز ہے۔ ممکن ہے ایک چیز کا پیکر اور جسم تیار اور مکمل ہو لیکن اس لحاظ سے کہ وہ روح نہیں رکھتی اور جس حقیقت اور آثار کے مرتب ہونے کی اس سے توقع ہے وہ مرتب نہ ہوئے ہوں' تو کہتے ہیں کہ (یہ چیز) کامل نہیں۔ مثلاً اگر کہتے ہیں کہ علم کا کمال اس پر عمل ہے تو اسکے یہ معنی نہیں

ہیں کہ جب تک عمل نہ ہو علم کا کوئی حصہ ناقص ہے، نہیں علم علم ہے، علم علم ہی کے ذریعے مکمل ہوتا ہے لیکن علم عمل کے ذریعے کامل ہوتا ہے۔ یعنی علم کے جو آثار حاصل کیے جانے چاہئیں وہ عمل سے ہی حاصل ہوں گے۔

"اِنَّ کَمالَ الْعِلْمِ بِالْعَمَلِ وَ کَمالَ الْعَمَلِ بِالنِّيَّةِ وَ کَمالَ النِّيَّةِ بِالْاِخْلاص."

"کمالِ علم عمل سے ہے، کمالِ عمل نیت سے ہے اور کمالِ نیت اخلاص سے ہے۔"

نیت عمل کا جز نہیں لیکن اگر عمل کے ہمراہ کوئی نیت نہ ہو تو ایسا عمل بے اثر ہوگا۔ اخلاص بھی نیت کا جز نہیں لیکن اگر اخلاص نہ ہو تو نیت بے اثر ہوگی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ' یہ حکم (یعنی حضرت علی علیہ السلام کا امامت کے لئے نصب کیا جانا) کیونکہ دین کے اجزا میں سے ایک جز ہے اور دین کے احکام میں سے ایک حکم ہے، پس (اب تک) نعمت ناتمام تھی' اب تمام ہوگئی۔ پھر اس اعتبار سے کہ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو دیگر احکام نامکمل ہوتے' ان تمام (احکام) کا کمال اس سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ روحِ دین ولایت وامامت ہے۔ اگر انسان کے پاس ولایت وامامت نہ ہو' تو اسکے اعمال کی حیثیت ایک بے روح جسم کی سی ہوگی۔

اب ہم اُس جملے کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ حصے میں تھا اور جس کے بارے میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسکی وضاحت کریں گے۔

فرمایا: اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ۔ آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں۔ اُن کی طرف سے فکرمند نہ ہونا اور اُن سے نہ ڈرنا' میری طرف سے فکرمند ہونا اور مجھ سے ڈرنا۔

مفسرین اور خاص طور پر صاحب تفسیر المیزان نے اس جملے کے بہت عمدہ معنی بیان کئے ہیں اور وضاحت کی ہے کہ اس بات کے کیا معنی ہیں کہ: "ان سے اپنے دین کے بارے میں نہ ڈرنا' مجھ سے اپنے دین کے بارے میں ڈرنا"۔ ہمیں ایک مقدمہ بیان کرنا ہوگا تاکہ بات واضح

ہوجائے اور ساتھ ساتھ وہ تاریخی سوال بھی حل ہوجائے۔ وہ مقدمہ یہ ہے:

مشیتِ الٰہی کی کیفیت

اولاً قرآن کریم کا ایک کلی اصول ہے' اور وہ یہ کہ وہ کہتا ہے کہ ہر چیز مشیتِ الٰہی سے ہے۔ دنیا میں کوئی چیز مشیتِ الٰہی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتی: وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (سورۂ انعام ۶۔ آیت ۵۹) یا ایک اور آیت میں ہے کہ: اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۲) یا: تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۲۶)

ہر چیز مشیتِ الٰہی سے ہوتی ہے' اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا مشیتِ الٰہی کوئی حقیت ہے' یا پھر ویسے ہی بغیر کسی حساب کتاب کے' قرعہ اندازی کی طرح ایک چیز یہاں سے اور ایک چیز وہاں سے چن لینا ہے؟

دوسری آیات اسکی وضاحت کرتی ہیں کہ مشیتِ الٰہی کائنات میں ایک سنت' قانون اور حساب رکھتی ہے۔

یہ کیسے ہوتا ہے؟

قرآن کی دو آیات میں' ان آیات میں پائے جانے والے ایک باریک سے فرق کے ساتھ' اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ." (۱)

اللہ کسی قوم کو جو نعمت عطا فرماتا ہے' وہ اس وقت تک اس سے واپس نہیں لیتا جب تک وہ قوم خود اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر لیتی۔ یعنی جب وہ اس نعمت کے لئے اپنی قابلیت اور صلاحیت کو گنوا دیتی ہے' تب اللہ اس سے اپنی نعمت سلب کر لیتا ہے۔

۱۔ خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو تبدیل نہ کرلے۔ (سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱)

یعنی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہر کام مشیت الٰہی سے ہوتا ہے' تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی چیز کے لئے کوئی شرط نہیں ہوتی۔ ہر چیز ہماری مشیت سے ہے۔ ہم نے دنیا کے لئے ایک قانون اور قاعدہ رکھا ہے۔ سبب اور مسبب قرار دیا ہے' شرط اور مشروط مقرر کئے ہیں۔ نعمتیں' جن میں "وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" بھی شامل ہے۔ (بغیر کسی قاعدے قانون کے نہیں ہیں) اے مسلمانو! میں نے تمہارے لئے اپنی نعمت تمام کردی ہے اور تمہیں اپنی نعمت عطا کردی ہے۔ یہ نعمت تمہارے پاس پائیدار اور مستحکم ہے یا نہیں؟ نقصان پذیر ہے یا نہیں؟ قرآن جواب دیتا ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ ' خارجی اور بیرونی طرف سے' اُس دشمن کی طرف سے جو دشمن کی صورت میں ہے اور کافر ہے' اب اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' اُن کی طرف سے کوئی خوف اور فکر مندی نہیں ہے۔

پھر فکر مندی کس کی طرف سے ہے؟

میری طرف سے۔

میری طرف سے کیا مراد ہے؟

میری مشیت کی طرف سے۔

میری مشیت کی طرف سے کیسے؟

میں نے تم سے کہا ہے کہ میں کوئی نعمت اُس وقت تک لوگوں سے سلب نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود نہ بدل جائیں اور اپنے آپ کو متغیر نہ کرلیں۔ پس اے مسلمانو! اب اس کے بعد تمہیں جو بھی نظر بد لگے گی خود تمہارے اندر سے لگے گی اور جو ضرر بھی اسلامی معاشرے کو پہنچے گا وہ اسلامی معاشرے کے اندر سے پہنچے گا' باہر سے نہیں۔ باہر والے اندر کی مدد سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ دنیائے اسلام نے جو نقصان بھی اٹھایا ہے' یا ہمارے زمانے تک اٹھا رہی ہے' وہ خود اسکے اندر سے ہے۔ یہ نہ کہیے گا کہ باہر بھی دشمن موجود ہے۔ میں بھی مانتا ہوں کہ باہر دشمن ہے' لیکن باہر کا دشمن باہر سے کچھ نہیں کرسکتا۔ باہر کا دشمن بھی اندر سے کام کرتا ہے۔ یہ ہے "وَاخْشَوْنِ" "مجھ سے ڈرو" کا مطلب۔ مجھ سے ڈرو کہ کہیں تمہارا اخلاق' روح'

روحانی خصوصیات، ملکات اور اعمال بدل نہ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا، تو میں اپنی اُس سنت کی بنا پر کہ جو لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت گنوا دیتے ہیں میں اُن سے نعمت سلب کر لیتا ہوں، تم سے بھی یہ نعمت واپس لے لوں گا۔

پیغمبر اسلام کی دو حدیثیں

اب میں یہاں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو حدیثیں پڑھتا ہوں جو "وَاخشَونِ" کے مفہوم کی زیادہ وضاحت کرتی ہیں۔ اگر آپ پوچھیں کہ اسلامی معاشرہ کس طرح اندر سے نقصان اٹھاتا ہے، تو میں ان دو احادیث کی مدد سے آپ کے سامنے اس نکتے کی کچھ وضاحت کروں گا۔ ایک حدیث یہ ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انّی لا اخاف علی اُمّتیَ الْفَقْرَ ولکنْ اخاف علیهِمْ سوءَ التَّدْبیرِ۔"

کیسا شاندار اور عظیم الشان جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ: مجھے اپنی امت کے بارے میں اقتصادی فقر اور غربت کا ڈر نہیں ہے۔ فقر میری امت کو تباہ نہیں کرے گا۔ میں اپنی امت کے بارے میں ایک اور چیز سے خوفزدہ ہوں، اور وہ ہے کج فکری، بدفکری، بداندیشی اور جہالت و نادانی۔ اگر مسلمان بصیرت، دوراندیشی، مستقبل بینی، گہری نظر اور گہری فکر سے محروم ہو کر ظاہر بین اور سطحی ہو گئے، تو یہ وہ وقت ہو گا جب اسلام کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

خوارج کون تھے؟ خوارج ظاہر بین لوگ تھے، جو گہرائی میں نہیں دیکھتے تھے۔ دوراندیش نہیں تھے۔ انتہائی کوتاہ نظر تھے لیکن تھے اطاعت گزار، دیندار، راسخ العقیدہ اور عابد و زاہد۔ حضرت علی علیہ السلام انہیں ریاکار نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے اُن پر بہت زیادہ تنقید کی ہے لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ اپنی عبادت میں ریاکار تھے۔ فرماتے تھے کہ وہ کج فہم اور کج فکر ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری حدیث، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اُس فرمان میں نقل کی ہے جو آپ نے محمد ابن ابوبکر کے نام لکھا تھا اور جو نہج البلاغہ میں موجود ہے۔

محمد ابن ابوبکر، حضرت ابوبکر کے بیٹے ہیں۔ ان کی والدہ اسماء بنت عمیس ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر سے پہلے جعفر ابن ابی طالب کی زوجہ تھیں۔ ان سے ان کے بیٹے عبداللہ بن جعفر تھے۔ بعد ازاں حضرت ابوبکر نے ان سے شادی کر لی اور ان سے محمد ابن ابوبکر دنیا میں آئے۔ وہ بہت پاکیزہ ہستی تھے۔ حضرت ابوبکر کے بعد اسماء سے امیر المومنین (حضرت علی علیہ السلام) نے شادی کر لی۔ محمد امیر المومنین کے ربیب یعنی امیر المومنین کی زوجہ کے بیٹے ہو گئے۔ کیونکہ وہ بہت چھوٹے تھے اور حضرت ابوبکر کی وفات کے وقت شاید دو سال کے تھے، لہٰذا حضرت علی کے گھر میں پلے بڑھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت علی فرمایا کرتے تھے کہ: مُحَمَّدٌ اِبْنِی مِنْ صُلْبِ اَبِی بَکْر (محمد میرا بیٹا ہے اگرچہ ابوبکر کے صلب سے ہے) بہر حال وہ بہت صالح، متقی اور پاکیزہ شخص تھے اور حضرت علی کے ساتھ رہتے ہوئے شہید ہوئے۔ حضرت علی نے انہیں مالک اشتر سے پہلے مصر کی حکومت کے لئے مقرر کیا تھا اور وہ وہیں شہید ہوئے۔ جو فرمان آپ نے ان کے نام جاری کیا اس کے آخر میں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ:

"اِنِّی لَا اَخَافُ عَلیٰ اُمَّتِی مُؤْمِناً وَلَا مُشْرِکاً."

''میں اپنی امت کے بارے میں نہ مومن سے ڈرتا ہوں اور نہ مشرک سے۔''

"اَمَّا الْمُؤْمِنُ فَیَمْنَعُهُ اللّٰهُ بِاِیْمَانِهٖ"

''کیونکہ مومن کو اللہ اسکے ایمان کی وجہ سے (گمراہ ہونے سے) بچائے رکھے گا۔''

(یہ نہ کہئے گا کہ پس خوارج بھی تو مومن تھے۔ جو ایمان بصیرت کے بغیر ہو، اسلام اسے حقیقی ایمان نہیں سمجھتا۔ وہ عبادت گزار تھے لیکن اسلام جیسا مومن چاہتا ہے کہ "اَلْمُؤْمِنُ کَیِّسٌ فَطِنٌ" ویسے نہ تھے)۔

مومن کو خدا اسکے ایمان کے سبب محفوظ رکھتا ہے، بچا لیتا ہے۔ یعنی اس کا ایمان اسے محفوظ رکھنے اور بچانے والا ہے۔ پس مومن کی طرف سے کوئی مشکل نہیں ہے۔

"وَاَمَّا الْمُشْرِکُ فَیَقْمَعُهُ اللّٰهُ بِشِرْکِهٖ."

رہا مشرک وکافر وہ جس کے ظاہر و باطن سے کفر چھلکتا ہے۔ اللہ اسکے شرک کی وجہ سے اس

کا قلع قمع کر دیتا ہے۔

آیت "اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُم" کا یہی مفہوم ہے۔

"وَ لٰکِنّی اَخَافُ عَلَیْکُمْ کُلَّ مُنَافِقِ الْجَنَانِ عَالِمِ اللِّسَانِ یَقُولُ مَا تَعْرِفُونَ وَ یَفْعَلُ مَا تُنْکِرُونَ."

مگر مجھے جن کی طرف سے خوف اور فکر مندی ہے' وہ منافق اور دو رُخے لوگ ہیں۔ جن کی زبان اور ظاہر کا رُخ ایک طرف ہے اور قلب و باطن کا رُخ دوسری طرف۔ دینداری کا اظہار کرنے والے بے دین افراد۔ عَالِمِ اللِّسَانِ' جن کی زبان عالم ہے' جو اپنی زبان سے مومن و مسلمان ہیں۔ کیونکہ عالم ہیں' اس لئے اُن کی زبان خوب چلتی ہے۔ لیکن اُن کا دل نفاق سے بھرا ہوا ہے۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں: یَقُولُ مَا تَعْرِفُونَ وَ یَفْعَلُ مَا تُنْکِرُونَ۔ بات ایسی کرتے ہیں جس سے آپ مانوس و آشنا ہوں اور جسے آپ جانتے ہوں۔ بات تو اچھی کرتے ہیں' عمدہ اور بلند۔ جب بات کرتے ہیں تو آپ ان کے فلسفے کے شیفتہ ہو جاتے ہیں' واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ (کہتے ہیں) واقعاً مسلمانوں میں ایسے فرد پر افتخار کرنا چاہیے۔ لیکن اگر اس آدمی کے عمل کو گہری نظر سے دیکھیں گے' تو اُسے اس چیز کے برخلاف پائیں گے جسے آپ پہچانتے ہیں۔ یعنی بالکل الٹ اور سب "منکر" اس کا قول تو "معروف" ہوتا ہے' لیکن عمل "منکر"۔

اس بنیاد پر جب ہم دیکھتے ہیں' تو نظر آتا ہے کہ رسولِ اکرم دو گروہوں کی طرف سے فکر مند اور خائف ہیں۔ ایک عالم و زیرک لیکن منافق افراد کا گروہ' جو ظاہراً مسلمان ہیں اور باطناً کافر اور دوسرا عبادت گزار لیکن بے بصیرت و جاہل مسلمانوں کا گروہ۔

ایک دوسری حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے۔ آپ نے فرمایا:

"قَصَمَ ظَهْرِی رَجُلَانِ: عَالِمٌ مُتَهَتِّکٌ وَ جَاهِلٌ مُتَنَسِّکٌ."

یہ حدیث بھی انہی دو احادیث کا مفہوم بیان کر رہی ہے۔ فرماتے ہیں: دو طرح کے

آدمیوں نے میری کمر توڑ ڈالی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمر توڑ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟

ایک شخص گناہگار ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اسکے گناہ کا بُرا اثر صرف اُسی تک محدود رہتا ہے' اُس کا شر اسی تک محدود ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کا انحراف پیغمبر کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کے حوالے سے رسولِ اکرم نے فرمایا ہے کہ دو طرح کے افراد نے میری کمر توڑ ڈالی ہے۔ یعنی یہ دو گروہ اسلام کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ یہ لوگ نہ فقط خود عاصی' گنہگار' بد بخت' شقی اور جہنمی ہیں بلکہ اسلام کے لئے بھی سدِ راہ ہیں' دوسرے مسلمانوں کی گمراہی کا بھی سبب ہیں۔ (یہ لوگ کون ہیں؟) ایک راز فاش کرنے والا عالم اور دوسرا پرہیز گار اور عبادت گزار جاہل۔ یہ بھی وہی مضمون ہے۔

اسلامی معاشرے کو داخلی خطرہ درپیش ہے

اب ان باتوں سے ہماری سمجھ میں کیا آتا ہے؟

ان سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے درجے پر قرآن اور اسکے بعد رسولِ اکرم کی احادیث' مسلسل ہم سے کہتی ہیں کہ اسلامی معاشرے کو اپنے اندر سے خطرہ درپیش ہے۔ ایک منافق زیرک اقلیت اور ایک جاہل سادہ لوح لیکن دیندار اکثریت۔ اگر یہ جاہل نہ ہوں تو وہ زیرک کچھ نہیں کرسکتے اور اگر وہ زیرک نہ ہوں تو کوئی ان جاہلوں کو ٹیڑھے راستے پر نہیں لے جائے گا۔

یہاں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح اسلامی معاشرے کو ایک منافق' نافرمان اقلیت اور ایک سادہ دل لیکن مومن و باایمان اکثریت کے ہاتھوں یہ دن دیکھنا پڑا۔ یعنی یہ لوگ اس بات کا سبب بنے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس قدر تاکیدیں اور اصرار عملاً بے نتیجہ رہے۔ یعنی اُس منافق گروہ نے لوگوں کو راستے سے بھٹکا دیا' جبکہ لوگ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اور یوں وہ فریب کھا گئے۔

امیر المومنین کی مشکلات

یہیں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی مشکلات کتنی زیادہ تھیں۔ آپ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنزیل پر جنگ کرتے رہے اور میں تاویل پر۔ واقعاً رسول اللہ کا کام علی کے کام کی نسبت آسان تھا۔

رسول اللہ کے مدِمقابل کون لوگ تھے؟

کفار؛ وہ لوگ جو کافر تھے اور جنہوں نے اپنے کفر کو کسی پردے میں نہیں چھپا رکھا تھا۔ ابو سفیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدِمقابل تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کفر یعنی کھلا کفر، وہ کفر جس کے چہرے پر نقاب نہ ہو، اسلام کے مدِمقابل آیا' اُس نے اسلام سے شکست کھائی۔ اسلام کو کبھی مطلق اور صریح کفر سے خطرہ نہیں ہوگا لیکن جب کفر اسلام کا لباس پہن لیتا ہے' تب خطرناک ہو جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوسفیان کے مدِمقابل ہیں' ابوسفیان کے خلاف ہیں۔ ابوسفیان ایک ایسا شخص ہے جو کفرِ صریح ہے۔ جو کہتا ہے کہ میں ہبل بت کو پوجتا ہوں اور وہ ہبل بت کو پوجتا بھی تھا' عزیٰ بت کو پوجتا تھا اور کہتا بھی تھا کہ میں عزیٰ بت کا پجاری ہوں۔ وہ نعرہ لگاتا تھا "اُعْلُ هُبَل' اُعْلُ هُبَل" (زندہ باد ہبل' زندہ باد ہبل) لیکن کہاں یہ نعرہ اور کہاں نعرۂ "لا الٰہ الّا اللّٰہ"۔ یہی وجہ تھی کہ ابوسفیان جیسے لوگ دن بدن کمزور ہو رہے تھے۔ اور (آخر کار) ختم ہو گئے۔ لیکن علی کے مدِمقابل معاویہ تھے۔ معاویہ کی ماہیت ابوسفیان کی ہی ماہیت ہے' فرق یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کا لباس پہن رکھا ہے۔ جو لوگ معاویہ کے سامنے آتے ہیں محسوس نہیں کرتے کہ وہ اب بھی ہبل بت کے خلاف ہی جنگ آزما ہیں۔ کیونکہ اب معاویہ کا نعرہ اُعْلُ هُبَل' اُعْلُ هُبَل نہیں ہے۔ اُن کا نعرہ قرآن کی یہ آیت ہے: وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۳)

وہ ہستی جس کا امیر المومنین کے بقول (اور جسے آج تاریخ نے بھی سو فیصد درست ثابت

کر دیا ہے) حضرت عثمان کے قتل میں سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ حضرت عثمان کے قتل کے اسباب خود معاویہ اور امویوں نے فراہم کیے تھے۔ تاکہ اس قتل سے فائدہ اٹھا سکیں۔ (حضرت عثمان خود بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے) ان لوگوں نے سوچا کہ ابھی تک وہ زندہ عثمان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اب موقع آ گیا ہے کہ حضرت عثمان کی لاش سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے خود حضرت عثمان کے قتل کے اسباب فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یعنی وہ کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کی ناراضگی کے اسباب فراہم کریں تاکہ لوگ مل کر حضرت عثمان کو قتل کر دیں۔ حضرت عثمان نے معاویہ سے مدد طلب کی۔ معاویہ نے لشکر بھیجا لیکن اسے حکم دیا کہ مدینہ کے پاس فلاں جگہ پر ٹھہر جانا اور مدینہ میں داخل نہ ہونا۔ اگر تم خود اپنی آنکھوں سے بھی حضرت عثمان کو قتل ہوتے دیکھو تب بھی جب تک میں حکم نہ دوں کوئی قدم نہ اٹھانا۔ انہوں نے خاص طور پہ یہ کہا کہ: کہیں اپنے جذبات کے زیر اثر نہ آ جانا' دیکھنا کہ میرا حکم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کارندوں کو حضرت عثمان کے گھر کے اندر بھیجا اور حکم دیا کہ جونہی عثمان قتل ہوں' ان کی قمیض اور ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے' اٹھا کر لے آنا۔ تعجب ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ حضرت عثمان کی قمیض کا شام میں معاویہ کے ہاتھ میں کیا کام؟ یہ ایک حادثاتی اور اتفاقیہ معاملہ نہ تھا۔ ایک پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔

حضرت عثمان کی ایک بیوی تھیں جن کا نام نائلہ تھا۔ اس خاتون نے حضرت عثمان کو اچھی نصیحتیں کی تھیں۔ انہوں نے ان سے کہا تھا کہ آپ علی کی بات سنیں' انہیں اپنا دشمن نہ سمجھیں' علی جو کچھ کہتے ہیں حقیقت ہی کہتے ہیں' وہ آپ کی اور مسلمانوں کی بھلائی کی بات کرتے ہیں' مروان کی بات نہ سنیں۔ لیکن وہ مروان کی بات سنا کرتے تھے۔ جب لوگوں نے حملہ کیا اور حضرت عثمان کو قتل کرنا چاہا تو اس خاتون نے اپنے آپ کو حضرت عثمان کے اوپر گرا دیا' تاکہ انہیں بچا سکیں۔ ایک تلوار جو چلی تو اس نے اس خاتون کی ایک انگلی بھی کاٹ ڈالی۔ اس انگلی کو بھی وہ معاویہ کے پاس لے گئے۔ بعد ازاں معاویہ نے اس قمیض کو اپنے منبر کے ساتھ آویزاں کر دیا۔ اس کٹی ہوئی انگلی کو بھی انہوں نے لٹکا دیا اور پھر ہائے ہائے کر کے رونا شروع کر دیا کہ مظلوم خلیفہ قتل ہو گئے۔ ایھا الناس! انتقام' انتقام' وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا.

اب جہالت بھی مدد کرتی ہے۔ کسی ایک نے بھی یہ نہ پوچھا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ جب کوئی مظلوم مارا جائے' تو ہم اسکے وارث کو اختیار دیتے ہیں کہ آئے اور اسکے خون کا مطالبہ کرے' تم کون ہوتے ہو؟ تم تو خونِ عثمان کے ولی نہیں ہو!! لیکن وہاں تو جہالت ونادانی تھی۔ لوگ معاویہ کے منبر کے پاس جمع ہو گئے اور اپنے بقول انہوں نے عثمان مظلوم پر گریہ کیا' لوگوں نے بہت سے آنسو بہائے۔

حضرت علی کے اکابر اصحاب کا تردد

اب علی کی جنگ کس سے ہوگی؟ ایسے شخص سے جس نے اسلام کا لباس پہن رکھا ہے اور جامۂ اسلام زیب تن کیا ہوا ہے۔ ایسے شخص سے جو مسلسل اسلام کا دم بھرتا ہے۔ ایک ایسے شخص سے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں "مُنافِقِ الْجَنانِ عالِمِ اللِّسانِ یَقولُ ماتَعْرِفونَ وَیَفْعَلُ ماتُنْکِرونَ" ہے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس نے حضرت علی کے کام کو مشکل بنا دیا ہے۔ امیر المومنین کے اکابر اصحاب کو ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے میں شک وتردد تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ایسے لوگوں سے کیسے جنگ کریں جو اہلِ قبلہ ہیں' ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں' ہماری طرح روزہ رکھتے ہیں' ہماری طرح قرآن پڑھتے ہیں' ہماری طرح زکات دیتے ہیں' ہماری طرح فریضۂ حج انجام دیتے ہیں۔

ربیع بن خثیم' یہی خواجہ ربیع جن کا مقبرہ مشہد میں ہے اور جس کی لوگ زیارت کو جاتے ہیں' یہ زاہدوں' عابدوں اور امیر المومنین کے شیعوں میں سے تھے۔ البتہ ایک کم بصیرت شیعہ۔ یہ بڑے عبادت گزار تھے لیکن کم بصیرت تھے۔ یہ چند افراد کے ہمراہ امیر المومنین کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: یا اَمیرَ الْمُؤمِنینَ اِنّا شَکَکْنا فی هذَا الْقِتالِ ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان سے جنگ کرنے میں شک ہے۔ دوسری طرف ہم آپ سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے۔ آپ ان سے جنگ کرنے کے سوا ہمارے ذمے کوئی اور کام کر دیں۔ امیر المومنین نے انہیں ایک سرحد پر ذمے داری سونپ دی۔ کہنے لگے: ہاں یہ بہت اچھا ہے' وہاں ہم کافروں سے جنگ کریں گے۔ اب ہم

مطمئن ہیں۔ لیکن یہاں مسلمانوں سے جنگ کرنے میں ہمیں شک ہے اور ہمارے دل میں وسوسہ ہے۔ ربیع بن خثیم جیسا آدمی ایسی بات کہتا ہے۔

دیگر افراد بھی تھے' مثلاً ہاشم بن عتبہ بن مرقال جیسا شخص حضرت علی علیہ السلام کی رکاب میں تھا لیکن اُس کے ہاتھ لرزتے تھے۔

البتہ انہی کے درمیان ایسے لوگ بھی تھے جن کی بصیرت کامل تھی۔ ان میں سب سے نمایاں عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ عمار جنگ کرتے جاتے اور کہتے جاتے کہ کل ہم نے تنزیلِ قرآن پر جنگ کی اور آج ہم تاویلِ قرآن پر جنگ کر رہے ہیں۔ جب معاویہ کا پرچم قرآن کے ظاہری نعروں کے ساتھ بلند ہوا تو عمار نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ ان پرچموں اور اُن پرچموں میں کوئی فرق نہیں جن کے خلاف ہم بدر و احد میں جنگ کرتے رہے ہیں۔ عمار سپاہِ امیرالمومنین میں ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ عمار شہید ہوئے تو ایک بڑی تعداد کو یقین آ گیا۔ کیونکہ عمار ایک ایسے آدمی تھے جن کے بارے میں سب ہی ایک روایت جانتے تھے اور یہ روایت سب اصحابِ رسول' تابعین اور اہلِ کوفہ و شام میں متواتر تھی۔

جس دن مسجدِ نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی اور رسولِ اکرم نئے نئے مدینہ میں آئے تھے اور عمار بھی حال ہی میں مکہ سے وہاں پہنچے تھے۔ عمار کے اندر جو شوق' ولولہ اور ایمان تھا' اسکی وجہ سے وہ مسجد کی دیواریں بلند کرنے کے لئے دوسروں سے دوگنا زیادہ پتھر اٹھاتے تھے' پسینہ بہہ رہا تھا' خستہ حال تھے اور اس حال میں نعرے بلند کرتے' شعر پڑھتے اور (پتھر اٹھائے) آ رہے تھے۔

رسولِ اکرم نے اُن کی طرف نگاہ اٹھائی' مسکرائے اور فرمایا:

"وَيهكَ يا عَمَّارُ تَقتُلُكَ الفِئَةُ البَاغِيَةُ."

"تم خوش قسمت ہوا ے عمار! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔"

یہ قرآنِ مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ:

"وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ."

''اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں جھگڑا کریں تو تم سب ان کے درمیان صلح کراؤ' اسکے بعد اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو سب مل کر اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرنے والا گروہ ہے' یہاں تک کہ وہ بھی حکمِ خدا کی طرف واپس آجائے۔'' (سورۂ حجرات ۴۹۔آیت ۹)

مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستقبل کے بارے میں خبر دے رہے تھے کہ آئندہ زمانے میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین جنگ ہوگی۔ان میں ... یک گروہ سرکش و باغی ہوگا۔لہٰذا اس سرکش گروہ کے خلاف اس دوسرے گروہ کی حمایت کی جائے۔جب عمار قتل ہوئے' تو جن لوگوں کو شک تھا وہ کہنے لگے کہ آج ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ علی حق پر ہیں اور معاویہ باطل پر۔ہاشم بن عتبہ بن مرقال ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں عمار کی شہادت کے بعد دیکھا گیا کہ وہ اب شدت کے ساتھ حملے کر رہے ہیں یہاں تک کہ وہ قتل ہوگئے۔

پس دیکھئے کہ حضرت علی کا کام کس قدر مشکل تھا۔علی کے مدِ مقابل جو لوگ تھے ان میں سے اکثریت جاہل و نادان لوگوں کی تھی اور ایک اقلیت منافقوں اور دوروُخے لوگوں کی تھی۔

نتیجہ

اب ہم اپنی معروضات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔وہ آیت جو واقعے اور حدیثِ غدیر کے حوالے سے نازل ہوئی' اسکے مذکورہ جملے اور رسولِ اکرم کی فرمائی گئی احادیث سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ اس زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔جب بھی مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا ہے یا پہنچتا ہے وہ اسی طرح پہنچتا ہے۔آپ اس وقت دیکھیں کہ مسلمانوں کو فلسطین میں جو نقصان پہنچ رہا ہے' اس میں جس قدر مسلمانوں کا ہاتھ ہے وہ زیادہ ہے یا اسرائیل کا جو بیرونی دشمن ہے۔اس وقت بے وطن چھاپہ ماروں کو اردنی سپاہیوں سے زیادہ خطرہ ہے یا اسرائیلی سپاہیوں سے؟ ہمیشہ یونہی رہا ہے اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے خوشی اور مسرت کا باعث ہے' وہ یہ ہے کہ

ہمارے جوان طبقے میں، ہمارے روشن فکر اور روشن ذہن طبقے میں اور ہمارے طلبا کے طبقے میں ایک دینی تحریک پیدا ہوگئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ لوگ بصیرت اور دین کو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا رکھیں گے اور اسے معاشرے کو سونپیں گے۔ تا کہ ہم پھر اپنی اصلی عزت و شوکت کی طرف لوٹ جائیں۔ ہم مسلمان ہوں، کامل مسلمان، بابصیرت مسلمان۔ شیعہ ہوں لیکن حقیقی شیعہ، علی کو پہچاننے والے شیعہ، ایسے شیعہ جو علی کی معرفت بھی رکھتے ہوں اور علی کے پیروکار بھی ہوں۔

عید کی رات ہے، جشن و مسرت کی رات ہے، ذکرِ مصائب کی شب نہیں۔ دعا کے چند جملے عرض ہیں:

نسئلک اللّھم وندعوک باسمک العظیم الاعظم الاجل الاکرم یا اللّٰہ....

یااللہ! ہم تجھے حقیقت قرآن، باطنِ ولایت اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے وجودِ مقدس کے حق کا واسطہ دیتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کر دے۔

یااللہ! ہمیں آگاہ اور دین مقدس اسلام پر عمل کرنے والے مسلمان بنا دے۔

یااللہ! ہمیں مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کا حقیقی شیعہ بنا دے، اُن کے نورِ ولایت کو ہم سب کے دل میں روشن فرما۔ ہم سب کو دنیا و آخرت کی خیر عنایت فرما۔

یااللہ! ہمارے جوانوں کو بصیرت، اسلامی حقائق کی معرفت اور اسلامی احکام پر عمل کی توفیق عطا فرما۔ انہیں اپنی تائید و نصرت سے نواز۔ ہمارے علما کی حفاظت و حمایت فرما۔

خدایا! ہم سب کے گزشتگان کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

رحم اللّٰہ من قرأ الفاتحۃ مع الصلوات

اسلام کی آزادی بخش تحریک ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"الحمد للّٰه ربّ العالمين بارى الخلائق اجمعين و الصلوة و السلام على عبداللّٰه ورسوله وحبيبه وصفيّه سيّدناونبيّناومولانا ابى القاسم محمد(صلى اللّٰه عليه وآله وسلم)و على اله الطيبين الطاهرين المعصومين."

اعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم

" وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ."(۱)

علمائے ادب کے یہاں علمِ بدیع (جو فنونِ ادبیہ میں سے ایک ہے) میں ایک اصطلاح ہے۔وہ حسنِ ابتدا کوفصاحت و بلاغت اور حسنِ کلام کی زینتوں میں سے ایک زینت قرار دیتے ہیں۔اسکے متقابل "حسنِ اختتام" ہے۔خاص طور پر قصیدے میں، جو عام طور پر اوّل تا آخر ایک موضوع کے بارے میں ہوتا ہے۔قصیدہ کہنے والے کا ایک ہنر یہ ہے کہ وہ کس بات سے اپنے سخن

☆ یہ تقریر ۱۹۶۹ء میں حسینیہ ارشاد میں کی گئی۔

۱۔اوران پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے۔(سورۂ اعراف ۷۔آیت ۱۵۷)

کا آغاز کرتا ہے' اس کا پہلا بیت اور اولین شعر جو سامع کے کانوں میں جائے گا' وہ کیا ہوتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں انہوں نے کچھ نکات کا ذکر کیا ہے۔ بعض قصائد کو انہوں نے اُن کے حسنِ ابتدا کی وجہ سے سراہا ہے۔ مثلاً امراؤالقیس کا معروف قصیدہ ہے:

قِفَـا نَبْكِ مِنْ ذِكْرىٰ حبيبٍ وَمَنْزِلِ

بِسِقْطِ اللِّوىٰ بَيْنَ الدَّخولِ فَحَوْمِلِ

(اس شعر کے بارے میں) اُن کا کہنا ہے کہ:

وَقَفَ واسْتَوْقَفَ وبَكىٰ وَ اسْتَبْكىٰ

انہوں نے بعض قصائد کی' اُن کی تمام تر بلندی اور عظمت کے ساتھ ساتھ حسنِ ابتدا کے حوالے سے۔ یعنی آغاز وابتدا اور اچھے انداز سے شروع ہونے کے اعتبار سے تعریف کی ہے۔ ہم اب اس سلسلے کی مزید مثالوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔

مذاہب' مسالک اور عقائد کی طرف دعوت میں بھی یہی قاعدہ کارفرما ہے' کہ وہ دعوت کس چیز سے اور کہاں سے شروع کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دعوت کو حسنِ ابتدا کا حامل ہونا چاہئے۔ دعوتوں کے حسنِ ابتدا میں سے ایک بات یہ ہے کہ وہ پہلا جملہ جو داعی کہتا ہے اور لوگوں کے کانوں تک پہنچاتا ہے' اُسے اسکی تمام تر تعلیمات کا اجمالی نمائندہ ہونا چاہئے۔ نیز اُسے سادہ اور قابلِ فہم ہونا چاہئے۔ رسا اور بلیغ ہونا چاہئے۔ علاوہ ازایں اسے اصولی اور بنیادی ہونا چاہئے۔ کیونکہ اعتقادی مکاتب بالکل ایک درخت کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے ایک درخت کی جڑیں' تنا' شاخیں' پتے اور پھل ہوتے ہیں' اسی طرح ان مکاتب میں بھی ایک چیز جڑ کی حیثیت رکھتی ہے' دوسری تنے کی طرح سمجھی جاتی ہے اور کچھ چیزیں شاخوں کی مانند ہوتی ہیں' کچھ پتوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ پھل کی مانند ہوتی ہیں۔ جڑ' تنے' شاخوں' پتوں اور پھلوں کو اپنے اپنے مقام پر ہونا چاہئے تاکہ اس مکتب کو ایک صحیح صورت میں اور اصولی طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ لیکن اگر معاملہ الٹ ہوجائے' جڑ تنے کی' یا شاخ تنے کی' یا پتے کی جگہ پر آجائے اور پتا جڑ کی جگہ لے لے تو وہ اعتقادی مکتب کتنا ہی قوی اور طاقتور کیوں نہ ہو کوئی اچھا نتیجہ نہیں

دے گا۔

اب اس مختصر سے مقدمے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اسلام کی دعوت کہاں سے اور کس چیز سے شروع ہوئی۔

اسلام کی دعوت کا نقطۂ آغاز

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک خاص طرح کے حالات میں مبعوث ہوئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں مامور کیا گیا۔ فی الحال ہم آپ کے ان اندرونی عوامل اور روحانی کیفیات کے بارے میں بات نہیں کرتے جو اس بعثت پر منتہی ہوئے۔ لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ بعثت کے قریب کے دنوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت ایک عام شخص کی سی حالت نہیں تھی۔ بلکہ بنیادی طور پر آپ افقِ غیب سے نزدیک ہو رہے تھے۔ آنحضرت نے خود فرمایا ہے: ''اپنی بعثت کے نزدیک کے دنوں میں، پہلے پہل میں بہت زیادہ خواب دیکھتا تھا۔ ایسے خواب کہ "یأتی کفلق الصبح" جن کی مطابقت تعبیر اور وقوع صبح روشن اور صبح صادق کی مانند تھا۔ یعنی اگر میں عالمِ خواب میں دور کی جگہوں یا مستقبل کے واقعات دیکھتا تو وہ بالکل اس صبح صادق کی طرح درست اور سچے ہوتے اور عین ویسے ہی وقوع پذیر ہوتے۔

اس بارے میں فی الحال ہم بات نہیں کرتے۔ ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ اللہ کا فرشتہ پہلی بار بیداری کی حالت میں آنحضرت کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور کہتا ہے :

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔"

''اس خدا کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے خلق کیا ہے۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے۔'' (سورۂ علق ۹۶۔ آیت ۱ تا ۴)

ان احکامات میں آنحضرت سے فقط اتنا کہا گیا ہے کہ: پڑھئے۔ آپ کی زبان روح کو

کھولا جا رہا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ حرا سے نیچے تشریف لاتے ہیں۔ حضرت خدیجہ کے گھر میں جاتے ہیں' آپ کی حالت غیر معمولی ہوتی ہے' جیسے آپ کے پورے بدن میں ایک کپکپاہٹ کی کیفیت ہو۔

حضرت خدیجہ سے فرماتے ہیں۔ دِثّرِینی (مجھے اوڑھادیں تاکہ میں آرام کرسکوں)

جوں ہی آرام کرنا چاہتے ہیں پھر وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یٰـاَیُّهَـا الْـمُـدَّثِّرُ قُـمْ فَـاَنْذِرْ (اے میرے چادر اوڑھنے والے' اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ۔ سورۂ مدثر ۷۴۔ آیت ۱'۲) اِقْـرَأْ کے فوراً بعد یٰـاَیُّهَـا الْـمُـدَّثِّرُ نازل ہوتی ہے۔ پہلے آپ سے کہا جاتا ہے ''پڑھیے''۔ پڑھیے' کہنے سے پڑھے ہوئے ہوگئے۔ ایسے پڑھے ہوئے جیسے خدا چاہتا تھا۔ جب آپ کو کچھ قرار آگیا' تو آپ سے کہا قُمْ فَاَنْذِرْ' اٹھیں اور اپنی دعوت پہنچائیں۔

رسول اللہ کی دعوت کیا تھی؟

اسلام۔

اسلام کیا ہے؟

ایک عظیم درخت' بہت پھیلی ہوئی جڑوں والا' تنے اور بہت سی شاخوں والا' جس کے بہت زیادہ پتے اور پھل ہیں۔

رسول اللہ جب لوگوں کے درمیان آئے تو انہوں نے کہاں سے شروع کیا؟ کہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کیا؟ آپ کے کام کی ابتدا کیا تھی؟

کیا آپ نے لوگوں سے یہ کہا کہ اے لوگو! جھوٹ نہ بولو؟

جی ہاں' جھوٹ کی مخالفت اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات ''جھوٹ نہ بولو'' سے شروع نہیں ہوئیں۔

کیا آپ نے کہا: غیبت نہ کرو؟

نہیں' غیبت نہ کرو سے تبلیغ شروع نہیں ہوئی۔

کہا نماز پڑھو؟ زکات دو' انفاق کرو؟

نہیں (اسلامی دعوت) ان باتوں سے شروع نہیں ہوئی۔

غسلِ جمعہ کیا کرو! اپنے ناخن ترشوایا کرو؟ نہیں اسلامی دعوت کا آغاز ان باتوں سے نہیں ہوا۔ یہ بہت بعد کے درجوں کی باتیں ہیں۔

دیکھئے رسول اللہ لوگوں کے درمیان آ کر کس نقطے سے اپنی دعوت شروع کرتے ہیں؟ حسنِ مطلع اور حسنِ ابتدا کو ملاحظہ کیجئے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے درمیان آتے ہیں' تو پکارتے ہیں:

"اَیُّھَا النَّاس اِقولو الا اِلٰہَ اِلَّا للّٰہُ تُفلِحوا۔"

"اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو اور فلاح پا جاؤ"

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' تعظیم و تکریم کے لائق صرف خدا ہے۔ اپنے سامنے سے اللہ کے سوا ہر چیز ہٹا دو اور کہو: اللہ۔

آزادی اور غلامی' دونوں کی دعوت

جو لوگ فلاسفہ اور متکلمین کی روش سے واقف ہیں' وہ جانتے ہیں کہ فلاسفہ جب اللہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو مختلف طریقوں سے واجب اور وحدتِ واجب کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک دوسرے انداز سے شروع کرتا ہے۔ (کہتا ہے) لا الہ الا اللہ۔ اسلام نفی سے شروع کر کے اثبات تک پہنچتا ہے۔ نفی اور اثبات ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ جملہ "لا الہ الا اللہ" جس کے تمام حروف لام' الف اور ہ سے تشکیل پائے ہیں اور بارہ حروف سے زیادہ پر مشتمل نہیں' اس میں سلب بھی ہے اور ایجاب بھی (لا الہ' سلب ہے' اور' الا اللہ' ایجاب ہے)' نفی بھی ہے اور اثبات بھی' انکار بھی ہے اور تسلیم بھی' اس کا آدھا حصہ انکار اور سرکشی ہے اور دوسرا آدھا حصہ تسلیم ہے۔ نہیں بھی ہے اور ہاں بھی' آزادی بھی ہے اور بندگی بھی۔ اس کا پہلا حصہ آزادی ہے اور دوسرا حصہ بندگی و عبودیت ہے' آزادی غیر خدا سے اور بندگی ذاتِ خدا کی' دنیا کی تمام بندگیوں میں سے وہ واحد بندگی جو کسی آزادی کے منافی نہیں ہے' وہ بندگی جو عین آزادی ہے۔

بشر مطلق طور پر آزاد نہیں ہوسکتا۔ یعنی (ایسا نہیں ہوسکتا کہ) وہ ہر قوت وطاقت کی حکومت سے آزاد ہو نہ صرف بشر بلکہ ذات حق کے سوا کوئی موجود ایسا نہیں (ذات حق جو واجب الوجود ہے' کسی علت کا تسلط اس پر نہیں ہے) کوئی قوت اس پر حکومت نہیں کرتی اور کوئی شرط اس کے وجود پر موثر نہیں۔ وہ حاکم علی الاطلاق ہے اور کسی قدرت کا محکوم نہیں' وہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ذات واجب الوجود کے سوا کوئی موجود ایسا نہیں ہے جو ہر قید و بند سے آزاد ہو اور کسی قدرت کا محکوم نہ ہو۔

لہذا کسی انسان کا یہ کہنا کہ میں ہر قدرت کی حکومت سے آزاد ہوں یہ ایک امرِ محال کو تصور کرنا ہے۔ چاہے حکومت جسمانی ہو چاہے روحانی۔ رہی بات جسمانی کی تو ہم جو یہاں بیٹھے ہیں ہزاروں محکومیتوں میں ہیں' ہم اس ہوا کے سامنے محکوم ہیں' ہمیں اس ہوا کی ضرورت ہے۔ ہوا نہ ہو تو ہم نہ ہوں۔ ہم اس زمین کے محکوم ہیں۔ اگر یہ زمین نہ ہو تو ہم بھی نہ ہوں۔ ہم اس لحاظ سے محکوم ہیں کہ ہم پانی کے حاجت مند ہیں' روٹی کے ضرورت مند ہیں' ہزاروں جسمانی احتیاجات رکھتے ہیں۔ ہم ان کے تابع ہیں۔ اسی طرح ہماری روحانی احتیاجات ہیں۔

انسان اصطلاح کے مطابق فاعل بالقصد موجود ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے اپنے وجود سے باہر کسی محرک کے زیر اثر انجام دیتا ہے۔ وہ یا کسی لذت کے لئے کرتا ہے یا کسی تکلیف کو دور کرنے کے لئے کرتا ہے۔ محال ہے کہ انسان کوئی کام کرے اور اپنے اس کام میں دنیا کے محرکات میں سے کسی محرک کے زیر اثر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے کوئی بے بنیاد اور بے ہودہ کام کیا ہے۔ البتہ یہ محرکات مختلف ہوتے ہیں۔

صرف ایک روحانی و معنوی عامل ہے کہ اگر وہ وجودِ انسانی پر حکم فرما ہو تو یہ عین آزادی ہے اور اسکی حکم فرمائی انسان کے لئے غلامی' قید' محکومیت' ذلت اور سرِ تسلیم خم کر دینا نہیں ہے' اور وہ عامل خدا ہے۔ یعنی انسان خدا کا بندہ ہو۔

خدا کی بندگی کا لازمہ کیا ہے؟

کیا یہ ہے کہ میں غلام و محکوم ہوں اور ہر چیز سے روک دیا جاؤں اور میرے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی ہو؟

نہیں؛ یہ وہ واحد بندگی ہے جو تمام رکاوٹوں اور راستے میں حائل دیواروں کو ہٹا دیتی ہے اور اسکی کشش انسان کو بلندی کی طرف کھینچ لیتی ہے۔

"یَآاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ."

"اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔" (سورۂ انشقاق ۸۴۔ آیت ۶)

لہٰذا "لا الہ الا اللہ" جس سے اسلام کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے وہ دو اجزاء سے مرکب ایک دعوت ہے جو سلب اور ایجاب نفی اور اثبات آزادی اور بندگی نافرمانی اور تسلیم ہیں۔ اس دعوت کا پہلا نصف حصہ سرکشی اور نافرمانی ہے اور دوسرا نصف حصہ تسلیم اور فرمانبرداری۔

ہم نے لفظ "ایمان" بہت سنا ہے۔ ایمان کے بارے میں ہم صرف تسلیم کے پہلو سے واقف ہیں جبکہ قرآن مجید ہرگز ایسے ایمان کو قبول نہیں کرتا جو فقط تسلیم ہو اور اس تسلیم کے ساتھ سرکشی اور نافرمانی نہ ہو۔ کلمہ "لا الہ الا اللہ" کے علاوہ ہم آیت الکرسی میں پڑھتے ہیں: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی (دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے اس نے اسکی مضبوط رسی تھام لی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

دیکھئے یہاں کفر اور ایمان دونوں کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔ وہ شخص جو طاغوت سے کفر اور سرکشی کا اظہار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ خدا پر ایمان کے ساتھ ہمیشہ کفر بھی ہوتا ہے۔ ایک حقیقی توحید پرست کو کافر بھی ہونا چاہئے۔ اگر وہ کافر نہ ہو تو مومن نہیں ہو سکتا۔ البتہ (خدا کے سوا) ہر چیز کا کافر اور خدا کا مومن۔

ہمارے عرفا قدیم زمانے سے کلمہ "لا الہ الا اللہ" کی اسی طرح تحلیل کرتے آئے ہیں۔ بالخصوص وہ اس مسئلے کے نفی کے پہلو کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ شاید (اس بارے میں) سب سے بہتر (شعر) حکیم سنائی نے کہا ہے۔ وہ شہادت "لا الہ الا اللہ" کے بارے میں کہتے ہیں:

شہادت گفتن آن باشد کہ ہم زاول بیاشامی
ہمہ دریای ہستی را بدین حرف نہنگ آسا
نیابی خار و خاشاکی در این رہ چون بہ فراشی
کمر بست و بہ فرق استاد در حرف شہادت لا

''شہادت دینا یہ ہے کہ شروع ہی میں تمام بحرِ ہستی کو اس مگر مچھ کی طرح کے لفظ کے ساتھ پی جا۔''

''اس راستے میں تجھے کوئی کانٹا اور خس وخاشاک نہ ملے' جھاڑو کی طرح اپنی کمر باندھ اور سر کے بل کھڑا ہو جا ''لا'' کی گواہی کے حرف میں۔''

انہوں نے شاعرانہ تشبیہ دی ہے۔ ''لا'' ایک جھاڑو کی شکل کا لفظ ہے' جس کا ایک دستہ ہے اور اس کے ذریعے جھاڑو کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے آغاز میں ایک دستی جھاڑو رکھا ہے' تا کہ پہلے راہِ توحید میں پڑے خار و خاشاک کو جھاڑو لگا دو' تا کہ حقیقی توحید پرست بن سکو۔

یہ ہے وہ مقام جہاں سے اسلامی تعلیمات شروع ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام انسانوں کو اور بشریت کو حقیقی آزادی دے سکا ہے۔ وہ نشستیں جن میں ہم نے ''معنوی آزادی'' کے بارے میں گفتگو کی تھی' ان میں ایک حصے میں اس پہلو سے بات کی تھی کہ دراصل آزادی ہے کیا؟ دوسرے یہ کہ آزادی کی کئی قسمیں ہیں' معنوی آزادی اور اجتماعی آزادی۔ اور تیسری بات ان دونوں طرح کی آزادیوں کی ایک دوسرے سے وابستگی کے بارے میں کی تھی۔ یعنی معنوی آزادی اجتماعی آزادی کے بغیر یا (عملی) ہوتی ہی نہیں یا ایک مشکل کام ہے اور خاص طور پر معنوی آزادی کے بغیر اجتماعی آزادی ممکن ہی نہیں۔ جب تک انسانیت کو معنوی آزادی نہ ملے اسے اجتماعی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا صرف نعرہ کافی نہیں ہے

آزادی کا مسئلہ جو ان دو تین ہفتوں میں ہماری گفتگو کا موضوع تھا اور آج شب بھی' عید

سعید بعثت کی مناسبت سے ہم نے اس گفتگو کا عنوان ''اسلام کی آزادی بخش تحریک'' رکھا ہے' ہمیں پوری توجہ دینا چاہئے کہ آزادی وحریت کو اپنا نعرہ قرار دینا تو ایک آسان کام ہے۔ آج آزادی تمام طبقات اور سب لوگوں کا نعرہ بن گیا ہے۔ اور اس کا اس قدر نعرہ لگایا گیا ہے کہ اس لفظ کی تمام تر اہمیت ہی ختم ہوگئی ہے۔

آزادی کا نعرہ لگانا ایک آسان کام ہے۔ لیکن کیا فقط نعرے لگانے سے انسان کو آزادی مل سکتی ہے؟ کیا ہمارے صرف آزادی کا نعرہ لگانے اور یہ کہنے سے کہ آزادی زندہ باد' آزادی مخالف مردہ باد' کیا اس زندہ باد اور مردہ باد کہہ دینے سے حقیقی معنی میں آزادی میسر آسکتی ہے؟

صرف نعرے ہی سے نہیں بلکہ کسی بھی طرح کی تعلیم وتربیت سے بھی کیا انسان کو آزادی مہیا کی جاسکتی ہے؟ حقوقِ انسانی کا عالمی اعلامیہ یہی سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''تمام تر خرابیوں' خونریزیوں' فسادات' مظالم اور استبداد کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی آزادی کا احترام نہیں کرتے''۔ ہم کہتے ہیں' بہت اچھا' اب ہمیں کہنا چاہئے کہ لوگ ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کریں۔ وہ ایک بہت سادہ سا فارمولا تجویز کرتا ہے۔ (وہ کہتا ہے کہ) پہلے انسانوں کی تعلیم وتربیت اس طرح سے کریں' انہیں مسلسل تلقین کرتے رہیں کہ ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کریں۔ پھر وہ ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کرنے لگیں گے۔ کیا یہ چیز ممکن ہے؟

ایک تربیت یافتہ بلی کا قصہ

اس سے ایک تربیت یافتہ بلی' ایک بادشاہ اور ایک وزیر کا قصہ یاد آتا ہے۔ ایک بادشاہ اور اسکے وزیر کے درمیان ہمیشہ اس بات پر بحث ہوتی رہتی تھی کہ تربیت کا عمل لوگوں کی روح کے لئے کتنا موثر ہے۔ وزیر کہتا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی تربیت نہیں کی جاسکتی۔ (جبکہ بادشاہ) کا کہنا تھا کہ نہیں سب کی تربیت کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے وزیر کو غلط ثابت کرنے کے لئے حکم دیا کہ ایک بلی کی تربیت کی جائے۔ جب بادشاہ دسترخوان پر آتا تو بلی کے ہاتھ میں ایک شمع پکڑا دی جاتی۔ بھوکی بلی کھانے کے سامنے بیٹھ جاتی۔ ناک میں غذا کی خوشبو پہنچنے

کے باوجود وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلتی۔ جب تک حاضرین دسترخوان پر کھانا کھاتے رہتے وہ شمع ہاتھ میں پکڑے رکھتی۔ جب بادشاہ بلی کو خوب اچھی طرح تربیت دے چکا' تو اس نے وزیر کو طلب کیا۔ وزیر آیا' اسے اس نے ایک دسترخوان پر بٹھا دیا' جبکہ بلی شمع ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ اس حال میں بھی وزیر اپنے موقف پر جما رہا۔ اس نے کہا: اس عمل سے دھوکا نہ کھایئے' بلی بلی ہے' بلی جب تک بلی رہے گی کسی صورت اسکی تربیت نہیں ہو سکتی اور اسکی اس تربیت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ وزیر ایک مرتبہ پھر کھانے پر آیا۔ لیکن (اب کے) وہ اپنے ساتھ چند چوہے لے آیا تھا۔ یعنی وہی بلی کا شکار۔ وہی چیز جس سے بلی عشق رکھتی ہے۔ وہ جیسے دسترخوان پر موجود گوشت کو پسند کرتی ہے' اسی طرح چوہے کے صرف گوشت ہی کو پسند نہیں کرتی بلکہ دراصل اس سے عشق رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی چوہا پکڑتی ہے' تو کچھ دیر کے لئے ایک طرف ہو کر اس سے کھیلتی ہے۔ اس کی لاش پر رقص کرتی ہے اور خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ اس کا شکار ہے۔ یہاں معاملہ خوراک کا نہیں کچھ اور ہے۔ اب کے جب بلی کو دسترخوان پر لایا گیا اور اسکے ہاتھ میں شمع دی گئی' تو درمیان میں اچانک وزیر نے دسترخوان کے بیچوں بیچ چوہوں کو چھوڑ دیا۔ جوں ہی بلی کی نگاہ چوہوں پر پڑی' اس نے شمع کو ایک طرف پھینکا اور چوہوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ دکھا کر وزیر نے کہا' میں نہ کہتا تھا؟

آج کی دنیا کی غلطی

آج کی دنیا ایک طرف تو انسان کی اہمیت کو کم کر رہی ہے۔ اللہ پر اعتقاد اور ایمان' جو آزادی کی اصل بنیاد ہے' اسے متزلزل کر رہی ہے۔ انسان کے اپنے آپ پر ایمان کا اس عنوان سے انکار کر رہی ہے کہ وہ ایک باشرف اور ماورائے طبیعت اور "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" (۱) کا مصداق موجود ہے۔ اور "اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" (۲) کا انکار کر رہی ہے۔ "وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ" (۳) کا انکار کر رہی ہے۔ "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ" (۴) کا انکار کر رہی ہے۔ اور "يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى

رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ" (۵) کا انکار کر رہی ہے۔ یعنی انسان کے مقامِ انسانیت کا انکار کر رہی ہے۔ انسان کے اپنے آپ پر اور خدا پر ایمان کو متزلزل کر رہی ہے۔ انسان کو ایک مفاد پرست مفاد طلب اور منفعت طلب وجود میں تبدیل کر رہی ہے۔ اور دوسری طرف یہی انسان جس کی زندگی کا مقصد وہ مفاد پرستی اور منفعت طلبی قرار دے رہی ہے' اور جسے ایک کمال یافتہ حیوان کے طور پر پیش کر رہی ہے' یعنی ایسا حیوان جو دیگر حیوانات سے کوئی خاص فرق نہیں رکھتا' اور ان سے ایک درجہ بڑھ کر حیوان ہے' نیز وہ زندگی کو بھی تنازع بقا سمجھتی ہے اور تنازع بقا کے سوا کچھ نہیں قرار دیتی' اسکے باوجود انسان سے یہ توقع بھی رکھتی ہے کہ وہ آزادی' انسانی مقام و شرف اور دوسروں کے حقوق کا احترام بھی ملحوظ رکھے۔

کیا یہ ممکن ہے؟

ہم جو اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "اسلام کی آزادی بخش تحریک"۔ ہماری گفتگو صرف یہ نہیں ہے کہ اسلام نے آزادی پسندی کے نعرے دیئے ہیں۔ اسلام آزادی پسندی کے نعروں میں نہ فقط دوسروں سے کمتر نہیں ہے بلکہ ان سے بالاتر ہے۔ اس کا نمونہ ہم عرض کریں گے۔ لیکن "اسلام کی آزادی بخش تحریک" کے حوالے سے ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ اسلام نے قید و بند کے عوامل کے خلاف جنگ کی ہے اور آزادی کے عوامل کو ایجاد کیا ہے۔ وگرنہ صرف نعروں پر گفتگو کرنا تو کوئی بات نہیں۔ البتہ ہم اسلام کے نعروں کو بھی مثال کے طور پر عرض کر رہے ہیں۔

۱۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۹' سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۷۲

۲۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰

۳۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۰

۴۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۷۲

۵۔ سورۂ انشقاق ۸۴۔ آیت ۶

قرآن وحدیث میں آزادی کے نعرے

قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے ایک ایسی آیت پیش کی ہے۔ وہ آیت کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گشتی مراسلہ' جسے اصطلاحاً سرکلر کہتے ہیں' اس زمانے کے سربراہوں کو بھیجنا چاہا تو آنحضرت نے اہلِ کتاب اقوام کے نام یہ مراسلہ لکھتے ہوئے اس آیت کا انتخاب کیا:

"قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ." (۱)

کہئے: اے لوگو! جو اپنے آپ کو ایک آسمانی کتاب کا پیروکار سمجھتے ہو' آؤ ایک عقیدے اور فکر پر متحد ہو جائیں۔ وہ فکر جو ہمارے اور تمہارے نزدیک مساوی طور پر اچھی ہے۔

کونسی فکر؟

توحیدِ الٰہی کی فکر'

ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں' اللہ کی عبادت میں کسی کی شرکت کے قائل نہ ہوں۔ پھر انسانوں کے مابین کوئی فرق موجود نہ رہے۔ بعض اپنے آپ کو بعض کے ارباب اور آقا نہ سمجھیں اور دوسروں کو اپنا محکوم' اسیر اور غلام شمار نہ کریں۔

نعرے کے لحاظ سے کونسا اعلامیۂ آزادی اس سے برتر و بالاتر ہے۔ قرآنِ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک جملہ نقل کرتا ہے۔ فرعون' حضرت موسیٰ سے کہتا ہے: اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۱۸'۱۹) اے کفرانِ نعمت کرنے والے موسیٰ! اے نمک ناشناس! کیا تو وہی نہیں ہے جسے ہم نے اپنے گھر میں پروان چڑھایا؟ تو ہمارے گھر میں پلا بڑھا ہے' ہمارے دسترخوان پر کھا کر بڑا ہوا ہے' اب آ کر تو ہمارے خلاف کھڑا ہوتا ہے؟

۱۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴

موسیٰ اُس سے کہتے ہیں: میں تیرے دستر خوان پر کیوں پلا بڑھا؟ وہ کیا حالات تھے جو اس بات کا سبب بنے کہ میں تیرے گھر میں پروان چڑھا؟ کیا اسکی وجہ اسکے سوا کچھ اور تھی کہ تو نے استبداد کیا' بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور بندہ سمجھا اور اپنے آپ کو بنی اسرائیل اور ہم سب کی جان و مال پر حاکم سمجھا؟ تو نے ہمارے نوزائیدہ لڑکوں کے خون کو مباح جانا۔ جب میں اپنی والدہ کے ہاں پیدا ہوا تو مجبوراً مجھے دریا کے سپرد کر دیا گیا' تاکہ دریا میری حفاظت کرے۔ تو جو معاشرہ وجود میں لایا تھا وہ میری حفاظت پر قادر نہ تھا۔ تیرے خوف سے انہوں نے مجھے دریا کے سپرد کر دیا۔ تو نے مجھے دریا ہی سے حاصل کیا تھا۔ علاوہ ازایں اب اگر میں تیرے دستر خوان پر پلا بڑھا ہوں اور میں نے تیرا نان و نمک کھایا ہے' تو کیا یہ بات اس کا سبب بن جائے کہ میں حقیقت کو قدموں تلے روند ڈالوں اور اس بات کی تائید کروں کہ تو بنی اسرائیل کو اپنا بندہ اور غلام سمجھے۔ وَ تِلْکَ نِعْمَۃٌ تَمُنُّھَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (سورہ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۲) کیا مجھ پر کیا ہوا تیرا یہ احسان' اس بات کا باعث ہو سکتا ہے کہ اس کے عوض تو بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور بندہ بنائے رکھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا ہے۔ اگر آپ آزادی و حق طلبی کے بارے میں اس سے برتر' بالاتر اور زیادہ زوردار کوئی جملہ لاسکیں تو مجھے بتایئے گا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ جملہ کئی مرتبہ سنا ہے۔

بعض جملے ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ رسول اکرم نے ارشاد فرمائے ہیں۔ شاید آنحضرت نے انہیں ایک سے زیادہ مرتبہ نہ فرمایا ہو لیکن ایک حدیث جو مالک اشتر کے نام فرمان میں حضرت علی نے لکھی ہے' اور جو اصول کافی اور نہج البلاغہ میں درج ہے' اس میں آپ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ جملہ بار بار رسول اللہ سے سنا ہے کہ: لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّۃٌ حَتّٰی یُؤْخَذَ لِلضَّعِیفِ فِیھَا حَقُّہُ مِنَ الْقَوِیِّ غَیْرَ مُتَعْتَعٍ (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳ معمولی اختلاف کے ساتھ) یعنی کوئی ملت اور کوئی امت اس وقت تک کسی تقدس' پاکیزگی' بزرگی اور بزرگواری کے مقام پر نہیں پہنچتی۔

آپ نے فرمایا ہے "لَنْ" جو ابدی نفی کی علامت ہے۔ یعنی محال ہے کہ کوئی امت و ملت

بزرگی، تقدس، پاکیزگی اور بزرگواری کے مقام پر پہنچ جائے، جب تک وہ امت اس مقام کو نہ پالے کہ اس کا کمزور اسکے طاقتور کے سامنے آزاد ہو۔ ضعیف قوی سے اپنا حق مانگ سکے اور ایسا کرتے ہوئے اسکی زبان میں معمولی سی لڑکھڑاہٹ بھی نہ آئے۔ کمزور پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ طاقتور کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ صرف وہی امت کامیاب ہوگی اور تقدس و پاکیزگی کے مقام پر پہنچ سکے گی جس کے کمزور افراد میں طاقتور افراد کے مقابل اتنی جرأت موجود ہو۔

کیا آپ دنیا میں کہیں سے اس سے زیادہ قوی اور زوردار شعار لا سکتے ہیں؟

حضرت علی اپنے بیٹے امام حسن مجتبیٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَلا تَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ وَقَدْ جَعَلَكَ اللّٰهُ حُرًّا."(۱)

بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی اور کے بندے بن جاؤ۔ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی اس نعمت وعنایت کی قدر کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آزادی کی نعمت گنوا بیٹھو۔

لہٰذا اسلام آزادی کے نعروں کے حوالے سے نہ صرف دوسروں سے کم نہیں، بلکہ اسکے پاس سو فیصد قوی تر، طاقتور تر اور زوردار تر نعرے (slogans) موجود ہیں۔

اسلام نے آزادی کی بنیادیں فراہم کی ہیں

البتہ اسلام نے آزادی اور حریت پسندی کے فقط نعروں ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ آزادی کی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔ آزادی کی پہلی بنیاد خدا کی معرفت اور اسکی بندگی ہے۔

"قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا." یعنی عبادتِ الٰہی کے سوا کوئی اور قوت وطاقت انسانی وجود پر حکومت نہ کرے۔

دوسرا عامل، انسان کی خود اپنے بارے میں معرفت ہے:

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ." (۱)

اسلام انسان کو صرف خدا کی پہچان کروانے کے لئے نہیں آیا ہے۔ (بلکہ وہ اس لئے بھی آیا ہے کہ انسان کو خود اسکی اپنی معرفت کروائے) انسان نے اگر اپنے آپ کو نہ پہچانا' تو وہ اللہ کو بھی نہیں پہچان پائے گا۔ اگر اس نے اپنے آپ کو صحیح طور پر نہ پہچانا تو اللہ کی پرستش نہیں کر سکتا۔

اے بشر! اے انسان! تو اپنے آپ کو ایک پست خاکی وجود نہ سمجھ۔ اپنے آپ کو حیوانات کے برابر نہ سمجھ' اپنے آپ کو ایک پست شہوانی وجود نہ سمجھ۔ یہ خیال نہ کر کہ تجھ میں فقط جاہ طلبی کا ایک محرک اور سبب (motive) موجود ہے۔ یا تیرے وجود میں اقتصادی یا جنسی عوامل ہی محرک ہیں۔ ایسا نہیں ہے' بلکہ تیری سرشت میں ایک اور پہلو بھی ہے' ایک روح' ایک تقدس و روحانیت بھی ہے' نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۲) میں نے اپنی روحِ الوہیت سے ایک چیز تیرے وجود میں پھونکی ہے۔ تو خلیفۃ اللہ اور جانشینِ خدا ہے' تو ان باتوں سے بالاتر ہے۔

(اسلام) نے انسان کا خود انسان سے تعارف کروایا ہے اور اسے خود اپنے آپ کو پہچنوایا ہے۔ انسان جب تک اپنی اس روحانی حیثیت سے آگاہ نہ ہو اور اپنی معنوی اہمیت کو درک نہ کرتا ہو' اپنے آپ کو مادّیات سے جدا نہیں کر سکتا۔ اور جب تک وہ مادّیات سے جدا نہ ہو' اُس کا آزاد ہونا محال ہے۔

جو انسان مادّیات کا غلام ہو' کیا وہ آزاد اور آزادی پسند ہو سکتا ہے؟

ایسا ہونا محال ہے۔

اسکی دلیل دنیا کے تجربات ہیں۔ اسلام نے آزادی کا اعلان کیا۔ دوسروں نے بھی دنیا میں آزادی کا اعلان کیا ہے۔ آپ عملاً دیکھیں کہ اسلام کو کیا کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں اور انہوں نے کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اگر ہم صرف رسول اللہ کی زندگی کو' علی ابن ابی طالب کی زندگی کو'

۱۔ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا' اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

۲۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۹' سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۷۲

حتیٰ کہ خلفا کی زندگی کو معیار قرار دیں' جب تک کہ وہ رسول اللہ کی سیرت و سنت پر چلتے رہے' تو دیکھیں گے کہ اسلام نے اس سلسلے میں کیا کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں اور دوسرے کس قدر ناکام رہے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہی پانچ سالہ حکومت حقیقتاً عجیب ہے۔ علی کیونکہ واقعاً بندۂ خدا تھے اور غیر از خدا ہر قوت کی حاکمیت سے آزاد تھے' لہٰذا آزادی پسند اور آزادی بخش تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی کے دورِ حکومت میں بعض افراد نے حضرت علی کی بیعت سے روگردانی کی اور آپ کی بیعت کے لئے تیار نہ ہوئے۔ مثلاً زید بن ثابت' اسامہ بن زید اور سعد بن ابی وقاص۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شروع ہی سے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی۔ ان کا بیعت نہ کرنا حضرت علی کی حکومت کے لئے ایک ضرب تھا' کیونکہ یہ افراد صاحبِ حیثیت' معروف اور صحابۂ رسول میں سے تھے۔ حضرت علی کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ یہ لوگ آ کر بیعت کریں۔ اور اگر یہ افراد بیعت کر لیتے تو اجتماعی پہلو سے حکومتِ علی کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو جاتی۔ لیکن حضرت علی نے ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ فرمایا: ان کی مرضی ہے' چاہیں تو بیعت کریں' چاہیں تو نہ کریں۔ کیا آپ اُن کے مزاحم ہوئے؟ نہیں۔ کیا آپ نے انہیں مجبور کیا کہ ضرور بیعت کریں؟ نہیں۔ کیا بیت المال میں سے ان کا حصہ روک لیا؟ نہیں۔ ان کی جان کے لئے امان ختم کر دی؟ نہیں۔ ان کے مال کے لئے امان ختم کر دی؟ نہیں۔ بلکہ ان کی جان و مال کے خود محافظ بن گئے۔ البتہ ان حدود میں جو کہ جائز تھیں۔

خوارج تو ان لوگوں سے بھی بڑھ کر تھے۔ خوارج تو باقاعدہ باغی تھے۔ اس معنی میں کہ انہوں نے بیعت کرنے کے بعد حکومتِ علی کو مسترد کر دیا۔ کہتے تھے کہ ہم علی کو نہیں مانتے۔ نہ صرف مسترد کیا بلکہ حضرت علی کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ کہتے تھے علی کافر ہو گئے ہیں (نعوذ باللہ)۔ کیونکہ علی کافر ہو گئے ہیں اور دین خدا سے روگرداں ہوئے ہیں' اس لئے ہم علی کی حکومت کو قبول نہیں کرتے۔ (علی نے) ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جب تک انہوں نے دوسروں کے لئے مسائل کھڑے نہ کئے' صرف اپنے نظریے کا اظہار کرتے اور اسکی تبلیغ کرتے رہے' بات چیت اور گفتگو

کرتے رہے، علی اُن کے آڑے نہ آئے۔ لیکن جوں ہی انہوں نے اپنی اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا، دوسروں کے لئے مسائل کھڑے کرنے لگے، دوسروں کے لئے زحمت اور مشکلات کے اسباب پیدا کرنے لگے اور باقاعدہ باغی کے طور پر کوفہ سے فوج باہر لے گئے تاکہ خلل اندازی کریں اور امن وامان کو تباہ کریں، تو حضرت علی نے ان کی خبر لی۔

ایک نشست میں ہم نے مولا کے ایک معروف خطبے کے وہ جملے پڑھے تھے جن میں آپ لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں (آپ ایک حقیقی حریت پسند شخص کا نمونہ ہیں) جب لوگ آپ کے پاس آکر بات کرتے ہیں اور بڑے بڑے القاب کا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی حد سے زیادہ احترامات کا اظہار کرتے ہیں اور بڑے زوردار الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مختلف القاب سے مخاطب ہوتے ہیں، تو آپ فرماتے ہیں:

"لا تُكَلِّمونی بِما تُكَلَّمُ بِهِ الْجَبابِرَةُ."(۱)

مجھ سے سادگی کے ساتھ بات کرو، مجھے علی کہو، زیادہ سے زیادہ "یاامیر المومنین" کہہ لو، اس سے زیادہ میں تیار نہیں ہوں کہ تم میرے لئے القاب تراشو، یا مجھ سے تکلف کے ساتھ بات کرو۔

"وَلا تُخالِطونی بِالْمُصانَعَةِ."(۲)

میری بڑائی بیان نہ کرو، میری مدح وثنا نہ کرو کہ اللہ خود جانتا ہے کہ میں تعریف سننے سے خوش نہیں ہوتا۔ اسکے برعکس تمہاری نظر میں کوئی تنقید اور اعتراض ہے تو مجھ سے کہو۔

نہج البلاغہ میں ایک مکتوب ہے، جس کے بارے میں (اس کتاب کی تدوین کرنے والے) سید رضی نے یوں لکھا ہے کہ: جنگ جمل کے موقع پر جب حضرت علی مدینے سے روانہ ہوکر بصرہ آئے، تو وہاں سے ایک مکتوب اہلِ کوفہ کے نام تحریر کیا اور انہیں دعوت دی۔ اس مکتوب کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ گزشتہ خلفا کے زمانے میں میری زندگی کا ایک دور ہے، لوگ میرے ماضی کے بارے میں جو کچھ سوچتے ہوں، میں ظالم تھا یا مظلوم، میں باغی تھا یا میرے خلاف بغاوت کی گئی۔ جو کچھ بھی

۱۔ "مجھ سے اس انداز میں بات نہ کرو جیسے جابر و سرکش فرمانرواؤں سے کی جاتی ہے"۔

۲۔ "اور مجھ سے اس طرح کا میل جول نہ رکھو جس سے چاپلوسی اور خوشامد کا پہلو نکلتا ہو۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۱۴)

تھا اس وقت میں ان امور کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ البتہ آج مسلمانوں نے میری بیعت کر لی ہے۔ جو کوئی بھی میری مدد کو آنا چاہتا ہے آ جائے۔ تاہم میں اس پر ایک قید اور شرط لگاتا ہوں' میرے پاس آئے اور دیکھے کہ اگر میں اچھا عمل کرتا ہوں تو میری مدد کرے اور اگر دیکھے کہ برا عمل کرتا ہوں تو مجھ پر تنقید اور اعتراض کرے' تاکہ میں اسکی تلافی کروں۔

اسے کہتے ہیں ایک آزادی پسند حکومت کا نمونہ۔

لیکن ایسا کیوں ہے؟

ایسا اس لئے ہے کہ اسلام ایک ایسا دین تھا جس نے ایسے افراد کی تربیت کی۔ البتہ ہم نہیں کہنا چاہتے کہ علی جیسے افراد کی۔ علی' اسلام کی کامل تربیت کا نمونہ تھے اور اس دور کے مسلمان معاشرے کا بھی یہی تقاضا تھا۔

آزادی فراہم کرنے والے عوامل (factors) کیا ہیں؟

ہم کہہ چکے ہیں کہ ایک عامل یہ ہے کہ انسان کو خود اسکی اپنی معرفت کروائی جائے اور اسکی اہمیت بلند کی جائے۔ آج کی ناکامیوں کی ایک وجہ یہی ہے کہ انسان کی جو اہمیت ہے' وہ اس سے نیچے آ گئی ہے اور یہی انسان کی بدبختی کی علامت اور دلیل ہے۔

لوگوں کی آزادی تین پہلوؤں سے سلب ہوتی ہے

دیگر عوامل کی تین قسمیں ہیں۔ ان کے بارے میں انشاء اللہ ہم کل شب گفتگو کریں گے۔ لوگوں کی آزادی تین پہلوؤں سے سلب ہوتی ہے۔ ایک پہلو: سلب کرنے والے افراد کی طرف سے۔ جو افراد دوسروں کی آزادی سلب کرتے ہیں' وہ کیوں اور کس دلیل سے ایسا کرتے ہیں؟ ان کے وجود پر کیا عامل حکم فرما ہوتا ہے جس کے زیر اثر وہ دوسروں کی آزادی سلب کرتے ہیں؟ دوسرا پہلو: جن کی آزادی سلب ہوتی ہے ان کے حوالے سے۔ یعنی جن افراد کی آزادی سلب ہوتی ہے ممکن ہے ان کا بھی اس حوالے سے کوئی کردار ہو۔ ان میں کوئی خصوصیت' حالت اور کیفیت ہوتی ہو جو اس امر کا سبب بنتی ہے کہ ان کی آزادی ان سے چھین لی جائے اور سلب کر لی جائے۔ تیسرا

پہلو: معاشرتی اداروں کا نظام ان کی تشکیل اور معاشرتی قوانین کی وضع اور ان کا اجرا و نفاذ ہے۔

ہمیں ایک ایک کر کے ان عوامل کا جائزہ لینا چاہیے۔

سب سے پہلے (آزادی) سلب کرنے والوں کا معاملہ ہے۔ یعنی وہ افراد جو دوسروں کی آزادی سلب کرتے ہیں اور دوسروں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ دوسروں کی آزادی کا احترام کیوں نہیں کرتے اور اسے کیوں سلب کرتے ہیں؟

اسکی دو وجوہات ہیں۔ ایک مفاد پرستی اور منفعت پرستی' جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے' اور دوسری قدرت و طاقت۔ یعنی جب انسان اپنے طرزِ عمل اور راہ و روش میں مفاد پرست ہو اور ذاتی فائدے اور انفرادی مفاد کا حصول چاہتا ہو' خود پرست ہو اور دوسری طرف اسکے ہاتھ میں طاقت بھی ہو' اور اسے وسائل میسر ہوں' تو حالات اس بات کے لئے کافی ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی آزادی سلب کرے اور ان کے حقوق پامال کرے۔

البتہ وہ عامل جو ان افراد سے مربوط ہے جن کی آزادی سلب ہوئی ہو' اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک کمزوری' سستی اور لاتعلقی' جو عام لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تساہل اور بے پروائی کی سی حالت جس پہلو سے بھی ہو' جسے ہم اکثر درویش مسلکی کا نام دیتے ہیں۔ لوگوں میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ احقاقِ حقوق کو ایک مقدس اور محترم کام نہیں سمجھتے۔ یہ ایک سستی ہے۔ دوسرا عامل ضعف اور کمزوری ہے۔ یعنی بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقوق کی حقیقت کا احساس تو کرتے ہیں اور آزادی حاصل بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن کیونکہ کمزور ہوتے ہیں اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہوتی' لہٰذا مجبوراً اسے حاصل نہیں کر پاتے۔

رہی بات معاشرتی قوانین اور نظام کی' تو ممکن ہے یہ اس طرح کے ہوں کہ افراد معاشرہ اپنی آزادی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

سلبِ آزادی کو روکنے کے لئے اسلام کا طریقہ

پہلے عامل کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزادیوں کو سلب کرنے والوں کے

حوالے سے کچھ کیا جاسکتا ہے۔جس کے ذریعے وہ کنٹرول کئے جائیں۔تاکہ آزادیوں کا احترام کریں۔یا ایسا نہیں ہوسکتا؟

اس مقام پر اسلام نے دو اطراف سے دخالت کی ہے۔ایک ان کی طاقت کو محدود کرنے کے حوالے سے اور دوسرے تعلیم وتربیت کے حوالے سے۔ان کی دینی تعلیم وتربیت کے ذریعے سے' ان کی روحانی تربیت اور ایمانِ قوی کے ذریعے سے۔اس سلسلے میں اسلام کامیاب بھی رہا ہے۔یعنی طاقتور افراد جو اپنی سرشت کے تحت فائدے اور منافع کے حصول کی فکر میں ہوتے ہیں' اسلام نے ان کے اندر ایک قوی ایمان پیدا کر کے انہیں مفاد پرستی اور منفعت طلبی سے باز رکھا ہے۔

اسلام محض اس کام پر اکتفا نہیں کرتا کہ کمزور سے کہے کہ: اے کمزور! اٹھ اور طاقتور سے اپنا حق حاصل کر اور طاقتور بن جا۔اسلام یہ بھی کہتا ہے۔لیکن اگر کمزور جا کر طاقتور سے اپنا حق لے لے اور خود طاقتور ہو جائے' تو پھر یہ طاقتور کیا کرے گا؟ وہ بھی پہلے والے طاقتور کے مقام پر آجائے گا۔یعنی پہلے طاقتور کی طرح ظالم اور ستمگر ہو جائے گا۔

اسلام ضعیف سے یہ کہنے کے علاوہ کہ قوی ہو جا اور اپنا حق لے لے' قوی سے بھی کہتا ہے کہ: اے طاقتور! پروردگار کی ذات کے سامنے (کوئی طاقت نہیں)۔تیرا ایک خدا ہے' تیری ایک آخرت اور معاد ہے' تیرے لئے ایک جزا ہے' اس دنیا کے بعد حساب وکتاب کا ایک دن ہے۔یہ نہ سمجھ کہ فقط تو قوی ہے اور دوسرے انسان ضعیف ہیں۔ہر طاقتور سے اوپر ایک اور طاقتور ہے: اِنَّ اللہَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَاب۔(۱)

اللہ جو قوی اور شدید العقاب ہے ہر ایک کے اوپر موجود ہے۔جیسے حضرت علی' مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں لکھتے ہیں: اے مالک! فَاِنَّکَ فَوْقَھُمْ' میں اعتراف کرتا ہوں کہ تو ان عام لوگوں سے مافوق ہے جن پر میں نے تجھے والی قرار دیا ہے۔لہٰذا ان سے مافوق ہونے کی بنا پر ممکن ہے تو مغرور ہو جائے اور ظلم وستم کرنے لگے' اس لئے یہ بات دھیان میں رکھ کہ: وَوَلِی

۱۔سورۂ انفال ۸۔آیت ۵۲

اَلْاَمْرِ عَلَیْکَ فَوْقَکَ' اور وہ کہ جس نے تیرے نام یہ فرمان لکھا ہے اور تجھے مصر کا گورنر مقرر کیا ہے (جو خود میں ہوں) تجھ سے اوپر ہے۔ میں تجھ سے بڑی طاقت ہوں۔ یعنی یہ بات ذہن نشین رکھ کہ میں تیرے کاموں کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر تو نے خلاف ورزی کی تو تجھے سزا دوں گا۔

میں کون ہوں؟

کیا میں کوئی ایسا قوی وقادر ہوں کہ مجھ سے مافوق کوئی قدرت نہیں؟

نہیں وَاللّٰہُ فَوْقَ مَنْ وَلَاکَ (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳) اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے مافوق ہے جو تجھ سے مافوق ہے۔ تجھ سے مافوق ہے۔ تجھ سے اوپر میں ہوں اور اللہ ہم سب سے اوپر ہے' ہمیں اللہ کو نظر میں رکھنا چاہئے۔

لہٰذا آزادی سلب کرنے والے عامل کو کس طرح کنٹرول کیا جاسکتا ہے؟ اس طرح کہ "وَاللّٰہُ فَوْقَ مَنْ وَلَاکَ" عادل' حکیم' قوی اور شدید العقاب خدا پر ایمان کے ذریعے۔

دوسرا طریقہ ہم نے عرض کیا ہے کہ طاقتوں کو محدود کرنا ہے۔ جس کے بارے میں ہم معاشرتی اداروں کے زیر عنوان بات کریں گے۔

زبوں پروری کے خلاف اسلام کی جنگ

وہ فرد جس کی آزادی سلب ہو چکی ہے (اسکے لئے اسلام نے کیا کہا ہے؟) باعث افسوس ہے کہ عیسائی تعلیمات' یعنی وہ تعلیمات جو عیسائیت کے آغاز میں پیدا ہو گئی تھیں (ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات) میں یہ زبوں پروری موجود تھی لیکن اسلام نے زبوں پروری اور خستہ حالی کے خلاف موقف اختیار کیا ہے۔ اسلام جس قدر ظالم کو ناپسند کرتا ہے' اُتنا ہی زبوں حال شخص کو ناپسند کرتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو ظالم کے مقابلے کی قوت رکھنے کے باوجود اسکے سامنے سر جھکائے ہوئے ہو۔ اسلام کہتا ہے: لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (۱)

۱۔ اللہ مظلوم کے علاوہ کسی کی طرف سے بھی علی الاعلان بُرا بھلا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۴۸)

اسلام کہتا ہے کہ اللہ کسی کی طرف سے کسی کی بدگوئی کرنے، کسی کے خلاف نعرے لگانے، کسی کو بدنام کرنے اور کسی کی کردارکشی کرنے کو پسند نہیں کرتا، سوائے اس شخص کی طرف سے جس پر ظلم ہوا ہو۔ ہاں، مظلوم کو اجازت دیتا ہے کہ وہ چیخ پکار مچائے، برا بھلا کہے۔ یہاں تک کہ شعر کہے، ہجو کہے، نعرہ بلند کرے۔ کیوں؟ کیونکہ یہ احقاقِ حق کا ذریعہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا یَمنَعُ الضَّیمَ الذَّلیلُ وَلا یُدرَکُ الحَقُّ اِلّا بِالجِدِّ۔"(۱)

ذلیل اور کمزور آدمی ہرگز ظلم کو نہیں روک سکتا۔ ہمت، کوشش، طاقت اور عزم کے بغیر حق کا حصول ممکن نہیں۔ ول ڈیورانٹ اپنی کتاب تاریخِ تمدن کی گیارہویں جلد میں کہتا ہے کہ: اسلام کی مانند کسی اور دین نے اپنے پیروکاروں کو قوت کے حصول کی دعوت نہیں دی۔ ایسا ہی ہے۔ وہ دین جس میں جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور وَاَعِدُّوا لَهُم مَا استَطَعتُم مِن قُوَّةٍ (۲) ہو، وہ کسی صورت کمزوری اور زبوں حالی کی دعوت نہیں دے سکتا۔

اسلام نے کمزوری اور ضعف کے اس عامل کا بھی اس انداز سے مقابلہ کیا ہے۔

ہم نے جو مثالیں عرض کی ہیں، وہ اسی مقصد کے لئے تھیں۔ کیا خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے ہی نہیں تھے؟ جیسے کہ ہم نے حضرت علی کے بارے میں عرض کیا ہے، رسول اللہ بھی ذاتی طور پر ایسے ہی تھے۔ آپ کوشش کرتے تھے کہ لوگ زبوں حال اور کمزور و پست پروان نہ چڑھیں۔ یہاں تک کہ جب آپ محسوس کرتے کہ خود آپ کے سامنے لوگ زبونی و پستی کا احساس کر رہے ہیں، تو آپ اُن کا یہ احساس ختم کر دیتے تھے۔

ایک آدمی رسولِ اکرم کے پاس آیا۔ جب آنحضرت پر اُسکی نظر پڑی، اگرچہ رسولِ اکرم خود جاہ و حشم اور رعب و دبدبے کا اظہار نہیں کرتے تھے، اسکے باوجود وہ شخص آپ کی ہیبت، عظمت اور شخصیت سے شدید متاثر ہوا اور جب اس نے آپ سے بات کرنا چاہی تو اسکی زبان لڑکھڑانے

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۹

۲۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۰

لگی۔ جوں ہی ایسا ہوا رسولِ اکرم اپنی جگہ سے اٹھے' اس شخص کو اپنے سینے سے لگایا اور گرم جوشی کے ساتھ اسے اپنی آغوش میں بھینچا۔ اسکے بعد فرمایا: اے دوست! تمہاری زبان کیوں گنگ ہو گئی ہے؟ کیا مجھ سے ڈر گئے ہو؟ کیوں ڈرے ہو؟ میں کوئی خوف ناک آدمی تو نہیں ہوں' میں تو اس عورت کا بیٹا ہوں جو اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہتی تھی۔ میں تو تمہارے بھائیوں کی طرح کا ایک بھائی ہوں۔ ڈرو نہیں۔ مجھ سے ٹھیک طرح سے بات کرو' مجھ سے مرعوب نہ ہو۔

اسلام نے ایسی مرعوبیتوں کی مخالفت کی ہے۔

جی ہاں' اسلام ایسا ہی دین ہے' جو آزادی کے صرف نعرے ہی نہیں لگاتا' بلکہ اس نے پستی اور کمزوری کے عوامل (factors) کے خلاف جدوجہد بھی کی ہے اور اسکے مقابل آزادی' قدرت اور طاقت کے عوامل کی تقویت کی ہے۔ ان سب باتوں کا آغاز آج کی رات کی مانند ہی ایک رات سے ہوا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک کوہِ حرا سے اتر کر آئی۔ کچھ دیر بعد آپ کو حکم دیا گیا: يَـاأَيُّهَـا الْـمُـدَّثِّـرُ قُـمْ فَـأَنْـذِرْ وَرَبَّـكَ فَـكَـبِّـرْ اٹھ کھڑے ہوں' لوگوں کو خطرے سے خبردار کریں۔

جس سب سے پہلی بات کا آپ نے اعلان فرمایا اور اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا' وہ اللہ کی عظمت تھی۔ لوگوں سے عظمتِ خدا کا ذکر کریں' انہیں اللہ کی عظمت سمجھائیں۔ جب وہ اللہ کی عظمت کو سمجھ جائیں گے تو غیرِ خدا کو چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا آپ لوگوں کے درمیان آئے اور کہا: **قولوا لا الٰہ اِلّا للّٰہ تفلحوا.**

یا اللہ! ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں' ہم تجھے تیری مقدس ذات کے حق کا واسطہ دیتے ہیں' کہ ہمیں اُن انوار سے بہرہ مند فرما جو اسی جیسی ایک رات میں عالمِ غیب سے ضیا پاش ہوئے تھے۔

یا اللہ ہمیں حقائقِ دین (اسلام) سے آشنا فرما۔ (۱)

✿✿

آخر میں چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہو سکی۔

اسلام کی آزادی بخش تحریک ☆

(۲)

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ۔"(۱)

ہمارے زمانے میں آزادی کے لفظ نے انتہائی بلند، عظیم اور مقدس مقام پالیا ہے، اور اسے غیر معمولی احترام حاصل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اپنی شخصیت کو منوانا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو آزادی کا حامی و طرفدار قرار دیتا ہے۔ حتیٰ بعض گفتگوؤں میں دیکھتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ آزادی اللہ کی نعمتوں اور عطیوں میں سے عظیم ترین اور اعلیٰ ترین نعمت ہے۔

آزادی کی اہمیت

اس مقام پر ایک سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا آزادی درحقیقت اور فی الواقع اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی انسان اسے دیتا ہے اور اسے بلند ترین نعمت اور اپنی مقدس ترین متاع

☆ یہ تقریر ۱۹۶۹ء میں حسینیہ ارشاد میں کی گئی۔

۱۔ اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے۔ (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۷)

قرار دیتا ہے؟

کیا آزادی اس قدر اہم ہے؟

ہم عرض کریں کہ ایک اعتبار سے اگر ہم آزادی کا جائزہ لیتے ہیں' تو جس قدر اہمیت انہوں نے اسے دی ہے وہ اس کا استحقاق نہیں رکھتی۔ وہ اسکے لئے بے حساب اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن جب ہم دوسرے اعتبار سے دیکھتے ہیں' تو وہ حق رکھتے ہیں کہ آزادی کو اس قدر بلند مقام پر لے جائیں۔

رہا پہلا نکتہ نظر' جس کے لحاظ سے آزادی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اسکے مطابق آزادی کا مطلب اور اسکی حقیقت اسکے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ انسانی فکر و عمل کے راستے میں کوئی دیوار اور رکاوٹ حائل نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے اور اسے آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہئے۔ یعنی دوسرے افراد اسکی فکری و عملی شعاعوں کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ یہاں تک کہ اس سے بھی اوپر اسکے فکر و عمل کو اپنی خدمت کے لئے استعمال نہ کریں۔ لیکن خود آزادی کی اصلیت جو فلاسفہ نے بیان کی ہے' اسکے معنی انسانی فکر و عمل کی شعاعوں کے راستے میں کسی قید' رکاوٹ اور دیوار کا حائل نہ ہونا ہے۔ لہٰذا جب آزادی کا مطلب کسی رکاوٹ کا نہ ہونا ہے' تو پھر وہ اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ ایک موجود کو جس قدر منفی عوامل کی ضرورت ہوتی ہے اس سے زیادہ مثبت عوامل کی احتیاج ہوتی ہے۔

ہم ایک مثال عرض کرتے ہیں: ایک پھول اپنی ترقی اور جلوہ نمائی کے لئے اپنے کمال کا سفر طے کرتا ہے۔ تاکہ اس بلندی تک پہنچے جو اسکے لئے مقدر کی گئی ہے۔ اس دوران اُسے کئی مثبت عوامل کی ضرورت ہوتی ہے' اور اُسے بعض منفی عوامل درپیش ہوتے ہیں۔ اُسے مٹی' پانی' ہوا' حرارت' روشنی اور باغبان وغیرہ کی مدد درکار ہوتی ہے' اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسکے راستے میں کوئی رکاوٹ اور مانع نہ ہو۔

مثلاً ایک پھول (کا پودا) جسے اپنی جڑوں کے پھیلاؤ کے لئے ایک میٹر زمین اور ایک میٹر گہری مٹی درکار ہو۔ اگر اسے ایک چھوٹے گملے میں لگا دیا جائے اور اس کی نشو و نما کے راستے میں

دیوار حائل کردی جائے' یا اسکے اوپر ایک چھت اور رکاوٹ ڈال دی جائے' تو یہ اس پھول کی جلوہ نمائی میں رکاوٹ ہوگی۔ پھول کو ان مثبت عوامل کی بھی ضرورت ہے اور رکاوٹ کے نہ ہونے کی بھی' یعنی ان منفی عوامل کے نہ ہونے کی بھی۔

جب انسان پھول کے بارے میں سوچتا ہے تو سب سے پہلے اسکے مثبت عوامل کے بارے میں سوچتا ہے' اسکے لئے مٹی اور پانی کے بارے میں سوچتا ہے' اسکے لئے روشنی اور ہوا کے بارے میں سوچتا ہے' باغبان کے بارے میں غور کرتا ہے' جو مواد اسکی تقویت کے لئے ضروری ہوتا ہے اسکے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن اسکی راہ میں کوئی حائل اور رکاوٹ نہ ہو' اس بارے میں زیادہ غور نہیں کرتا۔ یعنی اس مسئلے کی اتنی اہمیت کا قائل نہیں ہوتا۔ پس اگر اس نکتۂ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آزادی پھول کے لئے ایک نعمت ہے' یہ انسان کے لئے بھی ایک نعمت ہے۔ البتہ یہ پھول یا انسان کی زندگی کے مثبت عوامل سے بعد کے مراحل کی نعمت ہے۔

لیکن جب ہم ایک اور نکتۂ نظر سے دیکھتے ہیں' تو نظر آتا ہے کہ انسان آزادی کی اس قدر اہمیت کا قائل ہونے کا حق رکھتا تھا اور اسے یہ حق حاصل ہے۔ یہ حق اس پہلو سے ہے کہ آزادی وہ نعمت ہے جو انسان کو ہر دوسری نعمت سے کم میسر رہی ہے۔ یعنی انسان کی ترقی وتکامل کے مثبت عوامل' اس منفی عامل کی نسبت جس کی الٹ یعنی رکاوٹ موجود رہی ہے' ہمیشہ نسبتاً زیادہ موجود رہے ہیں اور موجود ہیں۔ اور انسان کو جو نعمت بھی کمتر نصیب ہوئی ہو اور کمتر میسر آئی ہو وہ اسکی زیادہ قدر وقیمت اور اہمیت کا قائل ہوتا ہے۔ دنیا' جو آزادی کی اس قدر اہمیت کی قائل ہے اور اس نے اسے اتنا بلند مقام دے رکھا ہے' اسکی وجہ یہ ہے کہ آزادی مخالف عامل زیادہ رہا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایک نیم عامیانہ شعر معروف ہے' کہا جاتا ہے:

بہشت آنجاست کآزاری نباشد
کسی را باکسی کاری نباشد

''بہشت وہ ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو اور کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ ہو۔''

ہم سب یہ کہتے ہیں اور ہم سب قبول بھی کرتے ہیں' حالانکہ اگر انسان سوچے تو یہ بہشت

نہیں۔ یہ کیا بہشت ہوئی کہ ہم ایسی جگہ ہوں جس کی واحد خصوصیت یہ ہو کہ وہاں کوئی تکلیف نہ ہو، کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہ ہو، ہر کوئی صرف اپنے لئے جیتا ہو۔ یہ چیز انسان کے لئے کوئی خوشی اور سعادت نہیں۔ بہشت وہ ہے جہاں انسان ایک دوسرے کے ساتھ ہوں اور ایک دوسرے سے اُنس رکھتے ہوں۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

"اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ."

"آج کے دن صاحبانِ تقویٰ کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔" (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۶۷)

دوسری آیت کہتی ہے:

"عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ."

"آمنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوئے۔" (سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۴۴)

بہشت اس وقت بہشت ہے جب وہاں انسان ایک دوسرے سے محبت وانس رکھتے ہوں، آپس میں بھائی ہوں، ان میں بھائی چارہ، درگزر اور ایک دوسرے کے لئے (نیک) جذبات پائے جاتے ہوں۔ وگرنہ ایسی جگہ جہاں انسان ایک دوسرے سے لاتعلق ہوں اور ایک دوسرے سے انہیں زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ حاصل ہوتا ہو کہ انہیں ایک دوسرے سے تکلیف نہیں پہنچتی، اگرچہ وہ جہنم تو نہیں ہوگی لیکن بہشت بھی نہیں ہے۔ اسے اعراف کہنا چاہئے، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ۔

انسان کے ایسی جگہ کو جہاں آزار نہ ہو اور کوئی ایک دوسرے سے سروکار نہ رکھے، بہشت کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک دوسرے کی طرف سے بہت زیادہ تکالیف اٹھائی ہیں۔ لہٰذا اس (تکلیف و آزار) کے نہ ہونے ہی کو اس نے بہت کچھ سمجھ لیا ہے۔

انسان کے بارے میں ملائکہ کی رائے

جب ہم قرآنِ مجید کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ انسان کے ایک دوسرے کو اذیت و آزار پہنچانے، معاشرے میں فتنہ برپا کرنے، ناحق خون بہانے، ناحق مال لے جانے اور ایک

دوسرے پر ظلم کرنے کا معاملہ وہی ہے جس کے بارے میں ابتدائے خلقت میں فرشتوں نے اعتراض کیا تھا۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ مٹی سے انسان پیدا کروں' اسکی سرشت یہ ہے اور خوبی وبدی کے لحاظ سے اس میں یہ یہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں' اس پر فرشتوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا۔ سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰)

خدایا! کیا تو ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے جس کے افراد خود ایک دوسرے کے لئے باعث آزار اور باہم دشمن ہوں گے۔ ایک دوسرے کا امن وامان' آزادی اور سکھ چھین لیں گے؟

آزادی کا مسئلہ' تکلیف کا نہ ہونا اور انسان کا ایک دوسرے سے آزار اور اذیت نہ پانا' اس وجہ سے غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ انسان کو یہ کم ہی نصیب رہا ہے۔

اب کیوں کم نصیب رہا ہے؟

کیا خلقت کی بنیاد میں اسکے لئے کوئی علاج نہ تھا؟

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اس طرح کا کیوں پیدا کیا ہے کہ انسان ایک دوسرے کو اذیت دیتے ہیں۔ افرادِ بشر کے لئے سب سے بڑی مصیبت خود ان کی اپنی طرف سے ہے' دوسروں اور دوسری اشیا کی طرف سے نہیں۔ انسانوں کو جو اذیت و آزار خود انسانوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑتی ہیں اور جو نقصانات برداشت کرنا پڑتے ہیں' وہ حیوانوں کے ہاتھوں نہیں اٹھانا پڑے نباتات کی طرف سے نہیں پہنچے' جمادات کی طرف سے نہیں پہنچے' طوفانوں' سیلابوں اور زلزلوں کے ذریعے بھی نہیں پہنچے' وباؤں' طاعونوں اور سرطانوں کے ذریعے بھی نہیں پہنچے' زمین و آسمان کی طرف سے نہیں پہنچے' جنات کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچے اور کسی اور کی طرف سے بھی نہیں پہنچے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟

کیا اسکی تخلیق کے موقع پر اس کا کوئی حل نہیں رکھا جا سکتا تھا؟

کیا اس لحاظ سے کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو انسان' انسان ہو یعنی یہی اپنے فعل میں مختار اور

آزاد موجود ہو اور یا پھر انسان نہ ہو اور اگر انسان نہ ہو' تو یا تو فرشتہ ہو' جیسے وہ پیدا کیے گئے ہیں' یا حیوان ہو' ویسے ہی جیسے وہ خلق کیے گئے ہیں' یا نبات ہو اور یا پھر جماد ہو۔

بنیادی طور پر اگر انسان چاہے کہ اسی طرح کا کامل و جامع نمونہ ہو' بس فرق یہ ہو کہ اپنے کام میں آزاد اور مختار ہو' تو اس بات کا امکان نہ تھا اور عقلاً محال تھا۔ جب وہ اپنے کام میں مختار اور آزاد ہو' تو یہیں سے افراد کے ایک دوسرے کو اذیت پہنچانے اور ایک دوسرے کے حقوق پر تجاوز کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں ہم زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس طرح ہم اپنے دیگر موضوعات پر بات نہیں کر سکیں گے۔

کیا علم آزادی مہیا کر سکتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ کیا اسکے لئے کوئی اور چارہ کار نہ تھا اور نہیں ہے؟

(اسکے جواب میں) ہم کہیں گے کہ خلقت کو اصولاً ایسا ہی ہونا چاہئے۔

(پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ) کیا تکامل و تربیت کے ذریعے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکتا؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ تربیت کس چیز سے ہوگی؟ اگر اس سے مراد یہ ہو کہ تربیت علم کے ذریعے ہوگی۔ یعنی انسان عالم ہو جائے تاکہ اپنے لئے آزادی مہیا کر سکے' اسے حاصل کر سکے۔ (اسی طرح) جیسے انسان کے پاس جب علم آ گیا تو وہ وباؤں' خناق' تپ دق' یہاں تک کہ سرطان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس کا صرف علم حاصل کر لینا اور معاملے کی حقیقت جان لینا اس امر کے لئے کافی ہوگا کہ وہ اپنے اس دشمن کو شکست دے سکے۔

لیکن افسوسناک بات ہے کہ علم انسان کے اس دشمن (یعنی انسان کے خود اپنے دشمن ہونے) سے مقابلے میں عاجز ہے۔ انسان جتنا بھی صاحب علم ہو جائے' علم انسانوں کو ایک دوسرے پر جارحیت سے نہیں روک سکتا۔ اسکی دلیل بہت واضح ہے۔ جو شخص دوسروں کے حقوق اور آزادی پر حملہ کرتا ہے' اسکی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ جانتا نہیں کہ اسے اس پر چڑھائی نہیں کرنا چاہئے یا ظلم و زیادتی ایک برا عمل ہے' بلکہ وہ اپنے مفاد اور منافع کے لئے ایسا کرتا ہے۔ جب وہ

اپنے پاس طاقت دیکھتا ہے' اور اس میں مفاد پرستی اور طاقت دونوں اکھٹے ہو جاتے ہیں' تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے چل پڑتا ہے' وہ اس مقصد کے لئے علم سے کام لیتا ہے۔ علم' نہ صرف انسانوں کو دوسروں کی آزادی کے خلاف جارحیت سے نہیں روکتا' بلکہ کبھی کبھی انسانوں کو دوسروں پر جارحیت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لہٰذا صرف علم ہرگز انسانی قدر کا حامل نہیں ہو سکتا۔ جب وہ کسی فرد کے ذاتی مفاد کے کام آ رہا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ انسانیت کے لئے انسانی قدر کا حامل ہو۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ علم و دانش کے پہلو سے بشریت ایسے مقام پر جا پہنچی ہے' جو واقعاً انسانوں کے لئے تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے۔ لیکن انسانیت اور انسانی اقدار کے حوالے سے اس نے کوئی معمولی سا اثر بھی اسکے حالات پر مرتب نہیں کیا۔ مثلاً علم کے تعجب خیز پہلو کی ایک مثال انسان کا چاند پر جا پہنچنا ہے' جو غیر معمولی اور بڑا کام ہے۔ لیکن اگر ایک دوسرا مسئلہ پیش نظر رکھیں اور بشریت و انسانیت کے حوالے سے ان دونوں کا موازنہ کریں' دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر ہم (اپنی دینی طلبا کی اصطلاح میں) کہیں کہ ان دونوں کاموں میں سے کس کا ثواب زیادہ ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کہیں کہ ان دونوں میں سے انسانیت کے لئے کس کام کی اہمیت زیادہ ہے؟ وہ انسان جو چاند پر قدم رکھ رہا ہے' کیا انسانیت کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ چاند پر جائے' یا وہاں نہ جائے البتہ ویتنام اور فلسطین سے نکل جائے؟ (ظاہر ہے کہ دوسرا کام زیادہ اہمیت کا حامل ہے) لیکن وہ چاند پر جاتا ہے تاکہ ویتنام اور فلسطین میں زیادہ ظلم کرے' آزادی چھینے اور جارحیت کا مرتکب ہو۔

لہٰذا علم کے ذریعے بھی کوئی کام بننے والا نہیں۔

دوسرا پہلو جس کی راہ میں یورپ کے دانشوروں نے بہت کوششیں کی ہیں' اور نسبتاً اچھے نتائج بھی حاصل کئے ہیں' وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی آزادی سلب کی جا چکی ہے' ان کے شعور اور احساسات کی سطح کو بلند کیا جائے۔ یہ اپنے مقام پر حقوق اور آزادیوں کے حصول کا ایک راستہ ہے' کہ لوگوں کے فکر و شعور کی سطح کو بلند کیا جائے' لوگوں کی غیرت کو بیدار کیا جائے۔ یہ وہی راستہ ہے جس کے بارے میں گزشتہ نشست میں ہم نے عرض کیا تھا۔ اسلام بھی اسے شرط کافی کے طور پر

نہیں' بلکہ ایک شرط لازم کے طور پر قبول کرتا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔ انصاف کی بات ہے کہ اس لحاظ سے آج کا انسان گزشتہ صدیوں کے انسان سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ آج کے انسان نے اپنے لئے آزادی کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے۔ وہ اپنی آزادی کے لئے کوشش' بھاگ دوڑ اور جانبازی سے کام لے رہا ہے' اور کیونکہ اس نے احساس کر لیا ہے کہ آزادی آسانی سے حاصل نہیں کی جا سکتی' لہٰذا طاقت پیدا کرنی چاہئے' اور طاقت کیونکہ اکیلے پیدا نہیں کی جا سکتی' اس لئے وحدت واتحاد پیدا کرنا چاہئے۔ صرف اتحاد بھی کافی نہیں' بلکہ اسے تنظیم کی شکل دینے کی ضرورت ہے' اور صرف تنظیم بھی کافی نہیں' پروگرام اور آئیڈیالوجی بھی درکار ہے۔ انسان نے یہ تمام اقدامات کئے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود نتیجہ حاصل نہیں کر پایا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسکی وجہ ہے۔

بوذرجمہر اور نوشیرواں کا واقعہ

بوذرجمہر اور اسکے ہم عصر بادشاہ نوشیرواں کا ایک معروف واقعہ ہے۔ بوذرجمہر بادشاہ کو ہمیشہ سحر خیزی کی نصیحت کیا کرتا تھا اور خود بھی صبح جلدی آ جایا کرتا تھا۔ بادشاہ کو اس کا اتنا جلدی آنا پسند نہ تھا۔ آخر کار اس نے سوچا کہ میں ایک ایسی تدبیر کرتا ہوں کہ پھر یہ تنگ نہ کرے۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ صبح سویرے جب وہ اپنے گھر سے نکلے اور چلنے لگے' تو تم جانا اور اس کا تمام لباس اور جو کچھ اسکے پاس ہو چھین لینا' تاکہ پھر وہ صبح اتنی جلدی گھر سے نہ نکلے۔ بادشاہ کے آدمیوں نے ایسا ہی کیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا باقی تھا۔ انہوں نے راستے میں اسے پکڑ لیا۔ اسے ننگا کر دیا۔ اسکے پیسے اور لباس چھین کر چھوڑ دیا۔ وہ مجبوراً دوسرا لباس پہننے اور تیار ہو کر دوبارہ آنے کے لئے واپس گھر گیا۔ اس روز' وہ دوسرے دنوں کی نسبت دیر سے بادشاہ کے پاس آیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تم آج دیر سے کیوں آئے ہو۔ اس نے کہا: آج مجھے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ (بادشاہ نے اس سے پوچھا) کیسا حادثہ؟ (اس نے جواب دیا) مجھے ایک چور نے پکڑ لیا تھا' وہ راستے میں حائل ہو گیا تھا اور اس نے میرے ساتھ ایسا اور ویسا سلوک کیا۔ میں واپس گھر گیا اور یوں ایک گھنٹہ تاخیر ہو گئی۔ بادشاہ نے کہا: جناب عالی تو فرماتے تھے کہ صبح جلدی اٹھا کرو تاکہ

کامیاب رہو پھر یہ کیسے ہوا؟ بوذرجمہر نے کہا: چور مجھ سے بھی پہلے اٹھنے والا تھا۔

بشریت ایسی ہی ہے۔ آپ اگر حساب کریں، تو دیکھیں گے کہ جس انسان کی آزادی سلب ہو چکی ہے، اس نے اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے جو کچھ حاصل کیا ہے، آزادی چھیننے والے انسان نے وہی کچھ سو گنا زیادہ طاقت کے ساتھ حاصل کر لیا ہے۔ اگر تنظیم اور ڈھانچے کو سامنے رکھیں تو ان کی تنظیم کہیں زیادہ ہے، اگر وحدت واتحاد کو دیکھیں تو ان کا اتحاد کہیں زیادہ قوی ہے، اگر وسائل کو سامنے رکھیں تو ان کے وسائل کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ دنیا کی موجودہ سب سے بڑی قومی تنظیموں اور جماعتوں کو ان کے تمام تر ڈھانچے کے ساتھ سامنے رکھیں، تو دیکھیں گے کہ وہ سی آئی اے کی جاسوسی مشینری یا انٹیلی جنس سروس کے مقابلے میں صفر ہیں اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ تمام قوتیں اور وسائل، حتیٰ ذرائع ابلاغ بھی اسکے ہاتھ میں ہیں۔ یوں انسان کو نظر آتا ہے کہ جس انسان کی آزادی چھینی گئی ہے اور جو اسے چھیننے والا ہے، اسکے درمیان فاصلے کی وہی نسبت ہے جو قدیم زمانے میں تھی۔ بلکہ اس سے سو گنا زیادہ ہے۔ ایک کام اور بھی ہوا ہے جو اسکے علاوہ ہے۔

آج کے انسان میں منافقت کی زیادتی

منافقت کا شمار ان چیزوں میں ہوتا ہے جو انسان سے مختص ہیں۔ حیوانات کے مقابل انسان کے کچھ امتیازات ہیں۔ انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ ناطق ہونا انسان کے اختصاصات میں سے ایک ہے۔ انسان کے بہت سے امتیازات ہیں۔ حیوانات کے مقابل انسان کی خصوصیات میں سے ایک منافقت ہے۔ عوامی اصطلاح میں منافقت سے مراد ہے: کہنا کچھ کرنا کچھ، مکاری۔ یہ انسان کے خواص میں سے ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اِنّی لا اَخافُ عَلیٰ اُمَّتی مُؤمِناً وَ لا مُشرِکاً ...... وَلٰکِنْ اَخافُ عَلَیْکُمْ کُلَّ مُنافِقِ الْجَنانِ عالِمِ اللِّسانِ۔"(۱)

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۲۷

فرمایا: مجھے اسلام کے بارے میں مومنوں سے ڈر نہیں' کھلے کافروں سے بھی مجھے اسلام کے بارے میں کوئی خوف نہیں' البتہ اسلام کے بارے میں' میں منافق سے ڈرتا ہوں۔

نفاق ہمارے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچا ہوا ہے۔

ہابز کا قول

سترہویں صدی کے یورپ کے معروف فلاسفہ میں سے ایک انگریز فلسفی "ہابز" ہے۔ اُس کا ایک سیاسی فلسفہ ہے۔ اُس کی کتابیں' فارسی میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ وہ معاشرتی حیوانات اور انسان جو خود ایک معاشرتی موجود ہے کے درمیان موازنہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اجتماعی طور پر زندگی بسر کرنے والے حیوانات' مثلاً شہد کی مکھی اور چیونٹیوں کے معاشرے کا ایک خاص نظام کیوں ہے اور ان کے مابین اختلاف' جنگ اور خونریزی کیوں نہیں ہے؟ اسکے برخلاف انسان کے یہاں یہ سب کچھ ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ انسانوں اور اجتماعی حیوانات میں کئی فرق ہیں۔ ان میں سے ایک فرق جو انسان اور اجتماعی حیوانات کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے اُن کا معاشرہ منظم رہتا ہے اور انسان کے معاشرے میں فساد واقع ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ انسانوں کے مابین رقابت پائی جاتی ہے اور اُن کے درمیان رقابت نہیں ہوتی۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ اُن کے یہاں انفرادی اور اجتماعی بھلائی اور مفاد آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور کبھی یہ نہیں ہوتا کہ انفرادی مفاد کسی اور رُخ پر ہو اور اجتماعی مفاد کسی اور رُخ پر' لیکن انسان کی زندگی کی مشکل یہ ہے کہ کبھی فرد کا فائدہ اور منافع ایک رُخ پر اور معاشرے کا مفاد دوسرے رُخ پر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل اور صلاحیت کی بنا پر نقص کا احساس کرتا ہے اور بلند تر کمال کی جستجو میں رہتا ہے۔ لیکن اجتماعی حیوان کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کو اپنے کمال کی انتہا سمجھتا ہے۔

ہم فی الحال اس بات پر بحث نہیں کرتے کہ اس نے جو باتیں کی ہیں وہ بنیادی طور پر ایک ہی مسئلے کی طرف لوٹ جاتی ہیں یا نہیں' درست ہیں یا درست نہیں۔ البتہ اس نے جو چوتھا فرق بیان کیا ہے' وہ ہمارا استدلال ہے۔

وہ کہتا ہے کہ چوتھا فرق جو انسانی معاشرے میں فساد کا سبب بنا ہے اور حیوانات کے اجتماع میں یہ فساد موجود نہیں ہے' وہ زبان ہے' تکلم اور گفتگو کی طاقت ہے۔ اگر کہیں کہ یہ انسان میں درحقیقت ایک کمال ہے؟ (واقعاً انسان کے لئے یہ ایک کمال بھی ہے) تو درحقیقت یہ ایک کمال ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کی بدبختی کا سرچشمہ بھی اس کا یہی کمال ہے۔ کیونکہ انسان کے پاس زبان ہے' لہٰذا وہ اپنی زبان سے گفتگو کرتا ہے' حقائق کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی حقائق کو الٹ کر دکھا سکتا ہے اور اپنا مفہوم کسی اور بات کے پردے میں بیان کر سکتا ہے۔

''ہابز'' اسے ایک بنیادی عامل قرار دیتا ہے۔ اور سچ بھی کہتا ہے۔

احقاقِ حقوق اور آزادیوں کے حوالے سے عمومی شعور کی سطح میں جو اضافہ ہوا ہے (جس کے متعلق ہم نے عرض کیا کہ آزادی سلب کرنے والے طبقے نے بھی شعور' فکر' تدبر اور تنظیم کے لحاظ سے ترقی کی ہے) اسکے متوازی ایک اور بات بھی پیدا ہوئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں منافقت اور دورُخہ پن' حقائق کو الٹ پھیر کر کے دکھانے' حقیقت کو دگرگوں کرنے' ہر چیز کو کوئی اور نام دینے اور بہت اچھے پردے میں رکھ کر پیش کرنے کا اس قدر شدید رواج ہو گیا ہے' جس نے سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ حالیہ صدیوں کے مظاہر میں سے ہے۔ گزشتہ زمانے میں ایسا نہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی' یا مسلم بن عقبہ اہلِ مدینہ کے پاس آتا تھا اور ان سے کہتا تھا: مدینے والو! یزید کی بندگی اور غلامی قبول کرتے ہوئے اُس کی بیعت کرو۔ وہ یہ نہیں کہا کرتا تھا کہ میں تمہیں آزادی دلانے آیا ہوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں آیا ہی تمہیں غلام بنانے کے لئے ہوں۔

حجاج بن یوسف ثقفی وہی کچھ کہا کرتا تھا جو اسکے دل میں ہوتا تھا۔ لیکن نکسن' اسٹالن یا خروشیف' حجاج بن یوسف اور مسلم بن عقبہ ہی کی طرح ہیں' فرق صرف یہ ہے کہ وہ کام تو انہی جیسا کرتے ہیں' کام تو چنگیز والا کرتے ہیں' لیکن لہجہ عیسیٰ اور محمد والا اختیار کرتے ہیں۔

واقعاً عجیب بات ہے۔ یہ انسانی معاشرے کا ایک خطرناک مظہر ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک مذہبی گروہ' اصطلاح میں جسے ایک دینی مشن کہتے ہیں' افریقہ روانہ ہوتا ہے' تا کہ وہ دینِ مسیح کا مبشر بنے' چند سال اسکے کام کرنے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ وہ

وفد اور مشن دراصل استعمار کا ایجنٹ تھا' وہ اس لئے آیا تھا تا کہ وہاں استعمار کو پروان چڑھائے۔ اگر کسی نے کتاب "التبشیر والاستعمار" پڑھی ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔

ایک مسلم اخبار نویس نے لکھا تھا کہ فلاں افریقی ملک میں چند سال قبل جب عیسائی مبشرین اور عیسائی افراد آئے تھے' تو ان کے پاس انجیل تھی' اور لوگوں کے پاس زمین۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ ایسا کیسے ہوا کہ چند سال بعد معاملہ الٹ ہو گیا۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ لوگوں کے پاس انجیل ہے اور مبشرین اور عیسائی افراد کے پاس زمینیں۔ معلوم ہوا کہ وہ انجیل کے بہانے زمینوں پر قبضہ جمانے آئے تھے۔ حقوقِ انسانی کے چارٹر کے نام پر حقوقِ انسانی پامال کیے جاتے ہیں۔ ثقافتی مراکز' اشاعت کتب اور انسانی تہذیب کی خدمت کے نام پر انسان سے خیانت کی جاتی ہے۔ صحت کے اداروں کے نام پر (آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائی مسلسل ہسپتال بنا رہے ہیں) لوگوں کی روحوں پر ڈاکا ڈالنے آتے ہیں' لوگوں کے افکار کا استعمار کرنے اور انہیں مسموم بنانے کے لئے آتے ہیں۔ آپ کسی بھی کارِ خیر کو دیکھ لیجئے' آپ کو اوپر کچھ اور نیچے کچھ نظر آئے گا۔ یہ جو فروشی اور گندم نمائی آج کے انسانی معاشرے کی ایک بڑی مصیبت ہے۔

حقیقی تحریکیں انبیا اور ان کے پیروکاروں کی ہیں

لہٰذا عامۃ الناس کے شعور کی سطح کا بلند ہونا بھی کافی نہیں ہے۔ واقعاً جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے' تو آہستہ آہستہ اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر حقیقی انسانی تحریک جس میں صداقت پائی جاتی ہے' یا انبیا کی طرف سے ہے یا ان کے پیروکاروں کی طرف سے۔ جس کسی تحریک میں انبیا شریک نہ تھے اس میں حقیقت بھی موجود نہیں تھی۔

کچھ عرصہ پہلے میں تاریخ "البرمالہ" اور نہرو کی کتاب "تاریخِ عالم پر ایک نظر" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ان دونوں ہی میں' میں نے ایک بات دیکھی' جو میرے لئے بڑی تعجب خیز تھی۔ میں امریکہ میں تنسیخ غلامی کے مسئلے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ امریکہ میں جب غلامی کو منسوخ کیا گیا' تو اس کا عامل فقط انسانی تھا۔ یعنی ان کا جذبۂ محرکہ انسانی تھا اور انہوں

نے تکریم انسانی کے پیش نظر ایسا کیا تھا۔ لیکن بعد میں' میں نے دیکھا کہ معاملہ تو درحقیقت کچھ اور تھا۔ شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے مابین ایک تضاد تھا۔ جنوبی امریکہ کا مفاد اس میں تھا کہ غلام ہوں' لیکن شمالی امریکہ کے اقتصادی مفاد کا تقاضا تھا کہ غلام نہ ہوں اور غلامی کو منسوخ کر دیا جائے۔ یہ جنگ اور یہ تنسیخ بھی مفادات کے تحت تھی۔ کیونکہ یہ کام حقیقت وصداقت کی بنیاد پر نہیں ہوا' بلکہ یہ ان کا ایک ہتھکنڈا تھا۔ لہٰذا اب بھی انہی غلاموں کی اولاد' امریکہ میں غلام کہے جانے کے بغیر' غلاموں سے بدتر زندگی گزار رہی ہے۔ یہی کہ اب جو کالے ہیں اور اب بھی امریکہ (جنہیں) قبول نہیں کرتا' یہ اس لئے ہے کہ معاملہ گندم نمائی اور جو فروشی والا تھا۔

آپ ان دونوں (یعنی) حقوقِ نسواں اور آزادیٔ نسواں کے بارے میں دیکھ رہے ہیں اور سنا ہوگا کہ اس معاملے میں یورپ والے پیش قدم نکلے ہیں۔ وہ عورت کے لئے مالی حقوق کے قائل ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ جب انسان صحیح طور پر اس مسئلے کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ اس میں بھی دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کیا؟ ول ڈیورینٹ اپنی کتاب "لذاتِ فلسفہ" (۱) میں لکھتا ہے کہ جب تحریکِ نسواں کے آغاز میں (جو انگلستان سے شروع ہوئی اور خاص طور پر عورتوں کو اقتصادی آزادی دی گئی تو) کیا معاملہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ تقریباً ایک صدی پہلے یورپی دنیا میں عورت کو کسی طرح کی ملکیت کا حق حاصل نہ تھا۔ یعنی عورت کے کام کو اسکے شوہر کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اگر عورت کوئی کام کرتی اور زحمت اٹھاتی' تو اسکی اجرت اسکے شوہر کو دی جاتی تھی۔ عورت کو سرے سے خودمختاری حاصل ہی نہ تھی۔ اگر کبھی وراثت میں اسے کوئی چیز مل بھی جاتی' تب بھی اس کا اختیار اسکے شوہر کے ہاتھ میں ہوتا۔

انہوں نے عورت کو اقتصادی آزادی کیوں دے دی؟

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جب بڑے بڑے کارخانے وجود میں آئے اور شہروں کو کاریگروں اور مزدوروں کی ضرورت پڑی۔ خصوصاً ایسے مزدوروں کی ضرورت

۱۔ The Pleasures of Philosophy اس کتاب کا اردو ترجمہ نشاطِ فلسفہ کے نام سے دستیاب ہے۔

پڑی جو کم مزدوری لیں' تو ایسے مزدور انہیں عورتوں اور بچوں میں مل جاتے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ مرد اپنی عورتوں اور بچوں کو کارخانوں میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ اس طرح ان کی زندگی اور گھر کا نظام بگڑتا تھا۔ لہٰذا یہ صورتحال دیکھ کر انہوں نے قانون بنایا کہ آئندہ سے عورتوں اور بچوں کو اقتصادی آزادی حاصل ہوگی' باپوں کو اپنے بچوں اور شوہروں کو اپنی بیویوں کو روکنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح انہوں نے عورت کو اقتصادی آزادی دے دی۔

یورپی دنیا نے عورت کو کس لئے اقتصادی آزادی دی؟

کیا خود عورت کی خاطر؟

کیا اُن کا دل عورت کی حالت پر کڑھتا تھا' یا وہ اپنے لئے ایسا کر رہے تھے اور انہیں سستے مزدوروں کی ضرورت تھی؟

یہی وجہ ہے کہ انسان کو انسان کے شر سے بچانا' اور اُسے حقیقی آزادی دینا' اس سے اذیت کا خاتمہ کر دینا' جیسے مزاجِ خلقت میں ممکن نہ تھا' یعنی یہ خلقتِ بشر کے خلاف تھا' اسی طرح یہ علم کے بس کی بات بھی نہیں' تربیت کے دائرۂ اختیار سے بھی باہر کی بات ہے اور لوگوں کی (شعوری) سطح بلند کر کے بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ایک قوت کے سوا کوئی اور قوت (کارگر) نہیں۔ وہ قوت انسان کو دیگر انسانوں کے مقابلے میں بھی امن و تحفظ دیتی ہے اور اسکے لئے حقیقی جنت ایجاد کرتی ہے۔ صرف ایک ایسی جنت نہیں جہاں وہ ایک دوسرے کو اذیت و آزار نہ پہنچائیں۔ بلکہ اس سے بالاتر ایک ایسی جنت جس میں انسانیت' احساسات' وحدت' اتحاد اور حقیقی اخوت ہو۔ وہی کام جو دنیا میں صرف انبیا نے کیا ہے' ایسا کام دنیا میں کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ پردے ہٹا دینے چاہئیں' تاکہ معلوم ہو کہ جو کچھ وجدانِ دینی سے ہٹ کر کسی اور طرف سے آیا ہے' اُسکی کیا کیفیت ہے۔ ہمارے سعدیؔ نے کیا خوب کہا ہے:

شنیدم گو سفندی را بزرگی رہانید از دہان و چنگ گرگی
شبانگہ کارد بر حلقش بمالید روان گوسفند ازوی بنالید

کہ از چنگال گرگم در ربودی بدیدم عاقبت گرگم تو بودی

''میں نے سنا ہے کہ ایک بزرگ نے ایک بھیڑ کو کسی بھیڑیے کے منہ اور چنگل سے چھڑوایا۔ پھر رات کے وقت اس نے اسکے حلق پر چھری پھیر دی اور بھیڑ کی روح اس سے فریاد کرنے لگی کہ تو نے مجھے بھیڑیے کے چنگل سے چھین لیا اور انجامِ کار میں نے دیکھا کہ میرا بھیڑیا تو تُو ہے۔''

یہی ویتنام فرانس کی نو آبادی تھا۔ اس وقت ویتنامی جن لوگوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں' یہ وہی لوگ ہیں جو ان کی حمایت میں آئے تھے' تا کہ انہیں فرانس کے تسلط سے آزاد کروائیں۔ بعد ازاں انہوں نے خود سو گنا بدتر اور قوی تر طوق لوگوں کے گلے میں ڈال دیا۔

کہ از چنگال گرگم در ربودی
بدیدم عاقبت گرگم تو بودی

اسلام کی دی گئی آزادی کی دو خصوصیات

اسلام جو آزادی بخشتا ہے اسکی دو بنیادی خصوصیات ہیں۔ ایک صداقت یعنی سچائی' حقیقت کی بنیاد پر ہونا' ہمدردی کی بنیاد پر ہونا' ایک انسانی اور الٰہی جذبے سے ہونا' رحمۃٌ للمؤمنین ہونے کی بنیاد پر ہونا۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (یقیناً تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے' اور اسے تمہاری ہر مصیبت ناگوار گزرتی ہے' وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حریص رکھتا ہے' اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے۔ سورۂ توبہ۹۔ آیت ۱۲۸) اس وجہ سے ہونا کہ:

شُقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست (میں تو سارے جہاں کا عاشق ہوں کیونکہ سارا جہاں اسی کا ہے) دراصل وہ اپنے خدا سے محبت کرتا ہے اور کیونکہ اپنے خدا سے محبت کرتا ہے' اسلئے سب انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس اصول پر ایمان رکھتا ہے کہ:

''خَيْرُكُمْ لِلنَّاسِ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ۔''

''بہترین انسان وہ ہے جو انسانوں کے لیے بہترین ہو۔''

اسلام صداقت اور سچائی کا حامل ہے۔ اس میں منافقت نہیں ہے۔ اگر وہ لوگوں کو گندم بیچتا ہے تو وہ گندم ہی ہوتی ہے' گندم کی صورت میں جو نہیں ہوتی' اسکی نقاب کے پیچھے کچھ اور نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اسلام نے غلامی کے قانون کو اس طرح سے تو منسوخ نہیں کیا کہ اسے بنیاد ہی سے اکھاڑ پھینکا ہو' اس نے اسے ایک اور صورت سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے یہ ضروری سمجھا کہ غلام اس دالان کو عبور کر کے آزادی کی منزل تک پہنچیں۔ انسانیت کا سبق حاصل کریں اور پھر آزاد ہوں۔ اسکے باوجود دنیائے اسلام میں غلاموں کی حالت' دنیا کے دیگر گوشوں میں موجود ان غلاموں سے سو گنا بہتر تھی جن کی آزادی کا اعلان کیا گیا ہے۔

زید بن حارثہ ہی کو لے لیجیے جن کا نام ایک مناسبت سے قرآن میں ذکر ہوا ہے: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا (۱) زید ایک آزاد شدہ غلام تھے۔ ان کا واقعہ کچھ یوں تھا: دورِ جاہلیت میں' شاید رسول اللہ کی حضرت خدیجہ سے شادی سے قبل' حضرت خدیجہ کے بھانجے حکیم بن حزام نے بازار عکاظ میں اس غلام کو دیکھا اور اسے حضرت خدیجہ کے لئے خرید لیا۔ شروع ہی میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایک سمجھدار اور عقل مند غلام ہے۔ زید حضرت خدیجہ کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں حضرت خدیجہ نے انہیں رسولِ اکرم کو بخش دیا اور وہ رسولِ اکرم کی خدمت میں رہنے لگے۔ جب زید کے باپ کو پتا چلا تو وہ مکہ آیا اور حضرت ابو طالب کے پاس آ کر کہنے لگا کہ میرا بیٹا آپ کے بھتیجے کا غلام ہے' اُن سے بات کریں کہ میرے بیٹے کو میرے ہاتھ بیچ دیں' یا فدیہ لے لیں یا چاہیں تو ویسے ہی آزاد کر دیں۔ وہ جیسے چاہیں کریں۔ جب حضرت ابو طالب نے یہ بات رسولِ اکرم کے گوش گزار کی' تو آنحضرت نے فرمایا: زید آزاد ہے' چلا جائے۔ (اُس سے فرمایا) جاؤ' اپنے باپ کے پاس چلے جاؤ۔ اُن کا باپ آیا' اُن کا ہاتھ تھاما تا کہ انہیں لے جائے۔ زید نے

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۷

اپنے باپ سے کہا: میں آپ کے ساتھ نہیں آتا۔ اُن کے باپ نے کہا: بیٹا! کیوں نہیں آتے ہو؟ تم کس طرح اپنا حسب ونسب، عزت اور آزادی گنوا کر یہاں اس آدمی کی نوکری اور خدمت گزاری قبول کر رہے ہو؟ کہنے لگے: میں اس خدمت گزاری اور نوکری کو اس آزادی پر سوگنا ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے یہاں اپنے نوکر، حقیر اور غلام ہونے کا اصلاً کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تو سوائے برادری اور برابری کے احساس کے کچھ اور محسوس ہی نہیں ہوتا۔ اگر میں آپ کا زیردست رہوں، تو وہاں میری حالت یہاں سے سوگنا بدتر ہوگی۔ یہاں میں کوئی بُرائی محسوس نہیں کرتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس غلام کا عقد اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے ساتھ کردیا۔ (اس شادی کے سلسلے میں) جس وقت رسول اکرم نے کسی کو زینب بنت جحش کی خواستگاری کے لیے بھیجا، تو زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش سمجھے کہ رسول اللہ نے اپنے لئے خواستگاری کی ہے۔ لہٰذا انہوں نے فوراً ہاں کردی۔ لیکن جب انہیں پتا چلا کہ رسول اللہ نے زید بن حارثہ کے لئے خواستگاری کی ہے، تو مسلمان ہونے کے باوجود دونوں کو بہت دکھ ہوا (ابھی مکی دور تھا اور اسلامی تربیت نے ان کی روح پر پورا اثر نہیں کیا تھا) کہنے لگے: یارسول اللہ! یہ کیا بات ہوئی؟ زینب، جو جحش کی بیٹی، عرب کے درجۂ اوّل سے تعلق رکھنے والے اشراف میں سے سردارِ قریش عبدالمطلب کی نواسی، رسول اللہ کی پھوپھی زاد ہے، آپ اسے ایک غلام سے بیاہنا چاہتے ہیں؟ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اس سے آپ خود عقد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی پھوپھی زاد کا رشتہ آپ سے ہونا چاہئے، اس سے کیوں؟ آنحضرت نے فرمایا: اگر میری خوشی چاہتے ہو، تو میں کہتا ہوں کہ زینب زید بن حارثہ کی بیوی بن جائے۔ زینب نے جب دیکھا کہ پیغمبر اکرم اس شادی کے لئے بہت زیادہ مائل ہیں، تو کیونکہ وہ ایک مومنہ خاتون تھیں، اگرچہ زید کو پسند نہیں کرتی تھیں اسکے باوجود اُن سے شادی کے لئے تیار ہوگئیں۔ لیکن آخرکار ان دونوں کا نباہ نہ ہوسکا۔ زید آئے دن رسول اللہ کے پاس آتے (اور کہتے) یارسول اللہ! میرا گزارہ زینب کے ساتھ نہیں ہوسکتا، اجازت دیں میں انہیں طلاق دے دوں۔ رسول اکرم انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آخرکار زید نے انہیں طلاق دے دی۔ یہ ایک علیحدہ قصہ ہے۔

ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ اگرچہ بظاہر قانونِ غلامی کو منسوخ نہیں کیا گیا۔

اسی طرح آپ نے اپنی ایک اور چچازاد ضباعہ کی شادی ایک سیاہ فام سے کردی۔ اسی زید کے بیٹے اسامہ کو جو ابھی سترہ اٹھارہ سال کا جوان تھا' لشکرِ اسامہ کے واقعے میں اُسے اپنے اکابر صحابہ کا کمانڈر بنا دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اُن کے کام صداقت اور حقیقت کی بنیاد پر تھے' اُن کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالا تھا۔ کوئی اور مادی مقصد پیشِ نظر نہ تھا۔ پس اس حوالے سے اسلام کا ایک امتیاز صداقت ہے۔

دوسری خصوصیت طاقت وقوت ہے۔ ہم انکار نہیں کرنا چاہتے اور یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تاریخ بشریت میں جس جس نے آزادی کا دم بھرا ہے وہ سب کے سب لوگ جھوٹے تھے۔ شاید (مجھے یقین نہیں) کہ واقعاً ایسے افراد رہے ہوں جن کا محرک دینی نہ تھا لیکن انہوں نے حقیقتاً اور اخلاص کے ساتھ آزادی کے بارے میں بات کی ہو' لیکن اسکے لئے انہیں قوت وطاقت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کام کے لئے صداقت کے علاوہ طاقت بھی درکار ہے۔

کونسی طاقت؟

کیا اسکے لئے توپ اور بندوق' یا شمشیر ونیزہ چاہئے؟ نہیں۔

تو پھر کیا چاہئے؟

لوگوں کے جذبات اور دلوں پر اثر اور تسلط کی طاقت' دلوں کو جھکا لینے کی طاقت' بارگاہِ الٰہی میں دلوں کو جھکا لینا۔ قولوا لاالہ الااللّٰہ تُفلِحوا۔

اس کا سرمایہ "قولوا لاالہ الااللّٰہ تُفلِحوا" ہے' اللہ پر ایمان ہے' انسانیت پر ایمان ہے۔ انسانیت کے کیا معنی ہیں؟ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" (۱) پر ایمان' انسان کی اہمیت کو بڑھانا' انسان کو ایک مشین کی حد سے اوپر لے جانا۔

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰۔

آج کی دنیا کا تضاد

عجیب بات ہے' آج کی دنیا ایک طرف تو اپنے فلسفے کے ذریعے یہ کہنے کی کوشش کرتی ہے کہ انسان ایک مشین سے زیادہ کچھ نہیں۔ جیسے ایک مشین چند پرزوں سے مل کر بنی ہوتی ہے' انسان بھی بس اسی پیکر اور بدن کا نام ہے' یہ بدن بھی ایک مشینری سے زیادہ کچھ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مشینیں مختلف ہوتی ہیں' ایک سادہ مشین ہوتی ہے' جیسے آپ کی کلائی پر بندھی گھڑی۔ ایک مشین کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے جیسے ایک ہوائی جہاز۔ ایک مشین بہت عظیم تر ہوتی ہے مثلاً اپالو۔ ایک مشین اور بھی عظیم ہے اور وہ ہیں زندہ موجودات' جن میں سے ایک انسان ہے۔ انسان ایک مشین سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی وہ انسان کو جمادات کی حد تک نیچے لے آتے ہیں اور دوسری طرف وہ انسانی حیثیت کا دم بھرتے ہیں۔

واقعاً مضحکہ خیز بات ہے۔ انسان جب حقوقِ انسانی کا عالمی چارٹر پڑھتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ وہاں انسانی مقام کا دم بھرا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے آزادی چھیننے' جارحیتوں اور خونریزیوں کی علت العلل جان لی ہے اور وہ ہے ایک دوسرے کی آزادی کا احترام نہ کرنا۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی انسانی حیثیت کا احترام نہیں کرتے اور اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ جس انسانی حیثیت کی آپ بات کر رہے ہیں' وہ کیا ہے؟ آخر اس مشین کی کیا حیثیت ہے؟ اگر انسان واقعاً ایک مشین ہے' تو اسے قتل کرنا ایسے ہی ہے جیسے ایک مشین کو بے کار کر دینا۔

انسانیت' انسانی حیثیت اور شرفِ انسانی کی بات اسے زیب دیتی ہے جو کہتا ہے کہ: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱) ہم نے عالمِ بالا سے ایک خصوصی شرف انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ ہے جو انسانی و بشری حیثیت کا دم بھر سکتا ہے' جو انسان کو انسان کا مومن بنا دے اور انسان کو اللہ کا مومن

۱۔ اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۰)

بنادے کہ جو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کی بات کرتا ہے۔ انسانی حیثیت و آزادی کا دفاع وہ کرسکتا ہے جو فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۱) کی بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے اس موجود میں ایک چیز قرار دی ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲) پھر ہم نے فرشتوں سے کہا تو: فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۔ہم نے اس موجود کی ایک حیثیت کی نشاندہی کردی' تب فرشتوں کو اس کے سامنے جھکنے کو کہا۔

پس دوسری شرط اجرا اور نفاذ کی طاقت ہے۔ یہ اجرائی طاقت انبیا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں۔

لہٰذا اسلام جو حقیقی معنی میں آزادی بخش بن گیا ہے' تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اس تحریک میں صداقت بھی تھی اور اجرا و نفاذ کی قوت بھی۔ (البتہ اگر ہم چاہیں کہ پھر اس معاملے کے تاریخی پہلو پر بات کریں' تو اس مقصد کے لئے اس حوالے سے تاریخ کی مختلف فصول پر بات کرنا ہوگی۔ تاہم ہم نے کم و بیش مثالیں ذکر کردی ہیں۔ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم فقط اس کا فلسفہ عرض کرنا چاہتے ہیں) اسلام کی تحریک میں مذکورہ دو خصوصیات کی وجہ سے اتنی طاقت پیدا ہوئی۔

اس مقدس رات میں ہم کس مناسبت سے جشن مناتے ہیں؟

یہ کونسی عید ہے؟

یہ حقیقی معنی میں آزادی بشر کے اعلان کی رات ہے۔

گزشتہ شب ہم نے عرض کیا تھا کہ جملہ "قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا" کا پہلا حصہ نفی' نافرمانی' انکار' سر نہ جھکانے اور آزادی سے عبارت ہے' جبکہ دوسرا حصہ بندگی سے عبارت ہے۔ پہلا حصہ سلب' نفی اور جدائی ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

۱۔ تو تم سب سجدے میں گر پڑنا۔ (سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۷۲)

۲۔ اور خدا نے آدم کو تمام اسما کی تعلیم دی اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے فرمایا کہ ذرا تم ان سب کے نام تو بتاؤ اگر تم اپنے خیال استحقاق میں سچے ہو۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۱)

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی (۱) لیکن فصل ووصل' سلب وایجاب' نفی واثبات' آزادی وبندگی اور عصیان و تسلیم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یعنی یہ نافرمانی اس تسلیم کے بغیر ممکن نہیں اور وہ تسلیم بھی اس نافرمانی کے بغیر حقیقت نہیں بنتی۔ یہ وہ نفی ہے جس کا سہارا وہ اثبات ہے' اور وہ ایسا اثبات ہے جس تک پہنچنے کی شرط اس نفی کو عبور کرنا ہے۔ قولو الا الہ الا اللّٰہ تفلحوا۔

خدایا! ہم تجھے اس رات کے صاحب' حقیقت قرآن اور وحی رسالت کے حق کا واسطہ دیتے ہیں کہ ہم سب کے دلوں کو اسلام وایمان کے نور سے روشن فرما۔ ہمیں دین مقدس کے حقائق سے آشنا فرما۔

خدایا! روح ایمان' توحید' اس اسلامی آزادروی کا پرتو ہم سب کی روح میں قرار دے۔

خدایا! ہماری روح کو رذائل کی قید سے آزاد فرما۔

ہم سب کو دنیا و آخرت کی خیر عنایت فرما۔

آج شب پھر حضرت آیت اللہ میلانی دامت برکاتہ کی بیماری کے پیش نظر پانچ مرتبہ "اَمَّنْ یُجِیْبُ" (سورہ نمل۔ آیت ۶۲) پڑھتے ہیں۔

خدایا سب بیماروں کو پیش نظر بیماروں کو اور خصوصاً پیش نظر بیمار عزیز کو جلد شفا عنایت فرما۔ خدایا! ہم سب کے مرجانے والوں کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

رحم اللّٰہ من قرا الفاتحة مع الصلوات

۱۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آئے' وہ ایک مضبوط رسی سے وابستہ ہو گیا ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

مسئلۂ نفاق ☆

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"الحمد للّٰہ ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلوۃ و السلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ و حافظ سرّہ و مبلّغ رسالتہ سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد(صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم)و علی الہ الطیبین الطاھرین المعصومین."

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

" اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. "(۱)

☆ یہ تقریر تقریباً ۱۹۷۱ء میں غالباً مسجد الجواد تہران میں کی گئی۔

۱۔ منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں سب ایک دوسرے سے ہیں۔ سب برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکیوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا ہے کہ منافقین ہی اصل میں فاسق ہیں۔ (سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۶۷)

ہماری گفتگو مسئلۂ نفاق کے بارے میں ہے۔ جو افراد تلاوتِ کلام اللہ مجید سے مانوس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں جو الفاظ زیادہ دکھائی دیتے ہیں اور سنائی دیتے ہیں، اُن میں سے ایک لفظ ''منافق'' یا اسی مادّے سے دیگر صیغے ہیں: (جیسے) منافقون، منافقات یا خود لفظ نفاق: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۱) یا لفظ ''نافقوا'' جو اسی معنی میں ہے اور کچھ دیگر صیغے۔ بہر حال قرآنِ کریم نے جن مطالب و مسائل پر بات کی ہے اُن میں سے ایک منافقین کا موضوع ہے۔

قرآنِ مجید میں مومنین و موافقین کے مقابل ایک نہیں بلکہ دو مخالف گروہ بیان کیے گئے ہیں۔ شاید یہ قرآن کے امتیازات میں سے ہے۔ کسی اور آسمانی کتاب میں مومنین و موافقین کے طبقے کے مخالف دو مختلف طبقوں کے نام نہیں لیے گئے، بلکہ مجموعی طور پر دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لوگ یا مومن ہیں، یا مومن کے برعکس کافر ہیں۔ لیکن قرآنِ مجید مومنین کے مدِمقابل دو گروہوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جسے کبھی کافرین یا مشرکین کہتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جسے منافقین کہتا ہے اور ان کا حساب علیحدہ رکھتا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے:

''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ .'' (۲)

اے نبی! تقویٰ الٰہی اختیار کرو، اللہ کو ملحوظ نظر رکھو، پیروی نہ کرو، اطاعت نہ کرو، کافروں کی تجاویز قبول نہ کرو اور نہ منافقوں کی تجاویز مانو۔

یا ایک اور جگہ فرماتا ہے:

''لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ .'' (۳)

بہر حال خداوندِ عالم منافقین کو کفار اور مشرکین سے علیحدہ حساب کرتا ہے (کافر اور مشرک

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۷۷

۲۔ اے پیغمبر! خدا سے ڈرتے رہیے اور خبردار کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجیے۔ (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۱)

۳۔ تاکہ خدا منافق مرد اور منافق عورت اور مشرک مرد اور مشرک عورت سب پر عذاب نازل کرے۔ (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۷۳)

دو لحاظ سے کہا گیا ہے) اور کبھی کبھی قرآن اپنی بعض عبارتوں میں منافقین کا ذکر زیادہ غصے سے کرتا ہے اور انہیں کافروں سے زیادہ مستحقِ عذاب قرار دیتا ہے۔ جیسے ایک مقام پر فرماتا ہے:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔"(۱)

لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں ان کی حالت کافروں سے بدتر ہے۔

منافقین کے درمیان ہم آہنگی

قرآنِ کریم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے منافقین کو ایک دوسرے سے الگ افراد کے طور پر نہیں دیکھتا۔ بلکہ انہیں ایک ایسے منظم اور ہم فکر گروہ کے طور پر دیکھتا ہے جن کے درمیان ہم آہنگی موجود ہے۔ تقریر کے آغاز میں ہم نے جس آیت کی تلاوت کی ہے، وہ یہی مفہوم دیتی ہے۔ اس آیت سے چند آیات کے بعد سورۂ توبہ میں ایک آیت ہے، جس میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

"وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔"(۲)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حامی ہیں، وہ آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ (قرآن) ان کے مقابل کفار کا ذکر نہیں کرتا (بلکہ) منافقوں کا ذکر کرتا ہے۔ (وہ) منافقوں کے مابین بھی اسی طرح کی ہم آہنگی کا قائل ہے۔ اگرچہ اُن کے لئے اولیا کا لفظ استعمال نہیں کرتا، لیکن فرماتا ہے: "بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" ان میں سے بعض، بعض سے ہیں۔ یعنی یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ (ان کے درمیان پائی جانے والی) ہم آہنگی (کے اظہار) کے لئے یہ الفاظ "بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" سے بڑھ کر نہ

۱۔ بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے اور سخت ترین طبقے میں ہوں گے۔ (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۴۵)

۲۔ مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں کہ یہ سب ایک دوسرے کو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ (سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۷۱)

ہوں تو کمتر بھی نہیں۔ کیونکہ قرآن کی بعض دیگر آیات میں یہ تعبیر آئی ہے اور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے ایسے وابستہ و پیوستہ ہیں جیسے ایک ہی ہیں۔ "بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ" اتحاد و یگانگت کا مفہوم دیتا ہے' جو حامی و ناصر ہونے کے مفہوم سے بڑھ کر ہے۔

منافقین کا پروگرام اور عمل مومنین کے عمل کے بالکل متضاد ہے۔ اگر مومنین لوگوں کو ''معروف'' کہے جانے والے امور اور کارِ خیر کی ترغیب دیتے ہیں' اور شر اور بُرائی کے کاموں سے روکتے ہیں' تو منافقین اس کے بالکل برعکس عمل کرتے ہیں۔ اُن کا کردار (لوگوں کو ایسے کاموں سے) روکنا ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کی دیگر آیات سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے۔ خود اسی مقام پر ہے کہ " وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ" اُنہوں نے اپنے ہاتھ بند کر لئے ہیں' اُن کے ہاتھ کھلے نہیں ہیں۔ جب کام اور عمل کا موقع آتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ اسلامی معاشرے کو اندر سے چوٹ پہنچاتے ہیں اور اس پر ضرب لگاتے ہیں۔

بہرحال قرآنِ مجید میں منافقین کے بارے میں بہت سی آیات ہیں۔ ہم ان آیات کا ذکر کرنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں کہ اگر ہم فقط ان آیات کو پڑھیں اور ان کا ترجمہ اور مختصری بھی تفسیر کریں تو وہ ان دوراتوں میں ختم نہ ہوسکیں گی۔ قرآنِ حکیم میں تو سورۂ جمعہ کے بعد ایک سورہ ہی ''منافقون'' کے نام سے ہے۔

"اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ." (۱)

(ضمناً اس آیت میں منافقین کا تعارف کرایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں) کچھ منافقین اور دورُخے افراد آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں' اسلام اور ایمان کا اظہار کرتے ہیں' کہتے ہیں: ہم

۱۔ جب یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اسکے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ (سورۂ منافقون ۶۳۔ آیت ۱)

گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تو جانتا ہے کہ آپ رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اس بات کو نہیں مانتے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں۔

ایسی بھی بہت سی آیات ہیں جن میں لفظ منافق اور منافقات تو نہیں ہے لیکن وہ منافقین کے بارے میں ہیں۔ قابلِ توجہ بات ہے کہ جس طرح مومنین کے بارے میں قرآن مردوں کا ذکر بھی کرتا ہے اور عورتوں کا بھی' مومن مرد اور مومنہ عورتیں' اسی طرح منافقین کا بھی ذکر کرتا ہے۔ منافق مرد اور منافق عورتیں۔

ہمارا دور منافقت کا دور ہے

اب کیا وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے منافق کے مسئلے پر اس قدر زیادہ زور دیا ہے؟ خصوصاً جبکہ گزشتہ آسمانی کتب میں یا تو منافقین کا ذکر ہی نہیں' یا اگر ہے بھی تو بہت کم۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر ابتدائی تھا' تہذیب سے دور تھا اور نسبتاً نچلے درجے کی زندگی گزارتا تھا' اس میں بے باکی زیادہ تھی۔ یعنی افکار' احساسات' جذبات' پسند' ناپسند' ہمدردی' غصہ' ایمان اور بے ایمانی' جو کچھ بھی اس میں ہوتا تھا وہ اس کو ظاہر کر دیتا تھا۔ لیکن انسان نے جس قدر ترقی و کمال حاصل کیا ہے (ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ ایک طرح کا کمال ہے لیکن کمال کے نتائج میں سے ہے) اس کی تصنع (نفاق تصنع ہی کی ایک قسم ہے) اور بناوٹ کی صلاحیت زیادہ ہوگئی ہے۔ مثلاً اگر ہم اپنے زمانے کے لوگوں کا صدرِ اسلام کے لوگوں سے موازنہ کریں' تو ہمارے اس دور کے لوگوں میں منافقت ہزاروں درجے زیادہ ہوگئی ہے۔

ایک مرتبہ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہمارے زمانے کا انسانی اعتبار سے جائزہ لیا جائے' صنعتی لحاظ سے نہیں اور ایک انسانی پہلو کو معیار اور ہمارے زمانے کا پیمانہ قرار دیا جائے' تو ضرور کہا جائے گا کہ یہ منافقت کا زمانہ ہے۔ اگر سوال ہو کہ ہمارے زمانے کی ایجاد ہونے والی سب سے بڑی مشین کونسی ہے' تو میری نظر میں وہ حقائق کو بدلنے والی مشین ہے۔ یہ جو انسان نے حقائق کو بدلنے کی اتنی زیادہ صلاحیت حاصل کر لی ہے' کہ وہ حقائق کو بالکل الٹ کر پیش کرتا ہے' اس پر گفتگو بعد

کی نشست کے لئے اٹھار کھتے ہیں۔

کیونکہ ہماری گفتگو لیکچرز اور درسی کلاسز کی مانند کچھ خصوصی پہلو رکھتی ہے' اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح سے گفتگو کریں۔ پہلے لغوی پہلو پر بات کریں (یعنی یہ دیکھیں کہ) دراصل ''نفاق'' کے لغوی معنی کیا ہیں؟ نفاق کی تعریف اور ماہیت کیا ہے؟ اسکے بعد ہم منافقت کے خطرے کے بارے میں گفتگو کریں گے؟ پھر اس خطرے کو جان لینے کے بعد اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اس خطرے کے مقابل ہماری ذمے داری کیا ہے اور اگر ممکن ہوا تو اس بارے میں بات کریں گے کہ اپنے زمانے میں سانحۂ کربلا کو وجود میں لانے میں منافقت نے کیا کردار ادا کیا۔ یعنی حسین ابن علی کے دشمنوں نے اس سانحے کو وجود میں لانے کے لئے نفاق کے عامل سے کس قدر فائدہ اٹھایا اور اس کے مقابل حادثۂ کربلا اور شہادتِ امام حسین علیہ السلام اپنے زمانے میں اور بعد کے زمانوں میں منافقت کے پردوں کو تار تار کرنے میں کس قدر موثر ہے۔

نفاق کے لغوی معنی

رہا ''نفاق'' کا لغوی پس منظر۔ تو (عرض ہے کہ) قرآنِ مجید میں ''نفق'' کا لفظ آیا ہے: اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ (زمین میں سرنگ بنادیں یا آسمان میں سیڑھی لگادیں۔ سورۂ انعام ۶۔ آیت ۳۵) یہاں سے ہم اس لفظ کی بنیاد حاصل کرسکتے ہیں۔ ماہرین لغت کہتے ہیں کہ ''نفق'' راستے کو کہا جاتا ہے۔ البتہ مخفی اور پنہاں راستے کو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم ''شرح نظام'' پڑھ رہے تھے (جو صرف ونحو کی ایک کتاب ہے اور ''سیوطی'' کے ساتھ عربی مقدمات پڑھنے والے طلبا اسے پڑھتے ہیں) تو وہاں ہم نے ایک لفظ دیکھا تھا' اور بعد ازاں اسے لغت کے کتابوں میں بھی دیکھا ہے' وہ لفظ ہے ''نافقاء''۔ وہاں اس لفظ کے یہ معنی کئے گئے تھے کہ: جب صحرائی چوہا صحرا میں اپنا بل بناتا ہے' تو اس بل کے لئے ایک دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ وہی دروازہ اسکی معمول کی آمد ورفت کے لئے ہوتا ہے' جس سے وہ آتا جاتا ہے۔ پھر دشمن سے بچنے کے لئے ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر وہ ایک اور دروازہ جو اس نظر آنے والے

دروازے سے دور فاصلے پر ہوتا ہے زمین کے نیچے کی طرف سے اوپر کھودتا ہے۔ وہ کھودتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے بل کی چھت (کے اس حصے) کو سطح زمین کے قریب لے جاتا ہے۔ لیکن اتنا نہیں کھودتا کہ سوراخ ہو جائے۔ بلکہ ایک باریک سی تہ باقی رہنے دیتا ہے۔ یہ تہ اس قدر باریک بھی نہیں ہوتی کہ از خود ٹوٹ جائے' بلکہ ایسی ہوتی ہے کہ اگر کسی دن اسکے لئے دروازے کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہو' کوئی درندہ اس دروازے سے داخل ہو کر اسکے لئے خطرہ پیدا کر دے' تو وہ زور سے اپنا سر مار کر اس تہ کو توڑ سکے۔ جوں ہی وہ اُس دروازے سے داخل ہو' یہ اس دروازے سے باہر نکل جائے۔ عرب اسے "نافقاء" کہتے ہیں۔ یعنی ایک مخفی' داخلی' اوپر سے چھپا ہوا راستہ جو صحرائی چوہے کے فوجی رازوں میں سے ہے اور دشمن اس سے آگاہ نہیں ہوتا لیکن اُس نے اپنے لئے ایک ایسا احتیاطی راستہ بنا رکھا ہوتا ہے۔

لغت میں بھی جب ہم منافق کے بارے میں نگاہ ڈالتے ہیں' کہ منافق کو منافق کیوں کہتے ہیں؟ تو دیکھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: اس لئے کہ وہ اپنے پاس دو دروازے رکھتا ہے۔ ایک داخلے کا دروازہ جس سے وہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور ایک نکلنے کا دروازہ جسے ہمیں مخفی دروازہ فرض کرنا چاہئے۔ وہ ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے۔

منافق کی تعریف

یہیں سے ضمناً منافق کی تعریف معلوم ہو جاتی ہے۔ ایک مومن ہوتا ہے' ایک کافر ہوتا ہے اور ایک منافق ہوتا ہے۔ مومن وہ ہوتا ہے جو واقعاً اپنے دل کی گہرائیوں سے حقیقت اور اسلام پر ایمان رکھے اور اس کا اعتراف واقرار کرے۔ دل سے مومن ہو' اپنی زبان اور عمل سے بھی مومن ہو' اپنے احساسات کے لحاظ سے بھی مومن ہو' ظاہری لحاظ سے بھی مومن ہو' قول وفعل کے اعتبار سے بھی مومن ہو۔

البتہ کافر وہ ہے جو مخالف ہے' باطن سے مخالف ہے' ظاہر سے بھی مخالف ہے' کہتا ہے کہ میں اکو نہیں مانتا۔ وہ اللہ کو نہیں مانتا' اور کہتا بھی ہے کہ میں اللہ کو نہیں مانتا' پیغمبر کو نہیں مانتا' اور کہتا بھی

ہے کہ میں پیغمبر کو نہیں مانتا' قرآن کو نہیں مانتا اور کہتا بھی ہے کہ نہیں مانتا' اس کا موقف واضح ہے' وہ کافر ہے اور ایک کھلم کھلا کافر ہے۔ یعنی اس کا ایک چہرہ ہے۔ وہ ایک سے زیادہ چہرے نہیں رکھتا۔ اس کا ظاہر وہی کچھ کہتا ہے جو اس کا باطن ہے اور اس کا باطن وہی کچھ کہتا ہے جو اس کا ظاہر ہے۔

تاہم منافق وہ ہے جس کی فکر اور ذہن کچھ اور کہتے ہیں اور ان کے بالکل برخلاف اسکی زبان کچھ اور کہتی ہے۔ اسکے احساسات و جذبات کسی اور طرف کو ہوتے ہیں لیکن اسکے ظاہری امور کسی اور طرف۔ وہ دل سے خدا کو نہیں مانتا لیکن ظاہر میں خدا پرست ہوتا ہے' نبی کو نہیں مانتا لیکن ظاہراً نبی کا احترام کرتا ہے' قرآن کو نہیں مانتا لیکن ظاہراً قرآن کا احترام کرتا ہے' علی کو نہیں مانتا لیکن ظاہراً علی کا احترام کرتا ہے۔ دین کی تمام دوسری مقدس چیزوں کے بارے میں بھی اس کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے۔ اس نے اپنے کفر پر ایک پردہ ڈال رکھا ہوتا ہے۔ لہٰذا ''نفاق'' یعنی کفر پردے کی اوٹ میں۔ ''منافق'' یعنی ایسا کافر جس نے اپنے کفر کو پردے کے پیچھے چھپا رکھا ہو۔ نہج البلاغہ میں ایک حدیث ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جب محمد ابن ابی بکر کو مصر کا گورنر بنایا تو ان کے نام ایک مکتوب لکھا۔ اس میں فرماتے ہیں: میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ رسول اللہ نے اپنی امت کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: مجھے منافقوں کا خوف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کر رہے تھے' لیکن کافروں کی طرف سے نہیں' اُن کی طرف سے نہیں جو مسلمان نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اسلام کو نہیں مانتے' بلکہ اُن کی طرف سے جو بظاہر اسلام کو مانتے ہیں لیکن دل سے اسے قبول نہیں کرتے۔ حضرت کی عبارت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''انی لا اخاف علیٰ اُمتی مؤمناً ولا مشرکاً۔''

''مجھے اپنی امت کے لیے مومنین سے کوئی خوف نہیں' مشرکین کی طرف سے بھی مجھے اپنی امت کے بارے میں کوئی ڈر نہیں۔''

''اَمّا الْمُؤْمِنُ فَیَمْنَعُهُ اللّٰهُ بِایمانِه۔''

''رہا مومن تو مومن کو تو خدا اسکے ایمان کی وجہ سے ہی باز رکھتا ہے۔''

یعنی مومن کا ایمان اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسلام کے لئے کوئی خطرہ پیدا کرے۔

''وَاَمَّا الْمُشْرِكُ فَيَقْمَعُهُ اللّٰهُ بِشِرْكِهِ.''

''اور مشرک کیونکہ اپنے شرک میں ظاہر ہوتا ہے' اس وجہ سے خدا اس کا قلع قمع کر دیتا ہے۔''

''وَلٰكِنْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ كُلَّ مُنَافِقِ الْجَنَانِ عَالِمِ اللِّسَانِ.''

''لیکن میں تمہارے بارے میں ایسے فرد سے ڈرتا ہوں جو دل میں منافق ہوتا ہے اور زبان سے عالم۔'' (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۲۷)

لیکن میں جس سے تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں وہ منافق ہے' جس کی زبان دانا اور ظاہر ا رہے اور بھلائی کی باتوں اور اسلام کے لئے چلتی ہے۔ بلکہ اسکے تمام ظواہر اسلامی ہوتے ہیں ۔ اس کا دل کسی اور طرف ہوتا ہے۔

یہاں سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ منافق اور منافقت کس قدر بڑا خطرہ ہے۔ جب ہم قرآن یم کا مطالعہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ اس میں نفاق اور منافق کا ذکر بہت زیادہ ہوا ہے۔ اس ضوع کی ساری آیات کو تو ہم نے یکجا نہیں کیا ہے لیکن یہ بہت زیادہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ل اکرم بھی فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں مشرکوں اور کافروں کی جانب سے خوف نہیں لیکن منافقین سے ہے' ان مسلمانوں سے ہے' جن کا ظاہر اسلام ہے لیکن وہ کھوٹے ر ریاکار ہیں' ظاہراً دیندار ہیں لیکن باطن اور دل کی گہرائی سے اسلام پر ایمان نہیں لائے ہیں۔ اپنے دین کے بارے میں ایسے لوگوں سے ڈرتا ہوں۔

ق کی ماہیت

نفاق انسان کے لئے ایک عجیب مسئلہ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ عام طور پر دانشور' فلاسفہ

اور ماہرین نفسیات جب انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کر کے پیش کرنا چاہتے ہیں' تا کہ اسکی نوع کو دوسری انواع سے الگ کر کے پیش کریں' تو انسان کے کچھ اختصاصات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی کلیات کا ادراک کر لیتا ہے' یا گفتگو کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے حیوانات بات چیت نہیں کرتے' مکالمہ نہیں کرتے' کم از کم ہماری طرح آواز کے ساتھ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ یا اُن کا کہنا ہے کہ ''تعجب'' انسان کے امتیازات میں سے ہے۔ انسان اظہارِ تعجب کرتا ہے' کبھی اسے بعض مسائل درپیش ہوتے ہیں تو وہ ایک خاص حالت کا اظہار کرتا ہے' اس خاص حالت کو وہ ''تعجب'' کہتے ہیں۔ کہتے ہیں حیوانات میں تعجب نہیں ہوتا۔ انسان روتا بھی ہے' کوئی ناگوار واقعہ اسے پیش آجائے تو آٹھ آٹھ آنسو بہانے لگتا ہے' اس کے آنسو برسنے لگتے ہیں۔ حیوانات کے بارے میں کسی نے اس بات کی نشاندہی نہیں کی کہ وہ باقاعدہ روتے ہیں۔ انسان ہنستا بھی ہے۔ ہنسی کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ انسان سے مخصوص باتوں میں سے ہے۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ کچھ حیوانات ہنستے ہیں لیکن ابھی تک ثابت نہیں ہوا ہے۔

منافقت انسان کا ایک اختصاص

ایک اور چیز جسے انسان کی خصوصیت میں شمار کیا جاسکتا ہے' اور جو کسی اور حیوان میں نہیں پائی جاتی' یا کم از کم اس میں یہ خصوصیت انسان کی مانند نہیں ہوتی' اور اگر ہوتی بھی ہے تو انتہائی کمزور سی ہوتی ہے' وہ منافقت کی خصوصیت ہے۔ حیوانات میں جو کچھ اُن کے اندر ہوتا ہے' اُسی کا اظہار اُن کے ظاہر سے اور اُن کے جسم سے ہوتا ہے۔ اگر ایک حیوان غصے میں ہوتا ہے' تو وہ اپنے قیافے سے بھی غصے میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر اُس کی روح غصے میں ہو' تو اُسکی آنکھوں اور آواز میں بھی آپ کو غصہ دکھائی دیتا ہے۔ جب ایک کتا اپنے مالک سے محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے' تو وہ محبت اسکے چہرے مہرے' جسم اور حرکات سے بھی ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ حیوان کو کسی کھانے کی طرف رغبت ہو' تو اس رغبت کے آثار اسکے ظاہر میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی طرف

سے وہ بے رغبت اور بے میل ہوتا ہے' تو یہ بے رغبتی اسکے ظاہر سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی حیوان ایسا نہیں کر سکتا کہ اندر سے کچھ اور ہو اور باہر سے کچھ اور۔

لیکن یہ دو پاؤں والا موجود ''انسان'' عجیب چیز ہے۔ یہ صلاحیت انسان ہی میں پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی اندرونی کیفیات کے اظہار پر کنٹرول کر لیتا ہے۔ یعنی اگر کسی پر اسے انتہائی غصہ بھی آ رہا ہو' تب بھی اسے دھوکا دینے کے لئے اسکے ساتھ محبت اور مہربانی کا اظہار کر لیتا ہے اور اس پر صدقے واری ہو لیتا ہے' ایسی خنداں پیشانی' مسکراتے لبوں اور مسرور چہرے کے ساتھ ملتا ہے کہ سامنے والا یہ تصور بھی نہیں کر پاتا کہ یہ اُس کا دشمن ہے۔ دشمن ہوتا ہے لیکن دوستی کا اظہار کر سکتا ہے۔ غصے میں ہوتا ہے لیکن مہربانی کا اظہار کر لیتا ہے۔ کسی چیز سے انتہائی رغبت رکھتا ہے لیکن اپنے چہرے مہرے سے اس سے نفرت کا اظہار کر لیتا ہے۔ دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی غرض سے کسی چیز کی طرف غیر معمولی رغبت رکھنے کے باوجود اسکی طرف سے بے رغبتی کا اظہار کر لیتا ہے' یا رغبت نہیں رکھتا لیکن رغبت ظاہر کر لیتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ انسان میں پردہ پوشی کی صلاحیت پائی جاتی ہے' وہ اپنے باطن پر پردہ ڈال سکتا ہے۔

البتہ اپنے اندر کی ہر بات کو چھپانا عیب نہیں ہے۔ یہ نہ کہیے گا کہ جب یہ صفت بُری ہے تو پھر اس کا فائدہ کیا ہے؟ کیا یہ چیز انسان میں بے مقصد رکھ دی گئی ہے؟ نہیں' خود یہ طاقت انسان کے لئے کمال ہے کہ وہ اپنی نیتوں پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ پردہ پوشی کرنا دھوکا دہی اور منافقت نہیں۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں: ہم اپنی فارسی میں کہتے ہیں کہ فلاں تھپڑ سے اپنے چہرے کو سرخ رکھتا ہے' بعض لوگ عزت دار ہوتے ہیں اور وہ اپنی عزت و آبرو کا خیال رکھتے ہیں۔ یعنی وہ تہی دست ہوتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات لوگوں کو معلوم ہو کہ اُن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ از خود یہ بات بُری نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا راز کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس مقام پر ان کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ اپنا راز لوگوں کو بتائیں' اور اگر انہوں نے اسے مخفی رکھا' تو یہ لوگوں کے ساتھ کوئی خیانت ہوگی۔ قرآن مجید بھی اس صفت کی تعریف کرتا ہے۔ فرماتا ہے:

''يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ.''

"ناواقف افراد انہیں ان کی حیا و عفت کی بنا پر مالدار سمجھتے ہیں۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۷۳)

(قرآنِ مجید) کہتا ہے کہ بعض فقرا' فقیر تو ہوتے ہیں لیکن وہ اس قدر عظمتِ کردار' عزتِ نفس اور کرامتِ روح کے مالک ہوتے ہیں کہ جب دوسرے اُنہیں دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ مالدار ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی بھی اُن کے فقر سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی بُرائی نہیں ہے۔

انسان دل میں دکھی ہو (کوئی بھی کسی وقت خوش یا غمزدہ ہو سکتا ہے) ایسی حالت میں جب وہ دوسروں کا سامنا کرتا ہے تو اس کا فریضہ کیا ہے؟ کیا اپنے چہرے پر رنج و غم بکھیرے' دوسروں کو پریشان کر دے۔ اس حال میں جو بھی اس سے ملے پوچھے' حضور! کیا ہوا' یوں لگتا ہے جیسے آپ پریشان ہیں؟ یا پھر ایسا نہ کرے۔ بلکہ اپنا غم اپنے تک محدود رکھے اور دوسروں کے سامنے مسرور چہرے کے ساتھ رہے۔ حدیث نبوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ بِشْرُهُ (یا بُشْرُهُ) فِی وَجْهِهٖ وَ حُزْنُهُ فِی قَلْبِهٖ."

"مومن چہرے سے مسرور ہوتا ہے اور دل سے مغموم۔"

(کافی۔ ج ۲۔ ص ۲۲۶)

یہ وہ موقع ہوتا ہے جب اس صلاحیت سے کام لیا جانا چاہئے اور اس سے کام لینا اچھا اور دوسروں کے فائدے میں ہوتا ہے۔ انسان فقیر ہو لیکن ممکن حد تک غیرت سے کام لے تاکہ دوسرے (اسکے فقر سے) واقف نہ ہو سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا فقر اسکی کیفیات سے ظاہر ہو جائے' دل میں غم رکھے لیکن اپنے چہرے سے خوشی ظاہر کرے' دوسروں کو افسردہ نہ کرے۔

کافسردہ دل افسردہ کند انجمنی را

بالکل ہماری طرح۔

ہم اگر کچھ مقدس مآب ہو جائیں' تو مقدس مآبی کی ایک علامت چہرے کو غمزدہ کر لینا ہے۔ ممکن ہے ہمارے دل میں یکسر خوفِ خدا نہ ہو' نہ ہمیں عاقبت و آخرت کی فکر ہو اور نہ ہم اپنے

اعمال کے بارے میں پریشان ہوں کہ آخرت میں اُن کا انجام کیا ہوگا' اس طرف سے ہم بالکل بے پرواہوں۔ لیکن اپنے آپ کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے ہمیں مصلحت یہی نظر آتی ہو کہ ایک روکھا سا چہرہ بنائے رکھیں' کبھی بھی نہ ہنسیں اور کسی کے سامنے نہ مسکرائیں۔

یہ کیفیت اس حکم کے بالکل برعکس ہے۔

بہر صورت انسان میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس میں تصنع کی طاقت ہے اور یہ اپنے آپ کو اپنے باطن کے برخلاف ظاہر کرسکتا ہے۔ یہ بات بعض مواقع پر اچھی اور پسندیدہ ہے اور بعض دوسرے مواقع پر کیونکہ گمراہ کن ہے اس لئے ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ اسکی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہ پہلو انسان کی خصوصیات میں سے ہے۔

انسان عبارت کی طرح ہے۔ بعض الفاظ اور عبارتیں اپنے معنی میں صریح ہوتی ہیں۔ یعنی انسان جب جملہ پڑھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ اس کا مقصود کیا ہے۔ یہ ایک صریح عبارت ہوتی ہے۔ بعض جملوں کی عبارتیں گرہ دار اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ جب آپ سعدی کا ایک شعر یا اسکی کوئی رباعی پڑھتے ہیں تو اس میں اعلیٰ درجے کی صراحت اور وضاحت ہوتی ہے' اسکے معنی اسکے الفاظ ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اشعار ممکن ہے نہایت بلیغ ہوں' اُن کے معنی بہت گہرے اور پرسوز ہوں لیکن وہ گرہ دار اور پیچیدہ ہوں۔ لفظ اس طرح معنی کا اظہار نہ کررہے ہوں جس طرح انہیں کرنا چاہئے' اسکی بعض عبارتیں واقعاً معمہ ہوں' انسان نہیں سمجھ پاتا ہو کہ ان کا مقصود کیا ہے اور کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔

بعض عبارتوں کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے اور باطن کچھ اور۔ جب انسان اسے دیکھتا ہے تو پہلے پہل اس کا ایک مطلب سمجھتا ہے لیکن جب اس میں خوب غور وفکر کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ اس کا مقصود اس سے مختلف ہے جو اس کا ظاہر بتا رہا ہے۔

انسان بالکل عبارتوں کی طرح ہیں۔ انسانوں کے ظواہر اُن کی نیتوں کے حوالے سے لفظ اور معنی کی طرح ہیں۔

پس منافقت کے بالمقابل نقطہ کیا ہے؟

صراحت وصداقت۔

اسلام ایک مسلمان سے صراحت وصداقت چاہتا ہے۔ مسلمان کو صریح ہونا چاہیے۔ اُسے استعارہ بالکنایہ اور کنائے پر مشتمل جملے کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ اسے سچا ہونا چاہیے' جھوٹا نہیں۔ کیونکہ ہر نفاق میں جھوٹ بھی چھپا ہوتا ہے۔ البتہ جھوٹ ہم زیادہ تر الفاظ کے ذریعے بولتے ہیں لیکن منافقت میں جھوٹ کبھی لفظ کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی اظہار اور عمل کے ذریعے۔ انسان اپنے آپ کو ویسا پیش کرتا ہے جیسا وہ نہیں ہوتا۔ ایک شاعر کے بقول:

آیا تو ہر آنچہ می نمائی ہستی؟

کیا تو اپنے آپ کو جیسا ظاہر کر رہا ہے ویسا ہی ہے؟

(کبھی کبھی انسان اپنے آپ کو) ایک طرح کا ظاہر کرتا ہے جبکہ ہوتا دوسری طرح کا ہے؟ معروف مثل ہے۔ کہتے ہیں: جوفروشی وگندم نمائی۔ (یعنی) انسان جو بیچتا ہو لیکن گندم ظاہر کرتا ہو۔

یہ تھی منافقت کی ماہیت کے بارے میں مختصری گفتگو اور اب اسکے خطرے کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

منافقت کا خطرہ

میں نہیں سمجھتا کہ اب اس بارے میں کوئی شک وشبہ باقی رہا ہوگا کہ منافقت کا خطرہ کفر کے خطرے سے بہت زیادہ اور کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ منافقت کفر ہی ہے۔ لیکن در پردہ۔ یہ پس پردہ کفر ہے۔ اب جب تک یہ پردہ ہٹے اور کفر کا مکروہ چہرہ ظاہر ہو' کتنے ہی لوگ دھوکا کھا چکے اور گمراہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

رسول اللہ اور حضرت علی کی پیشرفت میں فرق کی وجہ

آخر کیوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی پیشرفت کی کیفیت میں فرق تھا؟ ہم شیعوں کی نظر میں حضرت علی اور رسول مقبول کے طریقۂ کار

میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن یہ کیسے ہوا کہ رسول اللہ تو اتنی تیز رفتار پیشرفت کرتے رہے اور یکے بعد دیگرے دشمن کو شکست و زوال سے ہم کنار کرتے رہے لیکن جب حضرت علی کا اپنے دشمنوں سے سامنا ہوا تو وہ سخت مشکل سے دوچار رہے۔ ویسی پیشرفت انہیں حاصل نہ ہو سکی اور بہت سے مواقع پر وہ دشمن سے شکست کھا گئے؟

ایسا کیوں ہوا؟

ایسا اس لئے ہوا کہ رسول اللہ اُن لوگوں سے جنگ کر رہے تھے جو کافر تھے۔ زمانہ رُسول کے منافقین اُس دور سے گزر رہے تھے جب ابھی نفاق کا بیج نیا نیا بویا گیا تھا۔ بعد از اں حضرت علی کو انہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال حضرت علی کو شروع ہی سے منافقین کا سامنا تھا۔ رسول اللہ کا سامنا ابوسفیان سے تھا۔ ابوسفیان جس کا کفر صریح اور واضح تھا۔ ابوسفیان لا الہ الا اللہ کی مخالفت کرتا تھا۔ وہ "اُعْلُ هُبَل" (زندہ باد ھبل) کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ واضح ہے کہ "اعل ھبل" لا الہ الا اللہ سے جنگ نہیں کر سکتا۔ کہاں "لا الہ الا اللہ" کا جاذبہ اور کہاں "اُعل ھُبل" اور ان خرافات کا جاذبہ؟ لیکن معاویہ ہیں تو وہی ابوسفیان اُن کے مقاصد وہی مقاصد ہیں اُن کا راستہ وہی راستہ ہے ہدف بھی وہی ہدف ہے لیکن ان کا نعرہ ویسا ہی نعرہ ہے جیسا نعرہ علی بلند کر رہے ہیں اور بعض مواقع پر وہ اُن سے بھی شدت کے ساتھ بلند کر رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو توحید لا الہ الا اللہ اسلام اور قرآن کا محافظ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ امیر المومنین کے خلاف جس نعرے کے تحت جنگ میں آئے ہیں وہ قرآن کی یہ آیت ہے کہ: وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۳)

اب اس قدر تیز نگاہ کی ضرورت ہے کہ آیت "وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا" جسے معاویہ استعمال کر رہے ہیں اسکے نیچے "اعل ھبل" کی تحریر پڑھی جا سکے اور کہا جا سکے کہ یہ تو وہی "اعل ھبل" ہے۔ لفظ وہ ہیں اور معنی یہ ہیں۔ اسکے لئے انتہائی گہری نگاہ اور غیر معمولی بصیرت درکار ہے۔

اسکی دلیل بہت واضح ہے۔ قرآن کریم کو نیزوں پر اٹھانا۔ کیا ایسی سازش رسول اللہ کے مقابل بھی ہوئی تھی کہ کوئی آئے اور قرآن نیزے پر اٹھالے اور کہے کہ ہمارے اور تمہارے

درمیان یہ قرآن فیصلہ کرے گا؟

یہ تاریخ کے قطعی امور میں سے ہے کہ جب حضرت علی معاویہ کے سامنے ہوئے' تو آپ نے مسلسل پیغام بھیجے اور خط لکھے کہ ہم مسلمان ہیں' تم بھی مسلمان ہو' مسلمانوں کے دو گروہ ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ آؤ دیکھیں جو کچھ قرآن کہتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے علی کی کسی تجویز پر کان نہ دھرے۔ انہیں قرآن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن آخری لحوں میں جب انہیں اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ شکست میں اب چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہ گئے' تو انہوں نے فوراً ایک چال چلی۔ لکھا ہے کہ انہوں نے پانچ سو قرآن نیزوں پر چڑھا لئے (یہاں تک کہ جرجی زیدان جیسے افراد نے پانچ سو قرآن لکھا ہے اور اسے اس امر کے لئے دلیل بنایا جاتا ہے کہ صدر اسلام میں قرآن کو کس سرعت سے لکھا گیا' اس پروپیگنڈے کے برعکس کہ صدر اسلام میں کیونکہ دور جاہلیت میں عرب کتابت نہیں جانتے تھے اس لئے ایک طویل عرصے تک وہ کچھ بھی نہیں لکھتے تھے)

اب آپ دیکھئے کہ اس موقع پر کس قدر بلند فکر اور محکم ایمان کی ضرورت ہے۔ اب بھی علی اپنی فوج سے کہتے ہیں کہ جنگ جاری رکھو' یہ خود قرآن کے خلاف قرآن کا دکھاوا ہے' یہ کاغذ ہے' وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ (آپ کے فوجی) کہنے لگے: آپ کہتے ہیں کہ ہم قرآن سے جنگ کریں؟ ہم ہرگز قرآن سے جنگ نہیں کریں گے۔ ہم اب تک راہ قرآن میں جنگ کرتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ قرآن سامنے آ گیا ہے ہم جنگ نہیں کرتے۔ محال ہے' اصلاً ایک لحہ بھی اس جنگ کا جاری رہنا حرام ہے۔ (آپ نے) فرمایا: تم جنگ نہیں کرنا چاہتے نہ کرو' لیکن جو لوگ جنگ کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دو۔ وہ کہنے لگے: یہ کام حرام ہے' ایک لمحے بھی جاری رہے تو حرام ہے' آپ فوری طور پر مالک اشتر کو واپسی کا حکم دیجئے۔

امیر المومنین کا قول

امیر المومنین کا ایک جملہ ہے۔ یہ جملہ مسلمات تاریخ میں سے ہے کہ صفین و جمل وغیرہ ہی

کے موقع پر امیر المومنین فرماتے تھے کہ:

"رسول اللہ تنزیل پر جنگ کرتے رہے اور مجھے تاویل پر جنگ کرنا ہے۔"

حضرت علی کے کام کی مشکل یہی ہے۔ رسول اللہ تنزیل پر جنگ کرتے رہے۔ یعنی آپ کا سامنا دشمن سے ہوتا' یا آپ دشمن کے سامنے جانا چاہتے' تو معین موقع پر کوئی آیت نازل ہو جاتی۔ اس موقع پر جب یہ آیت نازل ہوتی تو سب مسلمان جان لیتے کہ یہ قرآنی آیت اس موقع سے متعلق ہے۔ وہ نکل کھڑے ہوتے اور جنگ کرتے۔ کسی کے لئے کوئی شک وشبہ باقی نہ رہتا۔

لیکن حضرت علی کو تاویل کے سہارے جنگ کرنا ہے۔ یعنی قرآن کی آیت تو وہی ہے لیکن شانِ نزول وہ شانِ نزول نہیں رہی۔ وہ زمانہ رسول سے تعلق رکھتی ہے۔ روح وہی روح ہے' اسی حکم کی روح ہے لیکن شکل بدل گئی ہے۔ حضرت علی کو تاویل سے جنگ کرنا ہے۔

تاویل کا مادّہ "اَوْل" ہے۔ اوْل یعنی رجوع۔ "مـؤول" یعنی "مرجع"۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ مجھے تاویل پر جنگ کرنا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے اب جس چیز سے جنگ کرنا ہے اُس کا ظاہر اور اُسکی شکل وہ نہیں ہے لیکن اُس کی روح' معنی اور مرجع وہی ہے۔ اس کا ظاہر تو آیت قرآن ہے لیکن اس کی روح' باطن اور معنی وہی کفر ہے۔ یعنی مجھے نفاق کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ میرے کام کی مشکل یہ ہے کہ مجھے نفاق اور منافق کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے میرے کام کو سخت اور دشوار بنا دیا ہے۔

منافق کے ہتھیار

منافق کے ہتھیار کیا ہیں؟

دنیا سے منافق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک انسان ہے منافق بھی رہے گا۔ جب انسان کسی ایسے معاشرے میں ہو جہاں وہ دیکھے کہ جس اصول پر وہاں کے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں اگر اس نے اس کے خلاف اظہار کیا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے' تو وہ فوراً ظاہر داری پر اتر آتا ہے اور انہی کا چولا پہن لیتا ہے۔ البتہ یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ آگاہ ہو اور ظاہر داری اور فریب کے دھوکے

میں نہ آئے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف رسول اکرم منافقت کے خطرے پر شدید پریشانی کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف اس بات پر پریشان ہوتے نظر آتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی امت جاہل رہے' تجزیہ وتحلیل نہ کر سکے اور مسائل میں غور وفکر نہ کرے۔ یہ انتہائی عجیب چیز ہے۔ رسول اللہ نے دو چیزوں پر پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ ایک منافقت اور منافق اور دوسری چیز افراد امت کے جاہل و نادان ہونے پر۔ اس مناسبت سے فرمایا ہے:

"اِنّی لا اَخافُ عَلیٰ اُمَّتی مُؤْمِناً وَلا مُشْرِکاً."

یہاں تک کہ فرمایا:

"وَلکِنّی اَخافُ عَلَیْکُمْ کُلَّ مُنافِقِ الْجَنانِ عالِمِ اللِّسانِ."

اور فرماتے ہیں:

"اِنّی لا اَخافُ عَلیٰ اُمَّتِی الْفَقْرَ وَلکِنْ اَخافُ عَلَیْهِمْ سوءَ التَّدْبیرِ."

مجھے اپنی امت کے فقر اور اسکے پاس مال و دولت کے نہ ہونے کا خوف نہیں۔ یعنی دولت کی کمی میری امت کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ جس چیز کا مجھے ڈر ہے وہ معنوی اور فکری فقر ہے' وہ غور وخوض کا فقر ہے۔ اگر فکری دولت مندی پائی جاتی ہو' تو دولت آجاتی ہے۔ البتہ چاہے اُن کے پاس دنیا بھر سے زیادہ دولت آجائے لیکن اگر وہ فکری افلاس کا شکار ہوں' تو انہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں (جس طرح آج اسلامی ممالک دولتمند ہیں۔ یہ تیل دنیا کی دولت کا عظیم ترین سرچشمہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ اسلامی ممالک کے پاس ہے)

اب اگر دونوں خطرے اکٹھے پیدا ہو جائیں۔ یعنی ایک طرف ظاہر دار زیرک بے دین ہوں' دھوکے باز اور ریا کار منافقین پیدا ہو جائیں اور دوسری طرف لوگ جاہل و نادان ہوں' تو منافقین ان لوگوں کو اپنا ہتھیار بنالیں گے۔

حادثۂ کربلا میں منافقت کا کردار

یہی دو عامل کربلا کے حادثے کو وجود میں لائے ہیں۔ جاہل و نادان افراد' ابن زیاد جیسے

لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے ہم دیکھتے ہیں کہ خود امام حسین علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔ ہمارے (دوسرے) ائمہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعاً سبق آموز اور باعثِ عبرت ہے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ کربلا میں امام حسین کو شہید کرنے کے لئے اکٹھے ہونے والے لوگ اللہ، رسول اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور بے دین کافر افراد تھے تو یہ ہماری غلط فہمی ہے (البتہ ہم اُن کے لیڈروں کے بارے میں نہیں کہہ رہے، عام لوگوں کے بارے میں عرض کر رہے ہیں) اگر ہم یہ سمجھتے ہیں تو پھر ہم بہک گئے ہیں اور اس حادثے سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتے۔ حتیٰ اگر ہم یہ خیال کریں کہ ان لوگوں کا علی اور اولادِ علی پر اعتقاد نہ تھا، تب بھی یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ اگر (وہاں صرف) شام کے لوگ ہوتے تو (اُن کا معاملہ) ایسا تھا۔ اہلِ شام اللہ، رسول اور قرآن پر عقیدہ رکھتے تھے لیکن علی اور اولادِ علی کو نہیں پہچانتے تھے۔ لیکن کوفہ کے لوگ (انہیں) پہچانتے تھے۔ یہ امام حسین کے معاصرین کی گواہی ہے جو سب کے سب کہتے تھے کہ لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ تاریخ لکھتی ہے کہ جب حضرت مسلم کوفے کے مجمع عام میں امام حسین کا خط پڑھ رہے تھے، تو لوگ یہ کہہ کر کہ یہ اُن کے مولا کی باتیں ہیں دھاڑیں مار مار کر روتے اور آنسو بہاتے تھے۔ اسکے باوجود منافقین نے انہی افراد میں سے امام حسین کے خلاف لشکر بنالیا۔ یہ تاریخ کی عبرت ہے۔

امام سجاد کی ایک حدیث

امام سجاد علیہ السلام کی ایک حدیث آپ کے گوش گزار کرتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ لکھتے ہیں کہ: ایک روز امام سجاد نے حضرت ابا الفضل العباس علیہ السلام کے صاحبزادے عبید اللہ ابن عباس بن علی کو دیکھا اور فَاسْتَعْبَرَ یعنی گریہ کرنے لگے، آپ کے آنسو جاری ہوگئے، آپ کو اپنے چچا ابا الفضل العباس، میدانِ عاشورا اور عاشورا کے واقعات یاد آگئے۔ آپ کے اشک بہنے لگے۔ بعد ازاں فرمایا: کچھ دن ایسے ہیں جو رسول اللہ پر نہایت سخت گزرے ہیں۔ ایک احد کا دن تھا جب آپ کے چچا حمزہ اُس کیفیت سے شہید ہوئے، دوسرا موتہ کا دن تھا کہ جب آپ کے

چچازاد جعفر شہید ہوئے لیکن کوئی دن رسول اللہ پر یومِ حسین سے بڑھ کر گراں نہ گزرا۔ پھر امام نے فرمایا: کربلا میں تیس ہزار افراد اکٹھے ہو گئے وَكُلٌّ يَتَقَرَّبُونَ اِلَى اللّٰهِ بِدَمِهٖ (اور سب آپ کا خون بہا کر اللہ کی قربت کے متمنی تھے) ان تیس ہزار افراد نے قصدِ قربت سے فرزندِ رسول کو قتل کیا۔

یہ امام سجاد کی گواہی ہے۔

اگر ایسی فضا نہ ہوتی' تو ابن سعد نویں محرم کی عصر کے وقت نعرہ لگا کر لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے یہ نہ کہتا کہ:

"يَا خَيْلَ اللّٰهِ ارْكَبِي وَبِالْجَنَّةِ اَبْشِرِي."

"اے لشکرِ خدا اٹھ کھڑا ہو' تجھے جنت کی بشارت ہو۔"

جب کوئی مقدس احمق ہو جائے' تو ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا منافق گروہ مسلمان لیکن جاہل و احمق عوام کے درمیان سے فرزندِ رسول کے خلاف اتنا بڑا لشکر تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے جو جملے کہے' آپ انہیں دیکھیں وہ سب عوام کو دھوکا دینے والے ہیں۔ خود عبید اللہ ابن زیاد حضرت مسلم کی طرف رُخ کرتا ہے اور اُنہیں فاسق قرار دیتا ہے۔ (کہتا ہے) یا فاسق! تو فاسق ہے (نعوذ باللہ) مجھے معلوم ہے تو شراب پیتا رہا ہے۔ کسی ایک فرد نے بھی یہ نہ کہا کہ تم جو ایک ایسے پاک باز شخص پر شراب نوشی کا الزام لگا رہے ہو' یہ کس دلیل اور گواہی کی بنیاد پر ہے؟ اب تم پر ایسا الزام لگانے کی وجہ سے اسلامی حد جاری ہونا چاہئے۔ (وہ لوگ) الٹا کہنے لگے: عجیب! یہ شخص شراب خور بھی تھا۔ (وہ بولا) اے فاسق! تو یہاں اس لئے آیا ہے تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں افتراق پھیلا دے' تو آیا ہے تاکہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دے اور تفرقہ پیدا کر دے۔ تو یہاں یہ کرنے اور وہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ حضرت مسلم نے بھی اسے دندان شکن جواب دیا۔ کہنے لگے: فاسق تو' تو خود ہے۔ کیا ہم مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے آئے ہیں یا جماعتِ مسلمین میں تفرقہ پیدا کرنے والے خود تم (لوگ) ہو؟ تم جو بے گناہ انسانوں کا خون بہاتے ہو' مسلمانوں کے بیت المال کی لوٹ مار مچاتے ہو' کسی پر کوئی الزام نہ بھی ہو' تو محض گمان ہی کی بنا پر اُسے مار ڈالتے ہو۔

اس مردِ بزرگوار کا نام آ گیا ہے' وہ مرد جسے ان مقدس مآب جاہل لوگوں نے دھوکا دیا۔ حضرت مسلم نے تن تنہا کوفہ کی اس گرمی میں ایک پورے لشکر سے جنگ کی تھی۔ انہیں شدید پیاس لگ رہی تھی۔ جب وہ دارالامارہ کے دروازے پر پہنچے تو اُن کی نگاہ پانی کے ایک پیالے پر پڑی۔ انہوں نے کہا کہ پانی کا یہ پیالہ مجھے دے دو۔ اُن میں سے ایک نے کہا: اس کا کیا فائدہ ہے؟ تو تو عنقریب قتل ہو جائے گا اور (نعوذ باللہ) حمیم جہنم سے پیئے گا۔ کیونکہ تو ایسا شخص ہے جس نے اپنے امامِ زمان کے خلاف خروج کیا ہے۔ تو نے اللہ کے امر اور حکم کے خلاف عمل کیا ہے۔

مسلم کے لئے یہ الفاظ تلوار کے کسی بھی زخم سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔

یہ جو ہم نے عرض کیا تھا کہ امام حسین خود جانتے تھے۔ ہم (امام کا) وہ جملہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عاشورا کے روز امام کے ارشاد فرمائے ہوئے ایک خطبے کا جملہ ہے۔ یہ خطبہ بہت عجیب ہے۔ میں نے اگر ایک لاکھ بار بھی اسے پڑھا ہو تب بھی میں اسے جب بھی پڑھتا ہوں' تو میری روح میں بالکل تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خطبے میں بڑی ولولہ انگیزی ہے۔

"تَبّاً لَکُمْ اَیَّتُھَا الْجماعۃُ و تَرَحاً."

"اے جماعت! تجھ پر ہلاکت اور غم ٹوٹے۔"

یہاں تک کہ فرمایا: تم نے ہمیں دعوت دی تھی اور ہم آ گئے ہیں۔

"حَشَشْتُمْ عَلَیْنَا ناراً اقْتَدَحْنا عَلیٰ عَدُوِّکُمْ وَ عَدُوِّنا."

"جو آگ ہم نے تمہارے اور اپنے دشمنوں کے خلاف جلائی تھی' تم نے اُس آگ کو ہمارے ہی خلاف استعمال کر ڈالا۔"

جو تلوار ہم نے تمہارے ہاتھ میں دی تھی' اُس سے ہمیں ہی قتل کر دینا چاہتے ہو۔ مجھے شمشیرِ اسلام سے قتل کرنا چاہتے ہو۔

واقعاً جب انسان ان چیزوں پر غور و فکر کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں ان ظاہری زخموں سے' جو حضرت ابا عبداللہ الحسین کے جسمِ مقدس پر لگ رہے تھے کہیں بڑھ کر اور زیادہ تکلیف پہنچانے والی تھیں۔

یہ ظہر کا وقت ہے۔ بعض اصحاب، تمام اہل بیت اور خود امام حسین بعد از ظہر شہید ہوئے۔ البتہ قبل از ظہر یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چند افراد جو پہلے حملے میں مارے گئے وہ ظہر سے پہلے شہید ہوئے تھے۔

آپ نے بار بار سنا ہے۔ امام کا ایک صحابی امام کے پاس آتا ہے۔ عرض کرتا ہے: مولا! ظہر کا اوّل وقت ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں۔ امام اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ اُسکے حق میں دعا فرماتے ہیں: اللہ تجھے نماز گزاروں میں سے قرار دے۔

نماز پڑھتے ہیں۔

یہ دیکھ کر دشمن کہتا ہے: اس نماز کا کیا فائدہ ہے؟ تمہاری نماز تو قبول ہی نہیں، تم لوگ نماز پڑھو یا نہ پڑھو ہر حال میں (نعوذ باللہ) جہنمی ہی ہو۔

امام حسین کے اصحاب میں سے ایک جواب دیتا ہے: کیا فرزند رسول اور امامِ برحق کی نماز قبول نہیں اور تم ابن زیاد اور یزید ابن معاویہ شراب خور سگباز کے نوکروں کی نماز قبول ہے؟

حسینی لشکر نے نماز پڑھی،

کیسی نماز سوزاں! انہوں نے نمازِ خوف ادا کی۔ یعنی نمازِ جنگ نہ کہ ڈر والی نماز۔ نمازِ جنگ کو اصطلاحاً ''نمازِ خوف'' کہتے ہیں۔ حالتِ جنگ کی نماز کے خاص احکام ہیں۔ اگر انسان مسافر نہ بھی ہو تب بھی اسے دو رکعتی نماز پڑھنا ہوتی ہے۔ اس نماز میں امام اور ماموین کی علیحدہ علیحدہ ذمے داری ہوتی ہے۔ امام ایک رکعت پڑھ کر صبر کرتا ہے، ممکن ہے کبھی گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑے، نصف ماموین چلے جاتے ہیں اور دشمن کے مقابل جا کھڑے ہوتے ہیں اور باقی آدھے نماز پڑھتے ہیں۔ وہ نصف جو نماز پڑھتے ہیں امام کی ایک رکعت کے بعد جلدی سے دوسری رکعت پڑھ لیتے ہیں۔ امام انتظار کرتا ہے تا کہ وہ چلے جائیں اور اپنے دوستوں کی جگہ مرکز سنبھال لیں اور وہ دوست آئیں اور نماز پڑھیں۔

امام حسین نے ایسی ہی نماز پڑھی۔ لیکن کیونکہ لشکر گاہ اور میدانِ جنگ کے مابین کوئی فاصلہ نہ تھا۔ یعنی دونوں ایک ہی تھے۔ لہٰذا اس شکل کی نماز کی ضرورت نہ تھی۔ صرف دو تین افراد آگے

آئے اور اُنہوں نے اپنے آپ کو مولا کی سپر بنالیا۔ امام حسین کی طرف سے اس جنگ میں جو امام حسین کی طرف سے ایک چھوٹی سی جنگ تھی' نماز خوف اس شکل کی تھی۔ بڑی جنگوں میں عام طور پر لشکر گاہ کوئی اور مقام ہوتا ہے' اور جس میدان میں جنگ کرتے ہیں وہ اور جگہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے دو سے تین کلومیٹر تک کا فاصلہ ہو۔ (اسلام میں نماز اور جہاد ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں) سپاہیوں کو نماز کی غرض سے آنے جانے کے لئے یہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ لیکن امام حسین اور ان کے اصحاب اس وقت شاید تیس چالیس سے زیادہ نہ تھے۔ سب کے سب دشمن کے مقابل اسی صف' اسی میدانِ جنگ میں موجود تھے اور اب وہاں نماز پڑھنا چاہتے تھے۔ دشمن کو اس قدر احساس نہ تھا' یا یہ کہیں کہ اسے اس بات کی سمجھ نہ تھی (کہ نماز میں حائل نہ ہو) وہ سوچتا ہے' العیاذ باللہ' یہ نماز قبول نہیں ہے۔ جب مولا نماز پڑھ رہے تھے' تو وہ تیر اندازی کرتے ہیں۔ دو یا تین اصحاب نے ان تیروں کے سامنے اپنے بدن کو سپر بنایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ دو رکعتی نماز ختم ہوئی تو ظاہراً سعید بن عبداللہ حنفی حالتِ احتضار کو پہنچ گئے۔ مولا اُن کے سرہانے آئے تو انہوں نے صرف ایک جملہ کہا: اَوَفَیْتُ (کیا میں نے وفا کی؟) میں نے اپنا فریضہ ادا کیا یا نہیں؟

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ واقعاً یومِ عاشورا کی یہ نماز کیا نماز تھی۔ کیسی خلوصِ نیت کی نماز تھی! ایسی نماز تھی کہ وہ دنیا و مافیہا سے منقطع تھے۔ یہ نماز نہ تھی بلکہ اُن کے لئے ایک معراج تھی۔ اُن کا ایک "اللّٰــہ اکبر" پوری دنیا کی نمازوں سے بڑھ کر تھا۔ یہی حال ان کے ایک سبحان اللہ' ایک رکوع' ایک سجدے' ایک تشہد اور ایک اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن کا تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں یومِ عاشورا امام حسین نماز کے علاوہ بھی رکوع' سجود اور ذکر کرتے رہے۔ امام کا آخری ذکر اس وقت تھا جب مولا گھوڑے سے زمین پر گرے۔ لیکن اب کی مرتبہ امام کی پیشانی خاک پر نہ تھی بلکہ آپ کا دایاں رخسار خاک پر تھا۔ آپ کا ذکر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ وَ بِحَمْدِہٖ نہیں تھا' بلکہ آپ کا ذکر یہ تھا: بِسْمِ اللّٰہِ وَ بِاللّٰہِ وَعَلیٰ مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ.....

وصلّی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین.

باسمک العظیم الاعظم الاعزّ الاجلّ الاکرم یااللہ....."

یا اللہ ہم سب کی عاقبت بخیر فرما۔

ہمیں دین مقدس اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔

ہمیں حقیقی اسلام شناس قرار دے۔

یا اللہ ہم سے ہر طرح کی منافقت اور دوروئی کو دور رکھ اور ہمیں ہر طرح کے نفاق اور دوروئی سے بچنے کی بصیرت عنایت فرما۔

خدایا! مسلمان دنیا میں جہاں کہیں ہیں ان کی تائید فرما۔ ان کے دشمنوں کو ذلیل و نامراد فرما۔

ہم سب کے فوت شدگان کو بخش دے اور اُن کی مغفرت فرما۔

رحم اللّٰہ من قرأ الفاتحة مع الصلوات

مسئلہ نفاق ☆

(۲)

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

"وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْم." (۱)

یہ آیات منافقین کے بارے میں ہیں۔ ان میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے بعض منافقین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح آزار پہنچاتے ہیں کہ آپ پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ (آپ کے بارے میں) کہتے ہیں کہ: آپ ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں:

☆ یہ تقریر تقریباً ۱۹۷۱ء میں ظاہرا مسجد الجواد تہران میں کی گئی۔

۱۔ ان میں سے وہ بھی ہیں جو پیغمبر کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو صرف کان ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے حق میں اچھے کان ہیں کہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین کی تصدیق کرتے ہیں اور صاحبان ایمان کے لئے رحمت ہیں اور جو لوگ رسول خدا کو اذیت دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (سورۂ توبہ۔ ۹۔ آیت ۶۱)

ویقولون ھو اذن یعنی وہ تو بس کان ہیں۔ دراصل اُذُنٌ کے معنی کان ہیں۔ جب کسی کے بارے میں مبالغے کے طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ہر ایک کی باتیں سننے والا ہے' تو کہتے ہیں کہ وہ کان ہے۔ فارسی (اور اردو زبان) میں بھی ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں چیز کے بارے میں "سراپا گوش" ہو گیا تھا۔ جب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف سننے ہی میں محو گیا ہے' تو کہتے ہیں کہ سراپا گوش ہو گیا ہے۔ انہوں نے رسولِ اکرم کے بارے میں یہ تعبیر استعمال کی کہ وہ سراپا گوش ہیں۔ اس طرح وہ رسولِ اکرم پر نکتہ چینی کرنا چاہتے تھے کہ آپ سب کی بات سنا کرتے ہیں۔ ہر ایک کی بات پر کان دھرتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کہتی ہے:

"قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ."

"آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے حق میں اچھے کان ہیں۔"

اس سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں آپ کے سامنے بعد میں وضاحت کریں گے۔

اس کے بعد فرماتا ہے:

"يُؤْمِنُ بِاللهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ."

اس آیت کا مفہوم واضح کرنے کے لئے ہمیں چند نکات عرض کرنا ہوں گے۔ ایک یہ کہ رسولِ اکرم کی ایک بہت نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ اپنے تمام صحابہ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ طرح طرح سے محبت' یہاں تک کہ اگر آنحضرت کو اپنے صحابہ میں سے کوئی صحابی تین دن تک دکھائی نہیں دیتا۔ یعنی دیکھتے کہ وہ مسجد میں ہونے والی نشستوں میں نہیں آ رہا' تو پوچھتے کہ فلاں کہاں ہے؟ وہ کیوں ہمیں دکھائی نہیں دیتا؟

ہر عظیم رہنما کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی باتوں سے بے اعتنائی نہیں کرتا' سب کی باتیں سنتا ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ فیصلہ کس طرح کرتا ہے؟

قیادت کے تین طریقے

بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو ہر ایک کی بات پر دھیان دیتے ہیں' اور کیونکہ (لوگوں کی) باتیں ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہوتی ہیں' اس لئے وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ یعنی اُن کی رائے اور فکر دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بسا اوقات بعض افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں کی رائے اُس شخص کے مطابق ہے جس سے اُس نے سب سے آخر میں ملاقات کی تھی' اور اُس نے اُس سے کچھ باتیں کی ہیں' فی الحال اُس شخص کی رائے اُسی کے مطابق ہے۔ اور اگر کوئی اور (اسکے بعد) اُس کے پاس چلا گیا اور اُس نے کوئی اور بات کر دی' تو پھر وہ اُسکی رائے اختیار کرے گا۔ اس قسم کے افراد کمزور افراد ہوتے ہیں اور یہ ایک بہت بُری روش ہے۔ ایسا شخص قائد نہیں ہو سکتا' دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا ہوتا ہے۔

بعض افراد مذکورہ بالا لوگوں کی بالکل الٹ ہوتے ہیں' وہ لوگوں کی شخصیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور کسی کے لئے بھی کسی قسم کے احترام کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ کسی طور کسی کی بھی بات نہیں سنتے۔ دراصل (ان کی نظر میں) لوگوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کوئی بات کریں اور یہ اُن کی بات سنیں۔ یہ بھی بہت بُری روش ہے اور ایک قائد کے لئے بہت بڑا عیب ہے۔ اس قسم کا انسان رہبر و رہنما ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو ایسا رہبر و رہنما ہے جس کے تابع اور زیردست افراد کو اس بات کی کوئی امید ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان کی بات سنے گا۔ وہ لوگوں سے صرف اور صرف اپنی اطاعت چاہتا ہے اور بس۔

حقیقی قائد و رہنما وہ ہے جو (لوگوں کی) باتیں تو سنتا ہے لیکن فیصلہ اس طرح کرتا ہے جیسے کرنا چاہیے۔ یعنی اپنے فیصلے میں ہر کس و ناکس کے نظریے' رائے اور تلقین کے تابع نہیں ہوتا بلکہ حقیقتِ امر کے تابع ہوتا ہے۔

تاریخ' رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اسی تیسری حالت کی نشاندہی کرتی ہے۔ یعنی دونوں خصوصیات نقل کرتی ہے۔ ایک یہ کہ اپنے اصحاب سے بے توجہی نہیں

برتتے تھے۔ جو کوئی بھی آتا اور کہتا کہ میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں' تو آپ اُسکی بات سنتے۔ حتیٰ اگر آپ کو معلوم بھی ہوتا کہ اُسکی بات جھوٹ اور غلط ہے' تب بھی اس کا منھ بند نہ کرتے۔ البتہ اُس (کی بات) کا اثر قبول نہ کرتے لیکن اُسے بات کرنے دیتے اور اُسے ناراض نہ کرتے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی یہ خصوصیت بھی نقل ہوئی ہے کہ آپ فیصلہ کرنے میں اس قدر آزاد رائے اور صاحب استقلال تھے کہ کوئی اس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ کسی کام کا فیصلہ کرنے سے پہلے افراد کی رائے طلب کرتے تھے لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو کوئی شخص آپ کی رائے کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا اور نہ آپ کی رائے کو بدل سکتا تھا۔

رسولِ اکرم کے بارے میں یہ بات فقط ہم مسلمان ہی نہیں کہتے' دوسروں نے بھی جو کتابیں آپ کے بارے میں لکھی ہیں' اُن میں بھی رسولِ اکرم کو ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کی فکر غیر معمولی طور پر بلند تھی۔ جو غیر معمولی طور پر حقیقت بین تھا اور جس میں غیر معمولی طور پر قیادت کی خصوصیات جمع تھیں۔

قیادت و رہبری ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم افراد میں پیدا ہوتی ہے۔ مختلف مزاج افراد کو منظم کر کے چلا لینا اور انہیں اپنے فیصلے اور ارادے کے ماتحت کر لینا ایک ایسا کام ہے جو ہر کسی کے بس میں نہیں۔ قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ." (۱)

آغاز میں پڑھی گئی آیت مطلب اور مفہوم کے اعتبار سے اس آیت سے بہت زیادہ

۱۔ پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لہٰذا اب انہیں معاف کر دو ان کے لئے استغفار کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو اور جب عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۵۹)

مربوط ہے۔

اے رسول! آپ پر اللہ نے جس رحمت کا فیضان کیا ہے' اسکی وجہ سے آپ مومنین کے لئے نرم ہیں۔

یہ قیادت کی خصوصیات میں سے ہے۔ رسولِ اکرم اپنے صحابہ کے ساتھ ایسے نرم تھے کہ سب انہیں اپنا سمجھتے تھے۔ ایک ایسے سخت اور غصیلے رہنما نہ تھے کہ جب لوگ اسکے سامنے کھڑے ہوں تو اسکے رعب اور خوف کے زیر اثر ہوں۔ سیاسی قائدین میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جنہیں رعب دار اور خوفناک کہا جاتا ہے (جیسے نادر شاہ) اور اکثر لوگ خوف کی وجہ سے اُن کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ رسولِ اکرم کو بُرا لگتا تھا کہ لوگ آپ کے رعب میں ہوں اور اگر کبھی آپ دیکھتے کہ لوگ آپ کے رعب کا شکار ہیں' تو کوئی ایسا کام کرتے جس سے اُن پر سے رعب کی یہ کیفیت ختم ہو جائے۔

لکھتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت کے پاس بات کرنے کی غرض سے آیا۔ اُسکے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپ رسول ہیں اور ایسی طاقت کے حامل ہیں' اُسکی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی اور وہ حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔ رسولِ اکرم نے فوراً اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور فرمایا: کس بات سے ڈرتے ہو؟ لَسْتُ بِمَلِکٍ 'میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں' جو مجھ سے ڈر رہے ہو۔ میں تو اُس عورت کا بیٹا ہوں جو اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہا کرتی تھی۔ جو تمہارا دل چاہے کہو۔

یہ وہ نرمی تھی جو رسولِ اکرم میں پائی جاتی تھی۔ "لِنْتَ لَھُمْ لِیْن" آپ نرم دل ہیں۔ وَ لَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ 'اسکے بعد (قرآنِ مجید) قیادت کی اس خصوصیت کا ذکر کرتا ہے۔ اگر آپ ایک تند خو اور سنگ دل آدمی ہوتے' تو لوگ آپ کے اردگرد سے چھٹ جاتے۔ "فَاعْفُ عَنْھُمْ" لہٰذا یہ برائی کرتے ہیں تو آپ درگزر کردیں۔ "وَاسْتَغْفِرْ لَھُمْ" یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی معصیت کرتے ہیں' آپ ان کے لئے مغفرت طلب کریں۔ "وَ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ" کاموں کے سلسلے میں اور معاملات کے نظم ونسق کے لئے لوگوں سے مشورہ کریں' ان کی رائے طلب کریں۔ "فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ" البتہ یہ کسی معاملے میں

آپ کے کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے کی بات ہے۔ لیکن جب آپ فیصلہ کرلیں تو پھر ان کی بات کو اہمیت نہ دیں' پھر آپ اللہ پر توکل' اعتماد اور بھروسہ کریں اور بس۔

اگر رسول اللہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتے' تو پھر کسی کی بات نہ سنتے اور پھر بات سننے کا محل بھی نہ ہوتا۔ جنگ احد کے موقع پر رسول اکرم نے اصحاب کو اکٹھا کیا اور فرمایا: ہمیں اطلاع ملی ہے کہ قریش مدینے کا محاصرہ کرنے آ رہے ہیں۔ تمہاری رائے میں کیا کرنا بہتر ہے؟ کیا ہم مدینے کے اندر رہیں اور محاصرے میں اُن سے جنگ کریں' یا لشکر کو باہر لے جائیں اور صحرا میں اُن کا سامنا کریں؟ زیادہ تر بزرگوں اور تجربہ کار افراد جن کی نظر تمام اوضاع وحالات پر تھی' اُن کی رائے یہ تھی کہ اگر ہم مدینے میں رہیں تو زیادہ کامیاب رہیں گے' وہ آ کر فتح نہیں پا سکیں گے۔ ایک عرصے پڑے رہیں گے۔ پھر اُن کے لیے مشکل حالات پیدا ہو جائیں گے اور وہ خود بخود لوٹ جائیں گے۔ رسول اکرم بھی اسی رائے کو زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ جب جوانوں سے بات ہوئی تو وہ کہنے لگے: کیا ہم مدینے میں محصور رہیں اور وہ آ کر ہمارا محاصرہ کرلیں؟ نہیں' ہم باہر جائیں گے۔ اکثریت انہی (جوانوں) کے ساتھ تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بہت اچھا' اب جب ایسا ہے تو ہم باہر نکلتے ہیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ رسول اکرم مسلح ہو کر باہر نکل آئے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ لشکر حرکت کرے۔

اب نوجوان سوچ میں پڑ گئے۔ اپنے آپ سے کہنے لگے: رسول اللہ کی رائے یہ تھی کہ یہیں رہیں' ایسا نہ ہو کہ ہم نے ان کی رائے کے خلاف بات کی ہو۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ کی رائے یہ ہے کہ یہیں رہا جائے' تو ہم نافرمانی اور مخالفت نہیں کریں گے' کیونکہ خود آپ نے ہم سے رائے طلب کی تھی اس لئے ہم نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا اگر اب بھی آپ یہاں رہنے پر مائل ہوں' تو ہم رہ جائیں گے۔ فرمایا: نہیں' جب کوئی نبی اسلحہ پہن لیتا ہے' تو پھر اتارتا نہیں۔ اب جب ہم کہہ چکے ہیں کہ باہر نکلیں گے' تو پھر باہر ہی نکلیں گے۔

بعض منافقین کا خیال تھا کہ اگر رسول بہت بڑی شخصیت بننا چاہتے ہیں' تو اُنہیں چاہئے

کہ (دوسرے) افراد کی بات نہ سنیں' کوئی آپ سے بات کرنا چاہے تو اس سے کہیں: جاؤ دفع ہو جاؤ' میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ آپ سب کی بات سنتے ہیں۔ لہٰذا کہتے تھے کہ یہ کس طرح کا آدمی ہے' یہ تو ہمہ تن گوش ہے اور سب کی بات سنتا ہے۔ البتہ اس آیت میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہتی ہے: ''یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔''

بدگوئی کرنے والوں کے مقابل رسولِ کریم کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر باتیں کرنے والے لوگ' آپ سے مختلف موضوعات پر بات چیت کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسے افراد بھی آ جاتے تھے جو دوسرے افراد پر تنقید کرتے' اُن کی شکایتیں اور بدگوئی کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ایسے مواقع پر بھی جبکہ جانتے ہوتے تھے کہ شکایتیں کرنے والے جھوٹ بول رہے ہیں' پھر بھی اُن کی تکذیب نہیں کرتے تھے' یہ نہیں کہتے تھے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ البتہ اُن کا اثر قبول نہیں کرتے تھے۔ مثلاً کوئی شخص آتا اور کہتا کہ فلاں نے یوں کیا ہے۔ وہ خود آ جاتا اور کہتا: یا رسول اللہ! میں نے ایسا نہیں کیا۔ ایسے موقع پر رسول اللہ نہ اسکی تکذیب کرتے نہ اُسکی۔

پھر کس طرح عمل کرتے؟

ایک شخص نے کسی کے بارے میں بات کی ہے۔ رسول اللہ جانتے ہوتے کہ اسکی بات جھوٹ ہے' جس آدمی کے خلاف شکایت کی جاتی اُسکی تصدیق کرتے اور تکذیب نہ کرتے۔ یعنی اُس شکایت کرنے والے کی بات کو یوں حساب کرتے جیسے ہوئی ہی نہیں۔ تاہم اسکے باوجود اسکے عمل کو بھی درستی پر محمول کرتے۔

کس طرح؟

اُس سے یہ نہیں کہتے کہ تم جو آئے ہو (اور تم نے یہ بات کہی ہے) 'تم نے دشمنی کی وجہ سے ایسا کیا ہے اور تم تہمت لگانا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم تمہیں سزا دیں گے۔ بلکہ کہتے: اس سے غلطی ہوگئی ہے' اس کا ارادہ بُرا نہیں تھا۔ کوئی شخص آتا اور کسی دوسرے کے خلاف بات کرتا کہ فلاں شخص فلاں

گمراہی کا مرتکب ہوا ہے۔ (یہ سن کر) آنحضرت کسی تاثر کا اظہار نہ کرتے۔

(بعض کہتے ہیں) اگر رسول اللہ اسکی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے' تو پھر اس شخص کی بات کیا ہوئی؟ کم از کم اسے سزا دیں۔ لازماً غلطی کی ہے۔ یہ تو ہر ایک کی بات کی تصدیق کرنا ہوا۔ یعنی رسول اللہ کا طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ نہ وہ رنجیدہ ہوتا اور نہ یہ۔ البتہ ایسا ان مواقع کے علاوہ ہوتا تھا جب کسی کے خلاف شرعی شہادت قائم ہو جاتی تھی' یا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دوسرے پر تہمت لگانا چاہتا ہے اور اسکی بات کو درستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا رسول اکرم درستی پر محمول کرتے اور یہ اسلام کا حکم ہے اور ہمیں بھی اسکے خلاف عمل نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے اندر موجود بیماری

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مسلمان اور مومن بھائیوں کے امور کو مقدور بھر درستی پر محمول کریں' سوائے ایسے مقامات کے جہاں شرعاً یہ راستہ بند ہو جائے۔ یہ عمل اُس بیماری کے برخلاف ہے جو آج ہمارے اندر موجود ہے۔ ہمارے یہاں اس حکم پر بالکل عمل نہیں ہوتا اور ہمیشہ اسکے برخلاف ہوتا ہے۔

فرض کیجئے کچھ افراد ہمارے اور آپ کے پاس آتے ہیں اور ایک شخص کے بارے میں کچھ باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں گمراہی کا مرتکب ہوتا ہے' یا اُس میں عقیدے کا فلاں انحراف پیدا ہو گیا ہے۔

(اسکے بعد) ہم خود اس آدمی سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے بارے میں ایسی بات کی گئی ہے' معاملہ کیا ہے؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اقرار کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ درست کہتے ہیں۔ اگر اس نے اقرار کر لیا تو معاملہ ختم ہو گیا۔ **اقرار العقلاء علی انفسھم جایز** (اپنے بارے میں عقلا کا اقرار کر لینا جائز ہے) اور کبھی وہ کہتا ہے' ایسا نہیں ہے' انہوں نے جھوٹ کہا ہے' میں اس قسم کی گمراہی کا مرتکب نہیں ہوا ہوں' یا عقیدے کا فلاں انحراف جس کی انہوں نے میری طرف نسبت دی ہے وہ درست نہیں ہے۔

کسی نے اپنی کتاب میں ایک چیز لکھی، اُس سے پوچھتے ہیں کہ یہاں آپ کی مراد کیا تھی؟ اُسی سے یہ وضاحت طلب کی جانی چاہئے۔ اصولی طور پر اسلام کا حکم یہ ہے اور ہم اس اسلامی حکم کے بالکل برعکس عمل کرتے ہیں۔

ایک شخص ایک کتاب لکھتا ہے۔ مثلاً اسکی کتاب سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے علمِ امام کے بارے میں کوئی ایسی بات کی ہے جس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کربلا میں اپنی شہادت سے بے خبر تھے۔ (اس صورتحال میں) ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمیں خود اُسی شخص سے رجوع کرنا چاہئے۔ بنیادی طور پر ہماری اسلامی ذمے داری یہی ہے، قبل اسکے کہ ہنگامہ کھڑا کریں، شور وغل مچائیں، باتیں بنائیں۔ خود اُس شخص سے بات کریں، اُس سے کہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے کی وضاحت کریں۔ وہ اپنی رائے بیان کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ صریح اور قطعی طور پر کہہ دے: نہیں، میرا یہ نظریہ نہیں ہے، اور اگر اُس نے کوئی ایسی بات کی جو ہمارے عقیدے کے برخلاف ہے اور وہ ایسا عقیدہ ہے جو ضروریاتِ مذہب میں سے ہے، تو ہم کہیں گے کہ آپ کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔ لیکن اگر وہ خود وضاحت کرے، چاہے وہ وضاحت اسکی عبارت کے ظاہر کے برخلاف ہو اور ہم دیکھیں کہ وہ ایسی وضاحت کر رہا ہے جو بُری نہیں ہے، تو پھر ہمیں خرابی پر محمول نہیں کرنا چاہئے اور شور شرابے، کافر اور فاسق قرار دینے کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ اور پھر آخر واویلا کس بات پر کیا جائے؟

بعض افراد کہنے لگتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ فلاں آدمی ولد الزنا ہے۔

کیسے؟

کیونکہ کہتے ہیں کہ اس نے فلاں بات کی ہے۔ کیا کیا صغریٰ و کبریٰ ترتیب دیتے ہیں! اور نہی عن المنکر کے نام پر کیسے کیسے گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اسلام کہتا ہے:

"اِنْ شَهِدَ عِنْدَكَ خَمْسُونَ قَسَامَةً عَلَىٰ اَنَّهُ قَالَهُ وَ قَالَ لَمْ اَقُلْهُ فَصَدِّقْهُ وَ كَذِّبْهُمْ."

''اگر پچاس شرعی گواہ ایک بات کریں لیکن تم خود اُس سے پوچھو تو وہ کہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی' تو خود اُسکی بات مان لو۔''

(وسائل ۔ ج ۸ ۔ ص ۶۰۹ ۔ کچھ اختلاف کے ساتھ)

جب ہم خود اُس سے پوچھیں اور وہ اس کا انکار کرے' تو ہمیں اُسی کی بات مان لینی چاہیے ۔اب جب ہم نے اُسکی بات قبول کر لی تو جن لوگوں نے آ کر اُسکے خلاف رائے دی تھی اور اُس پر الزام لگایا تھا' اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کیا انہیں فاسق قرار دیں کہ تم نے تہمت کیوں لگائی تھی؟ نہیں' ہم اُن سے بھی بُرا سلوک نہیں کریں گے۔ اُن سے کہیں گے کہ تم سے بھی خطا ہو گئی ہے۔ اُن کے کلام کے بارے میں دوسرے پوچھیں گے' تو ہم جواب دیں گے کہ انہیں غلط فہمی ہو گئی تھی۔ وہ صحیح طرح سمجھ نہیں پائے تھے۔

اگر ایسا ہو' تو اسلامی معاشرے میں انتشار اور اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس حکم پر عمل کریں' تو ہمارے درمیان اس قدر انتشار اور اختلاف نظر نہ آئے۔ جہاں تک ممکن ہو ہم اِس فریق کو بھی درستی پر محمول کریں اور اُس فریق کو بھی۔ کیونکہ اسلام کا حکم ہے کہ:

''ضَعْ فِعْلَ اَخِیکَ عَلیٰ اَحْسَنِہِ۔''

''اپنے بھائی کے فعل کو بہترین صورت پر محمول کرو۔''

اُس آدمی کے عمل کو بھی احسن اور بہتر صورت پر محمول کرو اور اس شخص کے عمل کو بھی اُسکی بھلائی پر محمول کرو اور اُسکی بھی بہترین صورت میں توجیہ کرو۔ ہاں کبھی کبھی ایک ایسا مرحلہ آ جاتا ہے جب ہم توجیہ نہیں کر پاتے۔ کبھی کوئی خود اقرار کر لیتا ہے' یا صاف اور دوٹوک الفاظ میں ایک بات لکھتا ہے' جس کی کسی طور کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی اور اُسکی بات ضروریاتِ دین و مذہب کے خلاف ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مقابلہ کرنا چاہیے اور شدت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ جب کسی امر کے خلاف کوئی شرعی دلیل قائم ہو جائے' تو پھر اس کا معاملہ دوسرا ہو جاتا ہے۔

ایک شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے:

یا رسول اللہ! طَہِّرْنی (اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجیے)

یعنی مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔

کیوں؟

کیونکہ میں نے زنا کیا ہے۔

رسول اللہ اسکے منہ میں بات رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"لَعَلَّکَ نَظَرْتَ."

شاید تم نے کسی نامحرم کی طرف دیکھا ہے' اور اس لحاظ سے کہ کسی نامحرم پر نظر ڈالنا' آنکھ کا زنا ہے' تم کہہ رہے ہو کہ میں نے زنا کیا ہے۔

وہ کہنے لگا: نہیں' اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے' یہ آنکھ کا زنا نہیں تھا۔

(آپ نے فرمایا): لَعَلَّکَ غَمَزْتَ (شاید تم نے اُس کے جسم کو دبایا ہوگا)

تم نے اُسکے چٹکی بھری ہوگی اور کہہ رہے ہو کہ میں نے زنا کیا ہے۔

(وہ کہتا ہے): نہیں' اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ زنا کے بارے میں ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں ہے۔ یکے بعد دیگرے چار مرتبہ اقرار کرنا چاہیے۔

(فرمایا): شاید تم فقط اُسکے پہلو میں لیٹے ہو اور دخول نہ ہوا ہو۔

(اُس نے کہا) نہیں' دخول ہوا ہے کَالْمِیلِ فِی الْمُکْحَلَةِ (جیسے سرمہ دانی میں سلائی)

جب بات یہاں تک پہنچ گئی' تو فرمایا: پھر ٹھیک ہے (اسکے بعد آپ نے اُس پر حد جاری کر دی)

آپ نہ فقط انسان کو بے وجہ الزام نہیں دیتے' بلکہ جہاں تک ممکن ہو' اُسکے عمل کو درستی پر محمول کرتے ہیں۔

کیونکہ اپنے اصحاب کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روش ایسی تھی کہ آپ ممکن حد تک (اُن کے اعمال و گفتار کو) درستی پر محمول کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اگر بعض افراد آنحضرت سے غلط بیانی سے کام لیتے اور جھوٹ بھی بول دیتے' تب بھی (آپ) اُسے درستی پر

محمول کرتے تھے کہ (اُن سے) خطا ہوگئی ہے' غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے' اُن کا ارادہ جھوٹ بولنے کا نہیں تھا۔ بعض افراد کو اس بات کی توقع نہیں ہوتی تھی' بلکہ اُنہیں توقع ہوتی تھی کہ رسول اللہ اُن کی بات سن کر اُنہیں بُرا بھلا کہیں گے' تازیانے ماریں گے' یا کچھ اور کریں گے۔ (وہ لوگ) کہتے تھے کہ یہ کیسے ہے کہ اسکی بات بھی قبول کر لیتے ہیں اور اُسکی بھی' یہ تو سراپا گوش ہو گئے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آپ نے یہ روش منتخب کی ہے۔ البتہ ایسی بات حقیقی مسلمان اور مومن نہیں کہتے تھے' منافقین کہتے تھے' کیونکہ جو شخص رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسی جسارت نہیں کرتا۔

"وَ مِنْهُمْ" اور ان منافقین میں ایسے افراد بھی ہیں کہ "يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ" جو رسولِ اکرم کی ذاتِ مبارک کو اذیت و آزار پہنچاتے ہیں۔ "وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ" اور کہتے ہیں کہ یہ تو کان ہیں' سراپا گوش ہیں۔ یعنی ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں۔

"قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ" کہئے' ہاں کان ہیں' البتہ تمہارے لئے گوشِ خیر ہیں۔ شاید مقصود یہ ہو کہ انہی کانوں سے انہوں نے بہترین چیز یعنی تمہارے لئے وحیٔ الٰہی سنی ہے اور کہی ہے۔ یا ممکن ہے مراد یہ ہو کہ گوشِ خیر ہیں۔ یعنی ایسے کان ہیں جو خیر ہیں۔ تمہارے حق میں اچھے کان ہیں۔ یہ کان تمہارے فائدے میں ہیں۔ ایسے کان نہیں جو تمہارے ضرر میں ہوں' ایسے کان ہیں جو تم سب کے فائدے میں ہیں۔

"يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" یہ کان اپنے اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین کے فائدے کی تصدیق کرتے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: "يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" یہ نہیں فرمایا کہ: "يُؤْمِنُ بِالْمُؤْمِنِيْنَ" خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین پر ایمان رکھتے ہیں۔ بلکہ فرمایا: يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ' یعنی مومنین کے فائدے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مومنین کی باتوں کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جو اُن کے فائدے میں ہو۔ یعنی (اُن کی باتوں کو) جھوٹ پر محمول نہیں کرتے۔ حتیٰ اُن باتوں کو بھی جن کے بارے میں جانتے ہیں کہ جھوٹ ہیں' اُنہیں بھی اس پر محمول نہیں کرتے کہ انہیں بولنے والے کا ارادہ جھوٹ بولنے کا تھا' بلکہ اچھی صورت پر محمول کرتے ہیں کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے' غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔

"وَ رَحْمَةٌ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا." ایک عجیب تعبیر ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" اور دوسری طرف فرماتا ہے: "وَ رَحْمَةٌ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا." جہاں فرمایا گیا ہے: "يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ." (مومنین کے فائدے میں تصدیق کرتے ہیں) یعنی مومنین کی قیادت، مومنین کے معاشرے کا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے۔ لیکن بعد میں فرماتا ہے: وَرَحْمَةٌ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی خاص مومنین کے لئے رحمت ہیں۔ جس مقام پر یہ فرماتا ہے کہ: "يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ." وہاں مومنین کے معاشرے کے بارے میں بات کرتا ہے، جس میں منافقین بھی شامل ہیں، لیکن جہاں کہتا ہے: "لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" وہاں حقیقی مومنین کا ذکر کرتا ہے۔ جو حقیقی مومن ہیں اُن کے لئے آپ کا وجود رحمت ہے۔ یعنی وہ آپ کے وجود کی رحمت سے استفادہ کرتے ہیں۔

کیا پیغمبر سب کے لئے رحمت ہیں یا صرف مومنین کے لئے؟

اس مقام پر بعض نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ آیت میں کیوں فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم بالخصوص تم میں سے حقیقی مومنین کے لئے رحمت ہیں، جبکہ ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر یہ کہ آپ سب عالمین کے لئے رحمت ہوں۔ (۱)

(لہٰذا کیا) رسول اللہ سب لوگوں کے لئے رحمت ہیں یا خاص مومنین کے لئے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اسے ہم ایک مثال کے ذریعے عرض کرتے ہیں، جو خود رسول اکرم نے ذکر کی ہے اور حدیث کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ شہید علیہ الرحمہ نے بھی اسے ''منیۃ المرید'' میں نقل کیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَثَلُ مابَعَثَنِیَ اللّٰهُ مِنَ الْهُدٰی كَمَثَلِ الْغَيْثِ."

''میری اور جس چیز پر اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے (یعنی میری رسالت، بعثت اور دعوت) اسکی مثال بارش کی سی ہے۔''

۱۔ اور ہم نے آپ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰۷)

بارش تمام زمینوں پر ایک سی برستی ہے۔ لیکن زمینیں خود مختلف ہوتی ہیں۔ بعد ازاں زمینوں کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: بعض زمینیں ریگستانی ہوتی ہیں۔ (ان پر) بارش برستی ہے لیکن اِدھر بارش ہوتی ہے اور اُدھر اس کا پانی تہ میں چلا جاتا ہے۔ ایک دن گزر جائے اور ایک دھوپ پڑ جائے تو (معلوم دیتا ہے) گویا بارش ہوئی ہی نہیں۔ اِدھر سے پانی آیا اور اُدھر سے منتقل ہو گیا اور زمین کے اندر چلا گیا اور اس زمین نے اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ لوگوں میں سے ایک گروہ اس طرح کا ہوتا ہے۔

بعض زمینیں نہایت سخت اور سنگلاخ ہوتی ہیں' (ان میں) کہیں کہیں کوئی گڑھا ہوتا ہے جو کچھ پانی کو اپنے اندر لے لیتا ہے اور وہ بہہ نہیں جاتا۔ گویا ایک حوض ہوتا ہے جو پانی کو محفوظ رکھتا ہے' لیکن خود وہ زمین اس پانی سے استفادہ نہیں کرتی' البتہ انسان' حیوان' چرند اور پرند آ کر اس پانی سے استفادہ کرتے ہیں۔ گویا یہ زمین دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ایک ذریعہ تو بنتی ہے لیکن خود فائدہ نہیں اُٹھاتی۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ نے میرے وسیلے سے جو کچھ بھیجا ہے (یعنی میرا قرآن' میرے احکام و سنن) انہیں یہ لوگ اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں (پانی کے ایک حوض کی طرح) دوسروں کے لئے بیان کرتے ہیں اور دوسرے اُن سے استفادہ کرتے ہیں لیکن یہ بدبخت لوگ (ان چیزوں سے) خود کوئی استفادہ نہیں کرتے۔ پانی کی اس حوض سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن خود حوض پانی سے استفادہ نہیں کرتا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ (ایسے افراد ہوتے ہیں جنہیں) ہزار ہا حدیثیں حفظ ہوتی ہیں اور وہ حدیثیں دوسروں کو سناتے ہیں اور وہ (سننے والے) کہتے ہیں کہ میں نے فلاں کے خطاب میں ایک بات سنی تھی اور جس وقت سے میں نے یہ بات سنی ہے اُس وقت سے میں اس طرح کرتا ہوں۔ لیکن وہ (خطیب) خود اپنی بات پر عمل نہیں کرتا۔ وہ ایک ایسے آدمی کی طرح ہے جس نے چلو کباب (ایک ایرانی ڈش) کا ایک ریستوران کھولا ہے اور روزانہ پانچ سو پلیٹیں چلو کباب لوگوں کو فراہم کرتا ہے لیکن خود ایک پلیٹ بھی نہیں کھاتا۔ دوسرے لوگ اس ریستوران سے استفادہ

کرتے ہیں لیکن ریستوران کا مالک آخر میں جا کر نان پنیر کھاتا ہے۔

ایک تیسری قسم کی زمین ہے۔ وہ زمین جس کی مٹی خاک سی ہوتی ہے۔ جب بارش آتی ہے تو یہ خاک پانی کو اس طرح محفوظ نہیں رکھتی جیسے وہ ایک برتن میں ہو بلکہ اپنے اندر جذب کرلیتی ہے' البتہ واپس بھی نہیں کرتی۔ یہ وہ زمین ہے جس میں آپ دیکھتے ہیں کہ پھول' پودے اور سبزہ جات اگتے ہیں' یہ ہے وہ زمین جسے آپ کچھ عرصے بعد دیکھتے ہیں تو وہ سرسبز و شاداب اور پھولوں پودوں سے بھری ہوتی ہے۔

لہٰذا کیا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اُس زمین کے لئے رحمت ہیں جس میں پودے اور سبزہ اُگتا ہے' یا سب کے لئے؟

وہ سب کے لئے رحمت ہیں۔ یعنی بالقوۃ (potentiality) سب کے لئے رحمت ہیں۔ کیونکہ بارش فقط اسی زمین کے لئے تو نہیں برستی' وہ تو سب کے لئے برستی ہے۔

"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ."

''اور ہم نے آپ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

رسول اللہ صرف سلمان وابوذر کی ہدایت کے لئے نہیں آئے ہیں۔ آپ آئے ہیں تاکہ ابوجہل اور ابولہب کو بھی ہدایت کریں۔ لیکن اس رسول سے استفادہ کرنے والے سلمان' ابوذر' مقداد' عمار وغیرہ ہیں' وہ دوسرے لوگ استفادہ نہیں کرتے۔

"یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَکُمۡ لِیُرۡضُوۡکُمۡ." (۱)

سخت اور شدید قسمیں کھانے میں لگے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کیا' ہم نے ویسا نہیں کیا' ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ (لوگ) مومنین کو خوش کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ مومنین بھی شاید وبیش اُن کا اثر قبول کرلیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے تم مومنین کو راضی کرنے کی اتنی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ کوشش کرو کہ اللہ اور رسول کو راضی کرو۔ یعنی منافق نہ بنو۔ مومنین کو خوش کرنے کے لئے

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۶۲

کیوں پے در پے قسمیں کھائے جاتے ہو؟ قسمیں نہ کھاؤ' بلکہ اپنی نیتیں تبدیل کرو' تا کہ اللہ تم سے راضی ہو جائے' تا کہ رسول اللہ تم سے راضی ہو جائیں۔

"وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ." (۲)

"اللہ اور اسکے رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اللہ کو راضی کریں۔"

یہ نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول زیادہ حق دار ہیں کہ تم اللہ اور رسول کو راضی کرو۔ جب حصولِ رضا کا موقع ہو' جو ایک طرح کی عبادت و عبودیت ہے' تو اس میں رسول کو داخل نہیں کرتا۔ اللہ اور اسکے رسول زیادہ حق دار ہیں' رضائے خدا کی راہ میں کوشش کرو۔ یعنی رضائے رسول بھی اللہ ہی کی رضا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ خدا کو بھی خوش کرو اور پیغمبر کو بھی' کیونکہ پیغمبر کی خوشی خدا کی خوشی سے علیحدہ نہیں ہے اور خدا اور خدا کا پیغمبر اسکے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ لوگ خدا کو راضی کریں۔ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ اگر وہ واقعاً مومن اور سچے ہیں۔

"اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا." (۱)

یہ لوگ اس بات سے واقف نہیں کہ جو کوئی بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھگڑا کرے گا' وہ ایک طرف ہوگا اور رسول دوسری طرف' پیغمبر سے اپنا معاملہ جدا کر لے گا اور پیغمبر کے مقابل صف بندی کرے گا اور الگ سمت اختیار کرے گا' جیسے یہ منافقین کرتے ہیں' تو ایسے شخص کے لئے نارِ جہنم ہے۔ خَالِدًا فِيْهَا' جس سے دائمی طور پر باہر نہیں نکلا جا سکتا ہے۔ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ' اور یہ عظیم رسوائی ہے۔

بعد کی آیتیں بھی منافقین کے بارے میں ہیں' جن میں سے چند ایک آپ کے لئے عرض کرتے ہیں۔

"يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ

ا۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۶۳

اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا
نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ لَا
تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ.‘‘(۱)

اوّلین منافقین

پہلے والی آیات میں بعض ایسی اذیتوں کا ذکر تھا جو منافقین اپنی زبان کے ذریعے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیتے تھے۔ اب جو یہ تین آیتیں ہم نے پڑھی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ ایک موقعے پر اُن کی منافقت کا معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ منافقین نے رسول اکرم کو قتل تک کر دینے کا انتہائی خطرناک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس مقام پر قرآن جن منافقین کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ ایسے منافقین نہیں ہیں جو شروع سے رسول اللہ پر ایمان نہیں لائے تھے۔ مثلاً عبداللہ ابن اُبی بن سلول جو پہلے اس گروہ میں سے تھا کہ جب رسول اللہ مدینہ تشریف لائے تو آپ کا وجود اس پر گراں گزرا۔ رسول اللہ کے آنے سے پہلے عبداللہ بن اُبی بن سلول کو مدینہ میں بہت بلند حیثیت حاصل تھی۔ بلکہ اس سے کچھ ہی عرصے پہلے اوس وخزرج کے دونوں قبائل نے اپنے اختلافات ختم کرنے کے لئے اتفاق کیا تھا کہ عبداللہ بن اُبی کو اپنا سردار بلکہ ایک طرح کا بادشاہ منتخب کر لیں۔ ور کہتے ہیں کہ اُس بدقسمت نے تو اپنے لئے ایک تاج بھی تیار کر لیا تھا اور انتظار میں تھا کہ جلد ہی وہ تخت نشین ہو اور اُسکی تاج پوشی ہو۔ لیکن اسی اثنا میں اہلِ مدینہ کا ایک گروہ مکہ میں رسول اکرم پر

۔ منافقین کو یہ خوف بھی ہے کہ کہیں کوئی سورہ نازل ہو کر مسلمانوں کو ان کے دل کے حالات سے باخبر نہ کر دے تو
پ کہہ دیجئے کہ تم اور مذاق اڑاؤ اللہ بہر حال اس چیز کو منظرِ عام پر لے آئے گا جس کا تمہیں خطرہ ہے اور اگر آپ
۔ سے بازپرس کریں گے تو کہیں گے کہ ہم تو صرف بات چیت اور دل لگی کر رہے تھے۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ
راسکی آیات اور رسول کے بارے میں مذاق اڑا رہے تھے۔ تو اب اگر تم میں کی ایک جماعت کو معاف بھی کر دیں
دوسری جماعت پر ضرور عذاب کریں گے کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ (سورہ توبہ ۹ آیت ۶۴ تا ۶۶)

ایمان لے آیا اور پھر ان میں سے کچھ لوگ مکہ آئے اور انہوں نے عقبۂ منیٰ میں رسول اکرم کی بیعت کی اور پھر ایک مبلغِ اسلام کی حیثیت سے مدینہ میں آگئے اور نئے حالات نے جنم لیا۔ عبداللہ بن اُبی کو ایک طرف کر دیا گیا اور پھر اُسے سردار بنانے کا خیال تو بالکل ہی ختم ہو گیا۔ قدرتی طور پر اس شخص کے دل میں ایک گرہ پڑ گئی (البتہ وہ ایک بااثر شخص تھا) عربوں میں قبائلی تعصب بھی ہوتا ہے اور وہ پرستش کی حد تک اپنے سردار کی اطاعت کرتے ہیں۔ عبداللہ بن اُبی اور بہت سے افراد کے پاس اسکے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا کہ ظاہری طور پر ہی سہی اسلام قبول کر لیں۔ البتہ وہ باطن میں دشمنی رکھتا تھے۔ اُن لوگوں کو ہم اوّلین منافقین کہتے ہیں۔

بعد کے منافقین

سورۂ توبہ کی انہی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب ایمان لانے کے بعد منافق ہو گئے تھے۔ یعنی پہلے مومن تھے بعد میں منافق ہو گئے۔ پہلے وہ واقعی مومن تھے لیکن بعد میں بظاہر انہوں نے اسلام سے انحراف تو نہ کیا لیکن باطن میں کفر کی طرف اور رسول اکرم کی حقیقی مخالفت کی طرف مائل ہو گئے' کیونکہ آیت کہتی ہے کہ:

"قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ."

"پہلے تم ایمان لائے تھے لیکن اس وقت تم باطن میں کافر ہو۔"

اس آیت سے اجمالی طور پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے کوئی عمل انجام دیا تھا لیکن جب اُن کا مواخذہ کیا گیا تو کہنے لگے ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ لیکن قرآن نے پردہ نہیں اٹھایا اور نہیں بتایا کہ وہ کام کیا تھا' لیکن آیت کا لہجہ اجمالی طور پر یہ بات سمجھا رہا ہے کہ حقیقتاً ایک شدید مخالفت کی گئی تھی جو کفر کی حد تک تھی۔ طبعی طور پر کوئی ایسا مسئلہ تھا جس سے بعض افراد کو نقصان بھی پہنچا۔ اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بہت مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے معتبر ترین اور آیات کے لہجے سے سب سے زیادہ ہم آہنگ عقبۂ تبوک کا واقعہ ہے۔

آیت کی شانِ نزول' منافقین کا خطرناک ارادہ

احادیث و تواریخ میں آیا ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کے لئے روانہ ہوئے' تو تیس ہزار افراد آپ کے ہم قدم تھے۔ منافقین کا ایک گروہ بھی آپ کے ساتھ تھا۔ اگرچہ اُن میں سے کچھ مدینے میں بھی رہ گئے تھے۔ منافقین کو دکھائی دے رہا تھا کہ یہ سفر دوسرے سفروں سے اور یہ جنگ دیگر جنگوں سے مختلف ہے۔ آنحضرت کی دیگر جنگیں عربوں اور عرب قبائل کے خلاف تھیں' جبکہ یہ جنگ روم جیسی ایک متمدن اور طاقتور مملکت کے خلاف ہے' لہٰذا ان کے وہاں پہنچنے پر وہ (رومی) ان سب کو پیس کر رکھ دیں گے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گئے۔ اگرچہ وہاں جنگ نہیں ہوئی لیکن اسلامی فوج نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور اپنی طاقت دکھلا دی۔ رومی حکومت جنگ کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اسلامی فوج واپس آ گئی۔ منافقین کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس جنگ سے پہلے ان لوگوں کو رسول اللہ کے لئے خطرہ دکھائی دے رہا تھا' اس لئے انہوں نے کچھ کچھ اپنی نیتوں کا اظہار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو واضح کر دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سفر میں (نعوذ باللہ) پیغمبر کا قصہ پاک ہو جائے گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ آپ اس سفر سے کامیاب لوٹ رہے ہیں اور خود وہ بھی کم وبیش پہچان لئے گئے ہیں اور کم از کم پیغمبر اکرم پر معاملہ واضح ہو گیا ہے (تو اپنے آپ سے کہنے لگے) ایسا نہ ہو کہ رسولِ اکرم مدینہ پہنچ کر ہمارے بارے میں کوئی خطرناک فیصلہ کریں' یا ہمارے بارے میں کوئی سورہ نازل ہو جائے اور ہمیں رسوا کر دے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ بات یہاں تک پہنچے ہم ان کا کانٹا ہی نکال دیں۔

انہیں اس بات کا احتمال نظر آ رہا تھا کہ کوئی سورہ نازل ہو جائے گی اور ہمیں رسوا کر دے گی۔ یعنی اُنہیں تجربہ تھا کہ بسا اوقات رسولِ اکرم خفیہ ترین خبروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھ پر وحی آئی ہے اور آیت نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ افراد باطن میں وحی و نبوت پر کوئی ایمان نہیں رکھتے تھے' یا کم از کم اس بارے میں شک میں مبتلا تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ اس آدمی کا کسی جن سے

رابطہ ہے' یا غیر معمولی طور پر باریک بین ہے' یا پھر اسکے پاس بہت لائق جاسوس ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے ہماری خبریں اس تک پہنچ جاتی ہیں اور پھر اس پر آیتیں نازل ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ وہ نزول کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن کیونکہ مومنین اسے نزولِ آیات کہتے تھے لہٰذا وہ بھی یہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

بہر کیف اُنہیں خوف لاحق ہو گیا کہ رسول اللہ جب مدینہ پہنچیں گے تو اُن پر کچھ آیتیں نازل ہوں گی اور وہ رسوا ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ ہم اُن کا قصہ یہیں پر ختم کر دیں۔

آنحضرت کا لشکر تیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اس راستے میں بہت سخت قسم کے پہاڑ آتے ہیں (ہم نے تقریباً خیبر تک یہ نصف راستہ دیکھا ہے۔ اس سے آگے' خاص طور پر خیبر سے شام کی طرف بہت سے پہاڑ ہیں) بعض بہت تنگ اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گزریں گے۔ ایسی گھاٹیاں جہاں سے لشکر اکٹھا نہیں گزر سکتا' وہاں سے دو دو تین تین افراد گزرتے ہیں۔ وہ افراد وہاں گئے اور ایک نہایت مشکل مقام پر گھات لگا کر بیٹھ گئے' تاکہ وہاں پر رسول اللہ کے اونٹ کو بدکا کر یا کسی اور طریقے سے آپ کو درّے کی گہرائی میں گرا دیں اور بعد میں کہیں کہ مثلاً رسول اللہ کا اونٹ بدک گیا تھا' یا ٹھوکر کھا گیا تھا۔

وحی نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کر دیا۔ ظاہراً رات کا وقت تھا اور اُن لوگوں نے اپنے چہروں پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ عمار اور حذیفہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ رسولِ اکرم نے حذیفہ سے فرمایا: آگے جاؤ' وہاں تم چند افراد کو دیکھو گے' اُن سے کہنا کہ معاملہ اس طرح سے ہے اور تم لوگوں نے یہ ارادہ کیا ہے۔ وہ گئے اور اُنہوں نے اُن لوگوں سے کہہ دیا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ رسول اللہ کو پتا چل گیا ہے۔ لہٰذا وہ فرار ہو گئے۔ رسول اللہ نے حذیفہ سے فرمایا: حذیفہ! کیا تم نے اُنہیں پہچانا ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: وہ فلاں' فلاں اور فلاں تھے (رسولِ اکرم نے بارہ یا پندرہ افراد کے نام لئے) ظاہراً خلافِ مصلحت ہونے کی بنا پر خود رسول اللہ کے حکم کی وجہ سے حذیفہ نے اس راز کو فاش نہیں کیا۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ ایسے افراد تھے جن کے ناموں کا ظاہر ہونا اور اُن کا راز فاش ہونا اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف

تھا۔ اسی وجہ سے حذیفہ مسلمانوں کے درمیان ایک رازدار شخص کے طور پر پہچانے جاتے تھے اور بہت سے افراد اپنے بارے میں شک کرتے تھے (اور اُن سے پوچھتے تھے)۔ ظاہراً خلیفہ دوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ حذیفہ سے کہا کرتے تھے کہ: حذیفہ! تم میرے لئے دعا کرتے ہو یا نہیں؟ وہ کہتے: میں مومنین و مومنات کے لئے دعا کرتا ہوں' آپ اگر اُن میں سے ہیں تو آپ بھی اس میں شامل ہیں' وگرنہ نہیں۔

بہر حال ان آیات کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انتہائی اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئی ہیں لیکن جو چیز ان آیات پر سب سے زیادہ ٹھیک بیٹھتی ہے' وہ یہی ہے۔ بعد کی نشست میں ہم ان آیات کی وضاحت کریں گے۔

آیات کا مفہوم

"یَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَیۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ."

منافقین ڈرتے ہیں کہ مبادا اُن کے بارے میں کوئی سورہ نازل ہو جائے اور اُن کے دل میں جو کچھ ہے اور جو اُن کی نیتیں ہیں' وہ اُنہیں بتادے۔

"قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا."

ان سے کہئے: اب تم مذاق اڑا لو۔

"اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ."

باطن میں تمہاری جو نیتیں ہیں' اللہ اُنہیں باہر نکال دے گا اور اپنے نبی کو بتادے گا۔

"وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَ نَلۡعَبُ."

اگر آپ اُن سے اس کام کے بارے میں پوچھیں (بات بالکل مجہول رکھی ہے' گویا کہنا چاہتا ہے کہ: وہ کیا کام تھا جو تم کرنا چاہتے تھے؟) تو وہ کہیں گے کہ ہمارا کوئی سنجیدہ پروگرام نہیں تھا' ہم تو مذاق کر رہے تھے (جیسے کوئی کہے کہ میں تو ویسے ہی آپ کو ڈرا رہا تھا' میں سنجیدہ تو نہیں تھا)

"قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ."

کہیے: کیا تم خدا' آیاتِ خدا اور رسولِ خدا سے مذاق کر رہے تھے؟

"لَا تَعْتَذِرُوْا."

بے بنیاد عذر پیش نہ کرو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ:

"قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ."

تم مومن تھے لیکن کافر ہو گئے ہو۔

"اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ."

تم دو طرح کے لوگ ہو۔ تم میں سے بعض معافی کے لائق ہیں لیکن بعض اس لائق نہیں ہیں۔ اور اگر ہم تم میں سے بعض کو معاف کر بھی دیں' تو بعض کو معاف نہیں کریں گے کیونکہ وہ مجرم ہیں۔

اس گفتگو کا اختتامیہ انشاء اللہ بعد کی نشست میں عرض کریں گے۔(۱)

وصلّی اللّٰہ علی محمّد و آلہ الطاہرین.

باسمک العظیم الاعظم العزّ الاجلّ الاکرم یا اللّٰہ...

یا اللہ! ہمارے دلوں کو نورِ قرآن سے منور فرما' ہماری نیتوں کو خالص فرما۔

یا اللہ! ہمیں حقیقی مسلمان قرار دے۔

یا اللہ! ہم سب کی شرعی حاجات کو بر لا۔ اس رحمت کی شب ہم سب کے گزشتگان کو غریق رحمت فرما۔

رحم اللّٰہ من قرأ الفاتحۃ مع الصلوات.

۱۔ افسوس کہ بعد کی نشست کی کیسٹ نہیں مل سکی۔

۱۳ کے عدد کا دفاع ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"الحمد للّٰہ ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلوۃ و السلام علی عبداللّٰہ و رسولہ وحبیبہ وصفیہ سیّدنا و نبیّنا و مولانا ابی القاسم محمد (صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم) و علی الہ الطیبین الطاہرین المعصومین."

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"وَ كُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیۡ عُنُقِهٖ وَ نُخۡرِجُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلۡقٰىهُ مَنۡشُوۡرًا." (۱)

ہماری آج کی گفتگو ۱۳ کے عدد کی خرافات کے بارے میں ہے۔ اشتہار اور روزنامے میں

☆ یہ تقریر ۲۵ محرم ۱۳۹۰ھ کو حسینیہ ارشاد میں کی گئی۔

۱۔ اور ہم نے ہر انسان کے نامۂ اعمال کو اسکی گردن میں آویزاں کر دیا ہے اور روز قیامت اُسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پیش کر دیں گے۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۳)

جو عنوان دیا گیا ہے وہ ''۱۳ کے عدد کی خرافات'' ہے۔ شاید بہتر ہوتا اگر ہم اس کا عنوان ''۱۳ کے عدد کا دفاع'' قرار دیتے۔ البتہ ہم اپنی معروضات کو مختصر وقت میں سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری گفتگو ۱۳ کے عدد کے دفاع کے بارے میں ہے۔ یہ لفظ جسے بغیر کسی جرم کے اور بغیر کسی برے سابقے کے اس ظالم وستمگر اور قرآنی الفاظ میں ''ظلوم جہول'' انسان نے قابلِ نفرت قرار دے رکھا ہے اور اسے منحوس سمجھ رکھا ہے۔

وہ تمام گناہ' جرائم اور مظالم جن کا ارتکاب خود انسان نے کیا ہے' ان گناہوں اور جرائم کے آثار کو اس نے ذہانت یا حماقت سے اپنے کندھے سے اٹھا کر دوسری ایسی چیزوں کے دوش پر ڈال دیا ہے جنہیں اس نے نحس قرار دے رکھا ہے۔

جن چیزوں کو انسان نے نحس اور منحوس قرار دے رکھا ہے ان میں زیادہ حصہ اعداد کا ہے۔ اب یہ کس بنیاد پر ہے؟ اس بارے میں کیا عرض کریں! لیکن مجموعی طور پر اس مسئلے میں انسان اعداد کے درپے ہوا ہے اور اعداد میں سے اصطلاحاً سب سے مظلوم' بیچارہ اور ستایا ہوا عدد ۱۳ رہا ہے۔

یہ کیسے ہوا کہ یہ عدد سب سے زیادہ ستایا گیا؟

معاشرہ شناس' تاریخ شناس اور وہ لوگ جنہوں نے انسانی فکر اور اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے' اُن کے ذمے ہے کہ ہمیں بتائیں کہ اولاً کیوں ہر شئے سے بڑھ کر انسان نے عدد پر حملہ کیا ہے اور ثانیاً تمام اعداد میں سے ''۱۳'' کا عدد ہی کیوں سب سے زیادہ مظلوم واقع ہوا ہے؟

پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ بات ہماری قوم یا ہماری اقوام سے مختص ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ جن قوموں کو ترقی یافتہ کہا جاتا ہے' یعنی یورپیوں اور امریکیوں نے ہم سے سو گنا زیادہ اس عدد پر ظلم کیا ہے۔ ہم نے اپنے یہاں نہیں دیکھا کہ ۱۳ صفر' ۱۳ فروردین (۱) اور کبھی ہر ماہ کی ۱۳ تاریخ کو' یعنی ان معین دنوں کو برا بھلا کہا جاتا ہو' انہیں منحوس قرار دیا جاتا ہو اور دیگر اعداد کے بارے میں بھی ہم نے ایسا کم دیکھا ہے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا' تو اپنے یہاں ''فریمان'' میں جو

۱۔ ایرانی کیلنڈر کا پہلا مہینہ

ایک لحاظ سے قصبہ اور دیہات ہے اور زرعی علاقہ ہے' فصل کی کٹائی کے وقت ہم جاتے تھے۔ زمیندار جب غلے کا ڈھیر لگاتے' تو اس میں برکت کے لئے کچھ آداب و رسوم کا خیال رکھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ پیمانے بھرتے وقت جب زمیندار ''۱۳'' پر پہنچتے تو اس خیال سے کہ کہیں غلے کے اس ڈھیر سے برکت نہ اُٹھ جائے اُسے ۱۳ نہیں کہتے تھے بلکہ کہتے تھے: ''زیادہ'' اور پھر ۱۴ کہتے تھے۔ زمیندار ڈرتا تھا کہ اگر اس نے ۱۳ کہا تو اس ڈھیر سے برکت جاتی رہے گی۔ البتہ ایک ان پڑھ دیہاتی کا ذہن اس سے آگے نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ۱۳ کے عدد کے چنگل سے بچانے کے لئے اسے ''زیادہ'' میں بدل دیتا تھا' اگرچہ ''۱۳'' اور ''زیادہ'' میں کوئی ربط نہیں۔ البتہ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتا اور اُسکی معلومات بلدیہ تہران کی حد تک ہوتیں' تو وہ کسی اور صورت سے ۱۳ کی نحوست کو مانا کرتا اور کسی اور صورت سے اُس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ جب بلدیہ گھروں اور دکانوں کے باہر نمبر لگاتی ہے' تو وہ (۱۳ کی جگہ) ''زیادہ'' نہیں لکھتی بلکہ ۱+۱۲ یا ۲+۱۱ یا ۱-۱۴ لکھتی ہے۔ (وہ سمجھتی ہے) کہ اگر اُس نے ۱۳ کا عدد لکھا تو بلدیہ جو انتہائی بنیادی کردار رکھتی ہے اُس کا نظام خراب ہو جائے گا۔ جبکہ اُس کی حالت یہ ہے کہ آج سڑک بناتی ہے اور اگلے دن آ کر اس کا پیٹ چاک کر کے اس کا دل اور آنتیں باہر نکال رہی ہوتی ہے۔

۱۳ کے عدد کی نحوست کے خیال کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ یہ فکر پیدا کہاں سے ہوئی؟ نہ ہم چاہتے ہیں اور نہ اس مختصر سے وقت میں اسکے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں قرآن و حدیث کے حوالے سے ہمیں جو گفتگو کرنا ہے وہ رہ جائے گی۔ اجمالی طور پر عرض ہے کہ:

ہماری رائے میں انسان کی دو خاصیتیں ایسی ہیں جو اشیا اور اعداد میں نحوست ہونے کے تصور کا باعث بنی ہیں۔ ایک یہ کہ کلی طور پر انسان خود پسند ہے۔ اس میں ذمے داریاں قبول کرنے سے گریز کا مادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں چاہتا کہ کسی شکست کی ذمے داری اس پر عائد ہو۔ وہ

ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ کوئی اور چیز پیدا کر لے اور یہ کہہ سکے کہ اس شکست اور بدبختی کا سبب میں نہیں ہوں۔ میری فکر، میرا سلوک، میری روح، میری خطا کرنے کی عادت اور میرا جہل و نادانی نہیں جو اس شکست کا باعث بنا ہے، (اس ناکامی کی وجہ) کوئی اور چیز ہے۔ اس ایک وجہ سے انسان اپنی ذمے داریوں سے فرار کے لئے اس بات پر اُتر آیا ہے کہ اس نے بدھ کے دن، کو ۱۳ کے عدد کو، ۲۵ کے عدد کو اور کوے اور اُلّو کی آواز کو منحوس قرار دیا۔

(اس حوالے سے) دوسری خاصیت انسان کے اندر سستی کا مزاج ہے۔ انسان جب معاملات کی وجہ سمجھنا چاہتا ہو تو اُسے چاہئے کہ علمی و عقلی طریقوں سے کوشش، غور و فکر، جستجو اور تحقیق کرے، تاکہ معاملات کی حقیقی وجہ جان سکے۔ لیکن یہ تصور کرتے ہوئے کہ تمام معاملات کو جلد حل کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم نے کسی جنگ میں شرکت کی اور شکست کھا گئے، تو یہ جاننے کے لئے کہ ہم نے کیوں شکست کھائی قاعدتاً ہونا یہ چاہئے کہ گہرے علمی اصولوں کی بنیاد پر تحقیق کریں۔ لیکن ایسے مقام پر دو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم خود اس شکست کے ذمے دار تھے، دوسری یہ کہ شکست کے اسباب جاننے کے لئے ہمیں ایک عرصے تک زحمت اٹھانا پڑے گی اور اپنے آپ کو تکلیف دینا پڑے گی اور اسکے بعد ایک اور مصیبت اٹھانا پڑے گی اور وہ یہ کہ ان وجوہات کا سدِ باب کریں اور اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ لیکن ہم ایک جملہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم نے جنگ بدھ کے دن شروع کی تھی، یا وہ ۱۳ تاریخ تھی، یا جب ہم اپنے شہر سے نکل رہے تھے تو کتا سامنے آ کر بھونکنے لگا تھا، یہ نحوست تھی اور ہماری شکست کی وجہ اس کتے کا بھونکنا تھا۔

قرآنِ کریم کا بیان

قرآنِ کریم نے اس مسئلے کو ایک عجیب صورت میں بیان کیا ہے۔ اولاً مختلف اقوام کے بارے میں بتاتا ہے، آلِ فرعون کے بارے میں، قومِ عاد کے بارے میں اور اہلِ انطاکیہ کے بارے میں کہ وہ انبیا کی دعوت کے مقابل فالِ بد کا اظہار کرتے تھے۔ قرآنِ کریم بہت سی آیات

میں انتہائی صراحت سے یہ بات بیان کرتا ہے کہ ہر فالِ بد کی بنیاد اور ہر نحوست جو وجود رکھتی ہے وہ خود انسان کے وجود سے باہر سے نہیں۔ یعنی ممکن ہے خود انسان کی فکر اور اس کا نظریہ نحس ہو۔ جب اسکی فکر و عقیدہ سراسر خرافات اور جہالت ہے تو پھر نحوست جہالت میں ہے، نحوست بُرے اخلاق کے سوا کسی اور چیز میں نہیں، نحوست غلیظ اعمال کے سوا کسی اور چیز میں نہیں۔

انسانی سعادت کے اعتبار سے اگر ہم غور کریں کہ کون سا انکشاف دنیا کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ ہمارے خیال میں عظیم ترین انکشاف جو خود انسان کے لئے مفید اور سعادت بخش ہے اور بہت عمیق اور گراں قیمت ہے لیکن انسان اسے کم قبول کرتا ہے وہ ہے: دَوَاؤُکَ فِیکَ وَدَاؤُکَ مِنکَ. اے انسان! تیرا درد خود تجھ سے پیدا ہوتا ہے، اپنی بدبختی کا سرچشمہ خود تو ہے کوئی اور چیز نہیں۔ اپنے لئے بدقسمتی کو خود تو اپنے ہی ہاتھوں وجود میں لاتا ہے۔ تیری بدبختی کا ذمے دار کوئی اور نہیں ہے اور اسی طرح اپنی قسمت بدلنا بھی خود تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس نحوست اور اس بدبختی کا علاج بھی خود تیرے وجود کے اندر ہے۔

"وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا."

"اور ہم نے ہر انسان کے نامۂ اعمال کو اُسکی گردن میں آویزاں کر دیا ہے اور روزِ قیامت اُسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پیش کر دیں گے۔"

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۳)

کیونکہ عربوں میں فال بد لینے کی بنیاد پرندوں سے پڑی تھی اور وہ بعض پرندوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ لہٰذا بُری فال لینے کو انہوں نے "تطیّر" کا نام دیا۔ وہ کوے یا اُلو کی آواز سے فال بد لیتے تھے۔ تواریخ میں لکھا ہے اور کتبِ مقاتل میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ جب اہلِ بیت کے اسیروں کو شام میں داخل کیا گیا اور لوگ اُن کے استقبال کے لئے باہر آئے تھے، تو گویا خود یزید ابن معاویہ بھی شہر کے باہر ایک مقام پر آیا تھا۔ وہاں ایک کوے نے آواز نکالی تو اُس نے اس چیز سے فال بد لی اور پھر اُس نے یہ رباعی کہی:

لَمَّا بَدَتْ تِلْکَ الرُّؤُوسُ وَاَشْرَقَتْ
تِلْکَ الشُّمُوسُ عَلیٰ رِدیٰ جیرونِ
صَاحَ الْغُرَابُ فَقُلْتُ صِحْ اَوْلَا تَصِحْ
فَلَقَدْ قَضَیْتُ مِنَ النَّبِيِّ دیونی

کہتا ہے: جس وقت سر اور وہ خورشید (اسکی مراد قیدی عورتیں ہیں) دور سے جیرون (شام کے باہر ایک مقام کا نام تھا' شاید اس وقت بھی وہ اسی نام سے ہو) کی بلندی پر ظاہر ہوئے' تو کوا آیا اور چیخنے لگا۔ میں نے اس سے فالِ بد لی کہ میرے اس عمل کا انجام برا ہوگا۔ لیکن میں نے کوے سے کہا کہ تو چیخ یا نہ چیخ مجھ پر پیغمبر کا جو قرض عائد ہوتا تھا میں نے اُسے چکا دیا ہے۔

دو حدیثیں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی صراحت کے ساتھ فرمایا ہے:

"رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الطِّیَرَةُ."

"میری امت میں تطیر اور فالِ بد کا کوئی وجود نہیں۔"

خود پیغمبر اکرمؐ چیزوں سے نیک فال لیا کرتے تھے اور ہرگز فالِ بد نہیں لیتے تھے اور آپ فالِ بد لینے سے منع کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"اِذَا تَطَیَّرْتَ فَامْضِ وَاِذَا حَسَدْتَ فَلَا تَبْغِ."

"جب بھی تمہارے دل میں کوئی برائی آئے' کوئی میل آئے اور تم فالِ بد لو' تو اُسکی طرف توجہ نہ دو۔"

پھر فرمایا:

"لَا تُعَادُوا الْاَیَّامَ فَیُعَادِیکُمْ."

"دنوں اور زمانوں سے دشمنی کا اظہار نہ کرو ورنہ وہ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''تطیر (اور فال بد لینا) ایک ایسی چیز ہے کہ اگر تم نے اسے سخت لیا تو یہ تم پر سخت ہو جائے گی۔ کیونکہ جب تم اسے سخت لو گے تو اپنے ہی اوپر سختی کرو گے اور اگر تم نے اسے اہمیت نہ دی' تو وہ بھی تم پر توجہ نہ دے گی اور اگر تم نے اسکی طرف توجہ نہ دی تو دیکھو گے کہ یہ کوئی چیز ہی نہ تھی۔''

یہ بہت عجیب جملہ ہے۔

قومِ عاد کے بارے میں آیاتِ قرآن

بہرحال فالِ بد لینا ایک ایسا مسئلہ ہے جو اسلام کی نظر میں ہر نام اور ہر عنوان سے مذموم ہے اور اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آپ کو اسلام کی تمام تر صحیح تعلیمات میں اس سلسلے میں ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دے گا۔

قرآنِ کریم میں دو مقامات پر ''نحس اور یومِ نحس'' کا لفظ آیا ہے' اور یہ بہت قابلِ توجہ بات ہے۔ دونوں ہی جگہ قومِ عاد کے بارے میں ہے۔ ان پر نزولِ عذاب کے بعد کے حوالے سے ہے:

''اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ.''

''ہم نے اُن کے اوپر تیز و تند آندھی بھیج دی ایک مسلسل نحوست والے منحوس دن میں۔'' (سورۂ قمر۵۴۔ آیت ۱۹)

نیز:

''فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ.''

''تو ہم نے بھی اُن کے اوپر تیز و تند آندھی کو اُن کی نحوست کے دن میں بھیج دیا۔'' (سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۶)

مفسرین نے ان آیات میں آنے والے لفظ ''نحس'' کے دو طرح سے معنی کیے ہیں۔ ایک سے مراد یہ ہے کہ سرد اور گرد و غبار والا دن تھا۔ کیونکہ اس دن ٹھنڈی آندھی چل رہی تھی اور غبار اُڑ

رہا تھا' اس لئے قرآن نے اُسے "نحس" کہا ہے۔ کیونکہ لفظ "نحس" کا اصل مفہوم سوائے سختی' شدت' خوفناک اور وحشت آور ہونے کے کچھ اور نہیں ہے۔

بعض نے ایک اور بات کہی ہے (جو ہمارے نزدیک زیادہ قابلِ توجہ ہے) اور وہ یہ کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے ایک منحوس دن میں (ایسا کیا ہے)۔

خود قرآنِ کریم پوری صراحت سے اعلان کر رہا ہے کہ ان لوگوں پر عذاب کیا گیا۔ ان پر کیوں عذاب کیا گیا؟ ان کے اعمال و افکار کی وجہ سے حکمِ الٰہی کے مقابل ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے۔ اس دن جب ان لوگوں نے اپنے عمل کی وجہ سے وہ حتمی تقدیر بنالی اور وہ رسوائی و بدبختی کا شکار ہو گئے' تو قرآنِ کریم اس دن کو یومِ نحس قرار دیتا ہے نہ کہ بدھ' جمعرات' جمعے اور ہفتے کو اور نہ پہلی' دوسری یا تیرہ تاریخ کو۔ ہر وہ دن جب لوگ اپنے اعمال کی سزا میں گرفتار ہوں اور اپنے اعمال کے نتیجے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں' تو انہیں جان لینا چاہئے کہ وہ ایک نحس دن میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ خود قرآنِ کریم وضاحت کرتا ہے کہ:

"قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا."

"کہہ دیجئے کہ وہی اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے یا پیروں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا ایک گروہ کو دوسرے سے ٹکرا دے۔"

(سورۂ انعام ۶۔ آیت ۶۵)

ہماری حالت

ممکن ہے آپ کہیں کہ الحمدللہ ہمیں تو عذاب نہیں ہو رہا' لہٰذا ہمیں کوئی نحس دن پیش نہیں آیا۔ لیکن ہمیں اب سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے سارے دن نحس ہیں' ہمارا ایکم فروردین بھی نحس ہے کیونکہ ہم قرآنِ مجید کی نص کے مطابق عذاب یافتہ لوگ ہیں۔ ہم ایسے لوگ ہیں جو خود ایک دوسرے کی جان کے درپے ہیں' ہم تمام مسلمان اس دور میں ایامِ نحس سے گزر رہے ہیں۔ آپ جو

عذاب الٰہی دیکھ رہے ہیں اس کا سب سے بڑا مظہر اسرائیل ہے۔ کیوں؟ اس کا سبب خود ہمارے اعمال ہیں۔

ہم نے تو صدیوں سے تفرقے' دشمنی اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت ابھارنے کے علاوہ کسی اور راستے پر قدم ہی نہیں اٹھایا۔ لہٰذا ہم پر ہمارے دشمن کا مسلط ہونا قدرتی بات ہے۔

ہم اگر اس نحوست سے نکلنا چاہتے ہیں' تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

کیا شہر سے باہر نکل جائیں' سبزہ زاروں میں جا بیٹھیں یا پھر سمنو(۱) پکائیں تاکہ ہمیں نحوست سے نجات حاصل ہو جائے؟ یا ۱۳ تاریخ کو اپنے گھر سے سبزہ باہر پھینکنے سے کیا ہم نحوست سے نجات حاصل کرلیں گے؟(۲)

اے بے چارے! تو اس دن اپنے گھر سے کیوں نکل جاتا ہے اور مضحکہ خیزی کی طرف کیوں چل پڑتا ہے؟ اپنے آپ سے باہر آ' اپنی اس بُری روش کو ترک کر' اپنی ان بُری عادتوں کو چھوڑ' اپنے ان بُرے افکار سے نکل' اپنی ان نجس اور پلید عادات سے جن میں تو گرفتار ہے' ان سے باہر نکل۔ کیا تو ان کاموں کے ذریعے نحوست سے باہر نکل سکتا ہے؟

۱۳ کا کیا گناہ ہے؟

تیرے گھربار کا کیا گناہ ہے؟

سمنو کے بس میں کیا ہے؟

سبزے پر جا بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے؟

واللہ ان لوگوں کے لئے باعث شرم ہے جو ۱۳ تاریخ کو گھروں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جو لوگ اپنے کام کو تنویر افکار اور تربیت افکار کا نام دیتے ہیں' کیوں (ان مسائل کے بارے میں) ایک لفظ بھی نہیں بولتے' بلکہ بعض اس کے برعکس (ان کاموں کی) ترویج

۱۔ گندم کے آٹے سے کوئی ڈش بناتے ہیں۔

۲۔ ایرانی اپنے سال کے پہلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو ایسے کام کرتے ہیں۔

وترغیب کرتے ہیں۔ خاتم الانبیا کی ولادت کا دن، جس دن تعطیل ہونی چاہئے تا کہ لوگ آئیں اور اس عظیم ہستی کی تعلیمات سے استفادہ کریں، اس دن تعطیل نہیں ہوتی، شاہ مرداں علی ابن ابی طالب کے یوم ولادت پر ہمارے یہاں سرکاری چھٹی نہیں ہوتی، امام حسین ابن علی کے روز ولادت پر ہمیں سرکاری چھٹی نہیں لیکن وہ دن جو ہماری خرافات اور حماقت کی علامت ہے اس دن تعطیل ہوتی ہے۔ جان لیں کہ ان باتوں کا اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے، نہ تیرہ صفر کا نہ کسی اور دن کا۔ میں نے اس سلسلے میں تمام مدارک اور روایات کا جائزہ لیا ہے۔

بعض علما کی غلطی

باعثِ افسوس ہے کہ ہمارے بعض بزرگ علما نے ایام کے اختیارات کے بارے میں کچھ چیزیں لکھی ہیں۔ ہم نے ان کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ انہوں نے اپنے خیال میں لوگوں کو منجمین سے دور کرنے کے لئے انہیں کنویں سے نکال کر گڑھے میں لا پھینکا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی سند کے بعض چیزیں نقل کی ہیں، لیکن ہمارے پاس اس سلسلے میں بہت سی معتبر روایات موجود ہیں، جو ہم سے کہتی ہیں کہ ہم ہرگز ایسی باتوں کی طرف نہ جائیں۔ ستاروں کی کیفیات کن کن باتوں پر دلالت کرتی ہیں، آج فلاں کام کریں اور فلاں نہ کریں۔ ان باتوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ اسلام کے برخلاف ہیں۔ اسلام نے جاہلیت کے زمانے میں رائج فال بد لینے کے خلاف جنگ کی ہے۔ البتہ بعد میں ان چیزوں کے پیدا ہونے کی ایک وجہ ہے۔ جب اغیار کی کتب کے ترجمے کا زمانہ آیا اور یونانی، ہندی اور ایرانی کتب و آثار کا ترجمہ کیا گیا، تو خلفا نے ہر چیز سے زیادہ احکامِ نجوم کے معاملے کی طرف توجہ دی۔ وہ طالع اور ستاروں کو دیکھنے اور اپنی قسمت کا حال جاننے کے بہت زیادہ مشتاق رہا کرتے تھے۔ اس زمانے سے احکامِ نجوم کا معاملہ رائج ہو گیا۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ یہ مسئلہ مذہبی و دینی مسائل میں بھی داخل ہو گیا۔ یہ کام یہودیوں اور شاید سب سے زیادہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں اور ایسے افراد کے ہاتھوں ہوا جو ان امور کا اعتقاد رکھتے تھے۔

کیونکہ اسے عامۃ الناس قبول نہیں کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یوں کیا کہ مثلاً کہنے لگے

کہ پیغمبر اکرم یا امیر المومنین اور امام صادق نے یوں فرمایا ہے۔ لیکن ہماری معتبر احادیث کے ماخذ میں ایسی کوئی بات موجود نہیں۔ بعض چیزیں شاید چھٹی اور ساتویں صدی میں حدیث کی شکل اختیار کر گئیں' اس سے پہلے نہیں تھیں اور اگر اس سے پہلے کوئی معمولی سی چیز ہے بھی' تو وہ بھی بغیر کسی سند کے ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے آئی ہے۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ فلاں کتاب میں ایسی بات آئی ہے اور فلاں عالم نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ اس سب کچھ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایات پر ایک نظر

ہم آپ کا زیادہ وقت نہ لینے کی خاطر' اختصار کے ساتھ ان میں سے چند روایات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ آپ سنیں اور تعجب کریں کہ ہم ایسے کیوں ہیں؟ اس سلسلے میں ایک بات ہے جو خود میرے لئے بھی باعثِ توجہ تھی' وہ بات یہ ہے کہ عام طور پر جب ہم اپنا گھر تبدیل کرتے ہیں اور ایک نئے گھر میں جانا چاہتے ہیں' تو ایک بھیڑ ذبح کرتے ہیں۔ یا اگر ایک چشمہ جاری کرتے ہیں' یا کوئی نیا کام شروع کرتے ہیں' تو ایک بھیڑ ذبح کرتے ہیں۔ وسائل' جلد دوم' صفحہ ۱۹۸ پر صدوق کی معانی الاخبار سے نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم نے "نَهیٰ عَنْ ذبائح الْجِنّ" یعنی آپ نے جن کے لئے ذبح کرنے سے منع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ذبائح کو پرانے زمانے میں ذبیحة الجن کہتے تھے۔ پھر فرمایا:

"وَهُوَ اَنْ یَشْتَرِیَ الرَّجُلُ الدّارَ اَوْ یَسْتَخْرِجَ الْعَیْنَ وَمَا اَشْبَهَ ذٰلِکَ۔"

"کوئی شخص جو گھر خریدتا ہے یا چشمہ نکالتا ہے یا ایسا ہی کوئی کام کرتا ہے۔"

"فَیَذْبَحُ لَهُ ذَبِیحَةً لِلطِّیَرَةِ۔"

"تو وہ ایک بھیڑ ذبح کرتا ہے' تا کہ لوگوں کی نظرِ بد سے بچ سکے۔"

"مَخافَةَ اَنْ لَمْ یَفْعَلْ اَنْ یُصِیبَهُ شَیْءٌ مِنَ الْجِنِّ۔"

"اس خوف سے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو جن اسے نقصان پہنچائیں گے۔"

(ہم نظرِ بد کہتے ہیں' اور معلوم ہوتا ہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب کہتے تھے کہ جن آ کر ایسا

کام کرتا ہے)

"فَاَبطَلَ ذٰلِکَ النَّبِیُّ وَنَهیٰ عَنهُ."

"نبی اکرم نے جاہلیت کی اس رسم کو (جو ہمارے درمیان پھر سے رائج ہوگئی ہے) باطل قرار دیا ہے۔"

وسائل ہماری حدیث کی معتبر کتاب ہے اور اس کا بھی حوالہ میں نے ذکر کر دیا ہے۔

ہمارے پاس چند روایات حضرت (امام علی نقی) ہادی علیہ السلام کے زمانے سے مربوط ہیں۔ کیونکہ آپ کا زمانہ بیشتر ایسا تھا کہ جس میں علم نجوم آیا ہے اور لوگ ان باتوں کے بارے میں پوچھتے تھے۔ احمد دقاق بغدادی کہتا ہے:

"کتبتُ الی ابی الحسن الثانی' اسئله عن الخروج یوم الاربعاء لا یدور."

"میں نے امام ہادی سے مہینے کے آخری بدھ(۱) کے بارے میں سوال کیا۔"

"فَکَتَبَ: مَنْ خَرَجَ یَوْمَ الْاَرْبَعاءِ لا یَدُورُ خِلافاً عَلیٰ اَهْلِ الطِّیَرَةِ وُقِیَ مِنْ کُلِّ آفَةٍ وَعُوفِیَ مِنْ کُلِّ عاهَةٍ."

"فرمایا: لوگ ایسے سوچتے ہیں اور خصوصاً مہینے (یا سال) کے آخری بدھ کو فال بد لیتے ہیں۔ جو کوئی اُن کی اس سوچ کے برخلاف باہر نکل جائے یعنی اللہ پر توکل کرے تو اللہ اس توکل کے بدلے اور فال بد لینے والوں کی اس مخالفت کے

۱۔ یا سال کے آخری بدھ "لا یدور" سے مراد ایسا بدھ ہے جو لوٹ کر نہیں آتا۔ اس وقت مجھ پر واضح نہیں کہ مہینے کا آخری بدھ ہے یا سال کا۔ اگر سال کا آخری بدھ مراد لیں اور سال کو شمسی سمجھیں تو ہم ایرانیوں کے لئے بہت عجیب ہوگا۔ واقعاً بہت عجیب ہے۔ ہمارے شمسی سال کا آخری بدھ آتا ہے تو یہاں تک کہ ہمارے بڑے بڑے علمی اداروں تک میں آگ جلائی جاتی ہے اور یہ کہتے ہوئے آگ کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہیں کہ: "تیری سرخی میری وجہ سے ہے اور میری زردی تیری وجہ سے ہے۔" مجھے نہیں معلوم ہم اپنی حماقتوں پر کس قدر ڈٹے رہنا چاہتے ہیں۔

بد لے اسے ہر آفت اور بیماری سے محفوظ رکھے گا۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"کَفَّارَةُ الطِّیَرَةِ التَّوَکُّلُ."

"فال بد لینے کا کفارہ توکل ہے۔"

یہاں پر جو "کفارے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ فال بد (طیرہ) لینا گناہ ہے۔ اگر آپ اس گناہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں' تو توکل کریں' اس گناہ کا اثر ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح جب رسول اکرم کسی سفر کا قصد کرتے' تو فرماتے:

"اَللّٰھُمَّ لَا طَیْرَ اِلَّا طَیْرُکَ وَلَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ. اَللّٰھُمَّ لَا یَاْتِی بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا یُذْھِبُ بِالسَّیِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ."

یہ ایسی عبارتیں ہیں جنہیں بڑے بڑے کتبوں پر سنہرے حروف سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھئے اس میں کس طرح سے روح توحید' بصیرت اور حقیقت بینی موجزن ہے:

"یا اللہ! کوئی طیر اور فال بد نہیں ہے مگر جو کچھ تیری طرف سے آئے (یعنی جو کچھ تو ہمارے اعمال کی سزا میں ہمیں دے) اور کوئی خیر نہیں مگر وہ کہ جو تیری طرف سے ہو۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں (یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان چیزوں سے شرک اور بت پرستی کی بو آتی ہے) یا اللہ! حسنات تیرے سوا کوئی نہیں دیتا اور سیئات تیرے سوا کوئی دور نہیں کرتا۔ تو مخزن ہے۔ میں اگر حسنات اور اچھائیوں کا طلب گار ہوں' تو تجھ سے اور اگر سیئات اور برائیوں سے دوری چاہتا ہوں' تو تجھ سے۔"

اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں۔ ایک اور روایت نقل کرتا ہوں:

تحف العقول میں منقول ہے کہ ایک شخص جس کا نام "حسن بن مسعود" ہے' اس کا کہنا ہے کہ: دخلت علی ابی الحسن علیّ بن محمّدٍ وقد نکبت اصبعی (میں امام ہادی علیہ السلام کے پاس پہنچا جب کہ میری انگلی زخمی ہو چکی تھی) وتلقانی راکبٌ وصدم کتفی۔ میں

اس تکلیف کے عالم میں جا رہا تھا کہ (ایسے میں راستے میں ایک سوار مجھ سے ٹکرایا اور میرا کندھا مجروح ہوگیا) ودخلت فی زحمة (میں ہزار زحمت اٹھا کے وہاں پہنچا) فخرّ قواعلیّ بعض ثیابی ۔ ہجوم کا دن تھا (جب میں وہاں پہنچا تو وہاں بہت زیادہ لوگ تھے۔ ایسے میں میرا کچھ لباس بھی پھٹ گیا)

میں اس حالت میں امام ہادی کے پاس پہنچا۔ جب داخل ہوا تو میں نے کہا:

''کَفانِیَ اللّٰہُ شَرَّکَ مِنْ یَوْمٍ.''

''آج تو کیا بُرا دن تھا۔''

دیکھیں میری انگلی کا کیا حال ہوا ہے' کندھے پر کیا گزری ہے' اور لباس کا کیا حشر ہوگیا ہے۔ آج میرے لئے کیا بُرا دن تھا۔

''فَما اَشامُکَ!''

''اے دن! تو کیا بُرا دن تھا!''

''فَقالَ لی ابو الحسن: یاحَسَنُ! ھذاوَ اَنْتَ تَغْشانا؟!''

''اس پر مجھ سے امام ہادی نے فرمایا: حسن بن مسعود! تو ایک طرف تو یہ بات کر رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے گھر میں آیا ہے؟''

دیکھئے' کیسی بلیغ اور عالی شان تعبیر ہے: تو ہمارے گھر آیا ہے اور ایسی باتیں کر رہا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ مثلاً امام کے گھر میں آئے اور العیاذ باللہ حضرت علی ابن ابی طالب پر سب کرے' یا انکارِ نبوت کرے یا انکارِ توحید کرے۔

''تَرْمی بِذَنْبِکَ مَنْ لاذَنْبَ لَهُ.''

''تو اپنا گناہ اسکی گردن پر ڈال رہا ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔''

تو اپنا گناہ ''دن'' اور ''یوم'' کی گردن پر ڈال رہا ہے؟

ہم نے عرض کیا تھا کہ ''۱۳'' کے عدد کا دفاع اور دن کا دفاع' آپ دیکھیں کہاں سے طرح سے دفاع کیا جا رہا ہے۔

"قال الحسن: فَاَثابَ اِلَیَّ عَقلی."

"حسن بن مسعود کا کہنا ہے کہ گویا میری عقل کھو گئی تھی، امام کے اس جملے سے وہ پھر ٹھکانے پر آ گئی۔"

"وَتَبَیَّنْتُ خطای."

"اور میں سمجھ گیا کہ میں نے خطا کی ہے۔"

"فَقُلْتُ: مَوْلایَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ."

"اس پر میں نے کہا: اے میرے آقا! میں نے جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے، میں اس پر استغفار کرتا ہوں۔"

"فقال: یاحَسَنُ! ماذَنْبُ الْاَیّامِ حَتّیٰ صِرْتُمْ تَتَشاءَمُونَ بِھا اِذ اجوزیتُمْ بِاَعْمالِکُمْ فیھا."

"آپ نے فرمایا: اے حسن! جب تم دیکھتے ہو کہ انسان جو کچھ ہے صرف اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔"

"فَماذَنْبُ الْاَیّامِ؟"

"تو پھر دنوں کا کیا گناہ ہے؟"

پیر اور بدھ کا کیا گناہ ہے؟ ۱۳ اور ۱۵ کا کیا قصور ہے؟ پھر ان اشعار کی کیا حقیقت ہے کہ؟

هفت روز نحس باشد در مهیب
زان حذر کن تا نیابی هیچ رنج
سه و پنج و سیزده باشا نزده
بیست و یک با بیست و چهار و بیست و پنج

"سات دن نحس ہیں، ان سے بچ کر رہ، تا کہ تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچے اور وہ ہیں ۳، ۵، ۱۳، ۱۶، ۲۱، ۲۴ اور ۲۵۔"

"قال الحسن: اَنَا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اَبَداً وَھِیَ تَوْبَتی."

''حسن نے کہا: مولا! میں استغفار کرتا ہوں اور میری یہی توبہ ہے کہ میں نے آپ کے حضور میں توبہ کی۔''

''قَالَ: وَاللّٰهِ مَا يَنْفَعُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُعَاقِبُكُمْ بِذَمِّهَا عَلٰى مَالَا ذَمَّ عَلَيْهَا فِيهِ.''

''فرمایا: واللہ! ایسی باتیں (تیرا ایام کو گنہگار سمجھنا اور ان کے لئے نحوست کا قائل ہونا) نہ فقط تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں بلکہ اللہ ان پر تجھے عذاب کرے گا۔ اللہ تجھ پر گناہ عائد کرے گا کہ کیوں تو نے میری بے گناہ مخلوق کو مجرم قرار دیا۔''

میں اس زمانے کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔ اے ''فلک کج رفتار'' کہنے والے! تو گنہگار ہے۔ تو اللہ کی بے گناہ مخلوق کو مجرم سمجھتا ہے۔ اے ''چرخِ کج مدار'' کہنے والے! اس منطق کی رو سے تو ایک گنہگار شخص ہے۔ اللہ قیامت کے دن تجھ سے سوال کرے گا کہ بتا یہ موجودات جو اپنے اپنے مدار میں حرکت کر رہے تھے' ان میں سے کس نے اپنے راستے سے انحراف کیا تھا جو تیری مصیبت و بدبختی کی وجہ بن گئے؟

''اَمَا عَلِمْتَ يَا حَسَنُ؟''

''اے حسن! کیا تو نے جانا ہے؟''

اس سے ایک کلی اصول اخذ کیا جا سکتا ہے' اور وہ یہ کہ: انسان کو جاننا چاہئے کہ اللہ ایک مقررہ حساب سے سزا و جزا دیتا ہے۔ وہ انسان کے اعمال' افکار اور نظریات کی بنیاد پر حساب کرتا ہے۔ وہ انسان کے اچھے یا بُرے اخلاق کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے اندر معمولی ترین فکر یا خیال کو بھی پیدا ہونے کی اجازت نہ دے۔

اس سلسلے میں اور بھی روایات ہیں لیکن ہم اسی مقام پر اپنی معروضات ختم کرتے ہیں۔

✿✿

شعائرِ اسلامی کا احترام☆

(۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"الحمد للّٰہ ربّ العالمین باری الخلائق اجمعین و الصلوة و السلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد(صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم)و علی الہ الطیبین الطاھرین المعصومین."

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"ذٰلِکَ وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ."(۱)

وہ اسلامی احکام وقوانین جو سب مسلمانوں کے لئے ہیں' اُن میں سے ایک حکم اسلامی شعائر کے احترام کا لازم ہونا ہے۔یعنی شعائرِ اسلامی کی تعظیم کرنا ہے۔

☆ یہ تقریر تقریباً ۱۹۷۱ء میں مسجد الجواد تہران میں کی گئی۔

۱۔ اور جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا' یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگی۔(سورۂ حج ۲۲۔آیت ۳۲)

پہلے ہمیں لفظ ''شعار'' کے معنی بیان کرنا چاہئیں' تا کہ معلوم ہو سکے کہ تعظیمِ شعار سے کیا مراد ہے۔ اسکے بعد ہم دیکھیں گے کہ کون سی چیزیں شعائرِ اسلامی میں شامل ہیں جن کی تعظیم وتکریم ہمارا فریضہ ہے۔

جس مادّے سے لفظ ''شعور'' ماخوذ ہے اُسی سے شعار نکلا ہے۔ شعور میں علم وادراک کا مفہوم پایا جاتا ہے' جبکہ شعار اُس چیز کو کہتے ہیں جس میں ایک طرح کی وابستگی کا اظہار موجود ہو۔ انسان جو بھی ایسا کام کرے جس کا مفہوم ومعنی یہ ہو (یا کم از کم اس میں یہ پہلو موجود ہو) کہ اس سے انسان کی کسی خاص گروہ' فرقے' ملک' حزب اور جماعت سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہو' اُسے ''شعار'' کہتے ہیں۔ اس لفظ کی بنیاد اُن شعار سے متعلق ہے جو عام طور پر قدیم زمانے کی جنگوں میں سپاہی بلند کیا کرتے تھے۔ پہلے زمانے کی جنگیں جو زیادہ تر تن بہ تن ہوتی تھیں اور بسا اوقات دونوں فوجوں کے افراد ایک دوسرے میں خلط ملط' گتھم گتھا ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کو مارتے تھے۔ اور کیونکہ سب اسلحے میں چھپے ہوتے تھے' علاوہ ازیں سب افراد اپنے تمام ساتھیوں کو قریب سے بھی نہیں پہچان پاتے تھے۔ لہٰذا میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کی شناخت کے لئے اور اپنے ساتھیوں کو دشمن سمجھ بیٹھنے سے بچنے کے لئے اپنی زبان سے ایک جملہ ادا کرتے رہتے تھے تا کہ اس جنگ وجدال کے موقع پر افراد جب ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئیں' تو اسکے شعار سے یعنی جس جملے کی وہ تکرار کر رہا ہو اس سے سمجھ سکیں کہ یہ ان کے اپنے سپاہیوں میں سے ہے یا دشمن کے سپاہیوں میں سے۔ لامحالہ دشمن بھی اپنا شعار دُہراتا رہتا تھا۔ اسکی بھی یہی فکر ہوتی تھی کہ اپنے دوستوں اور رفیقوں کے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔ اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی یہ سلسلہ رہا۔ جیسے علامتی نام جو فوجیوں میں ہوتے ہیں' وہ کبھی کبھی اپنے علامتی نام اور شعار بدل دیتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ دشمن اُن کا شعار سمجھ جائے اور اُس سے غلط فائدہ اُٹھائے۔

توابین کا شعار

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک گروہ نے کوفہ میں توبہ کی۔ وہ کوفہ کے ایسے

افراد تھے جو امام حسین کی نصرت کے سلسلے میں اپنی کوتاہی پر سخت پشیمان تھے۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتے اور خود کو مستحق عذاب سمجھتے تھے۔ وہ لوگ سلیمان بن صرد خزاعی کے ہاں اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ اب جب ہم حسین ابن علی کا ساتھ دینے کی توفیق حاصل نہیں کر سکے۔ لہذا اپنے دامن پر لگے اس سیاہ داغ کو دھونے کی غرض سے ہم خونِ حسین کا انتقام لینے کے لئے قاتلانِ حسین کے خلاف جنگ کریں گے۔ یہ چار ہزار افراد کربلا آئے' امام حسین کی قبر کے سامنے انہوں نے عہد کیا اور قسم کھائی۔ ان افراد کو ''توابین'' کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ مختار کے واقعے سے پہلے کا ہے۔ انہوں نے شامیوں سے جنگ کی اور شہید ہو گئے۔ ان کا شعار یہ تھا۔ ''یا لثارات الحسین'' یعنی ہم خونِ حسین کا انتقام چاہتے ہیں۔

آج کی جنگوں میں ہتھیار اور ذرائع تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب تن بہ تن جنگ کا موقع کم آتا ہے۔ البتہ بعض مواقع پر اب بھی شعار سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ مصریوں نے اپنے حملوں میں ''اللہ اکبر'' کو اپنا شعار قرار دیا ہے اور وہ ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ بہر حال (اب) لفظی شعار سے کم کام لیا جاتا ہے۔

آج کے دور میں زیادہ تر کھیل کے میدانوں میں شعار سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ جب دو ٹیمیں کھیل کے میدان میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں' تو اس مقصد سے کہ کہیں ایک ٹیم کے کسی کھلاڑی کو دوسری ٹیم کا رکن نہ سمجھ لیا جائے اور کبھی ممکن ہے دونوں ٹیمیں مختلف ملکوں سے ہوں' آپ دیکھتے ہوں گے کہ ان کا ایک مخصوص شعار ہوتا ہے' یا ان کے لباسوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں' یا اپنے ملک کا نام اپنے سینے پر اور کبھی اپنے کندھے کے پیچھے لکھ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں' کہ ہم فلاں ٹیم سے ہیں' فلاں دوسری ٹیم سے نہیں' اس ملک سے ہیں اُس سے نہیں۔ یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض قومی شعائر ہیں۔ ہر قوم کے کچھ قومی شعائر ہوتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا پرچم اُس کا شعار ہے۔ ایک قوم کے افراد جب اپنی وابستگی' اپنے وطن اور شہریت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ مثلاً ہم ایرانی ہیں' جب کسی بیرونی ملک میں چلتے ہیں تو مثلاً اپنی گاڑی پر ایران کا سہ رنگی پرچم لگا لیتے ہیں' تاکہ جو کوئی دیکھے جان لے کہ یہ لوگ

ایرانی ہیں۔ یہ پرچم نصب کرنا اس بات کا اظہار ہے کہ میں ایرانی ہوں۔ اسی طرح دیگر ممالک کے شہری بھی اپنے پرچموں کے ذریعے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہیں ''شعائر'' کے معنی جو اجمالی طور پر آپ نے جان لئے۔

اسلامی شعائر

اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ یہ دین بھی ہے دنیا بھی ہے' آخرت بھی ہے زندگی بھی ہے' اسکے معنوی' روحانی اور الٰہی قوانین بھی ہیں اور اجتماعی ضوابط بھی۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے قوانین پائے جاتے ہیں۔ اسلامی آئیڈیالوجی میں ہر چیز موجود ہے۔ اس میں قانونِ اقتصاد ہے' قانونِ سیاست ہے' قانونِ اجتماع ہے' قانونِ عدالت ہے' ثقافت ہے' اخلاق ہے اور معرفتِ خدا ہے۔

کیونکہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے' لہٰذا صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرتا کہ میں اور آپ صرف اپنی ذات کی حد تک مسلمان ہوں۔ جب میں خود اپنی ذات کے لئے جیتا ہوں' ذاتی طور پر ایک مسلمان شخص ہوں۔ یعنی میرے عقائد اسلامی عقائد ہیں اور میں اسلامی قوانین پر عمل کرتا ہوں' اسلامی عبادات نماز اور روزے کو اپنے موقع پر انجام دیتا ہوں' میری شادی اور طلاق جیسے خاندانی قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق ہیں' میرے تجارتی قوانین اسلامی معیارات کے مطابق ہیں' میرے اخلاقی قوانین اسلامی معیارات کی بنیاد پر ہیں۔ لہٰذا بس میں مسلمان ہوں۔

نہیں' ان مسائل کے علاوہ اسلام اپنے اجتماعی کردار کی وجہ سے اور ایک اکائی کی طرح اجتماعی زندگی گزارنے کی خواہش کی وجہ سے اس طرح کے احکام بھی رکھتا ہے اور ان کے علاوہ کچھ شعائر کا بھی مالک ہے۔ ایسے شعائر جن کے ساتھ ایک مسلمان کو زندگی بسر کرنا چاہئے' یعنی اسے اپنی زندگی ان شعائر کے ہمراہ گزارنی چاہئے۔ صرف زبان کے ذریعے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ ہمیشہ ان شعائر کے ذریعے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرے۔ اگر آپ ملک سے باہر کسی جگہ سفر کر رہے ہیں اور اپنی گاڑی پر آپ نے تین رنگوں

والا پرچم لگایا ہوا ہے تو آپ زبان سے نہیں کہہ رہے کہ میں ایرانی ہوں بلکہ اپنے عمل سے اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ میں ایرانی ہوں' میں ایران سے وابستہ ہوں' مجھے اس میں کوئی باک اور شرم نہیں کہ میں ایرانی ہوں' بلکہ مجھے افتخار ہے کہ میں ایرانی ہوں۔ اس پرچم کو نصب کر کے اسکے ذریعے آپ ایران سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارے پاس یہ تمام تر احکام اور قوانین موجود ہیں۔ ہمیں تہذیب نفس کرنی چاہئے' ہمیں خداشناس ہونا چاہئے' نماز گزار ہونا چاہئے' روزے دار ہونا چاہئے' حج کرنا چاہئے' سود خوری سے پرہیز کرنا چاہئے' شراب نوشی سے اجتناب کرنا چاہئے' جھوٹ بولنے سے گریز کرنا چاہئے' صادق اور امین ہونا چاہئے۔ اسلام کے ان لامتناہی احکام و فرامین کے ساتھ ساتھ' جب ہم زندگی گزار رہے ہوں تو ہماری زندگی پر کچھ اور آثار بھی نمایاں ہونے چاہئیں' جن کے ذریعے ہم عملاً کہہ رہے ہوں کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ آثار ہمارے لباس سے ظاہر ہوں' ہمارے چہرے مہرے سے ظاہر ہوں' ہماری محافل سے ظاہر ہوں' ہم کوئی کام شروع کریں تو اس سے ظاہر ہوں' ہم اپنے بچوں کے نام رکھیں تو اس سے ظاہر ہوں' اپنے گھروں میں جو طغرے لگاتے ہیں ان سے ظاہر ہوں' ہماری عمارتوں اور شہر کے اسٹائل سے ظاہر ہوں' الغرض ہماری زندگی کے تمام شعبوں سے ظاہر ہوں۔ یعنی ہمارا گھر کہے کہ میں ایک مسلمان کا گھر ہوں' اگر کوئی ہماری گلی سے گزرے' تو ہمارے گھر کے باہر کوئی ایسی علامت ہو جو یہ بتا سکے کہ یہ ایک مسلمان کا گھر ہے' ہمارے لباس پہننے میں کم از کم ایک علامت ایسی ہو جو یہ کہہ سکے کہ میں مسلمان ہوں۔

ہم نے ان امور میں نہ قومی شعائر باقی چھوڑے ہیں اور نہ اسلامی شعائر' کسی میں بھی نہیں' نہ ہماری عورت میں اور نہ ہمارے مرد میں۔ کوئی بھی آکر ہماری عورت کو دیکھے' تو نہ چہرے مہرے' نہ گھر سے اور نہ کسی اور چیز سے وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ ایرانی ہے یا مسلمان ہے۔ یہی حال ہمارے مرد کا ہے۔ یعنی ہم نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں کوئی شعار باقی نہیں رہنے دیا۔ ہماری تمام حرکات وسکنات کو اعلان کرنا چاہئے تھا۔ اگر ہم ان شعائر کی حفاظت کریں' تو ہم اسلامی شعائر میں اپنی اسلامی روح کو اور اپنے قومی شعائر میں اپنی قومی روح کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن

اگر ہم اپنے شعائر گنوادیں' خصوصاً اگر دوسروں کے شعائر اور رنگ اپنالیں (کیونکہ ہر قوم کا شعار اُس کا رنگ ہوتا ہے) اور پھر ہم کہتے رہیں کہ ہم مسلمان ہیں' ہم ایرانی ہیں لیکن ہم نے فرنگیوں کا شعار اپنایا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فرنگیوں کے حلق کے لئے ایک تر نوالہ ہیں' کہ وہ ہمیں کھالیں اور ہمیں ہضم کر جائیں۔

ہم سادہ اور نسبتاً چھوٹی سی مثال عرض کرتے ہیں۔ البتہ چھوٹی نہیں' معنی کے لحاظ سے بڑی ہے' ہاں ظاہراً چھوٹی ہے۔ ہم موحد ہیں' خدا پرست ہیں۔ خدا پرستی ایک حقیقت ہے' خدا پرستی کوئی شعار نہیں بلکہ واقعیت ہے۔ خدا شناسی حقیقت ہے۔ ہم خدا کو پہچانتے ہیں' اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' عمل میں بھی ہمارا بھروسہ اللہ پر ہے اور ہم اُسکی عبادت کرتے ہیں۔ یہ امر اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس توحید کے کچھ شعائر بھی ہیں۔ یعنی اسلام میں بعض ایسی باتیں ہیں جو توحید کے شعائر ہیں اور ان شعائر کے ذریعے ہم عملاً اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم موحد ہیں' خدا پرست ہیں اور خدا کی معرفت رکھتے ہیں۔

نبوت بھی اپنے مقام پر ایک حقیقت ہے۔ نبوت' یعنی ہم خاتم الانبیا کے وجودِ مقدس تک اللہ کے تمام نبیوں پر یقین رکھتے ہیں اور سب کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مقدس پر آخری نبی کی حیثیت سے اور قرآن پر آخری آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن کچھ شعائر بھی ہیں' جن کے ذریعے ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم نبوت پر ایمان واعتقاد رکھتے ہیں۔ (ممکن ہے ہم موحد ہوں لیکن نبوت پر یقین نہ رکھتے ہوں)

امامت وولایت بھی اسی طرح ہے۔ ہم شیعہ' جو اسلام میں پیشوائی اور امامت کے مسائل میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں' جو ہماری نظر میں اصولِ دین کا حصہ ہے۔ خود امامت بھی اپنے مقام پر ایک حقیقت ہے' جس پر ہمارا ایمان ہے اور ہم جس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ شعائر بھی ہیں جن کے ذریعے ہم ظاہر کرتے ہیں کہ ہم دوسروں کی طرح مسلمان ہیں' دوسروں کی طرح موحد ہیں' دوسروں کی طرح رسالتِ پیغمبر پر اعتقاد وایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ہم

امامت پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہم شیعہ ہیں اور تشیع کے بھی کچھ شعائر ہیں۔

اسلام ایک اجتماعی دین ہے' اور وہ اعتراف کرتا ہے کہ عدالت ایک قطعی اور ثابت شدہ اجتماعی اصول کی حیثیت رکھتی ہے' بلکہ وہ انبیا کو اسکے اجرا و نفاذ پر مامور سمجھتا ہے۔ اور انبیا کی بعثت کے دو مقاصد میں سے ایک مقصد قیامِ عدالت قرار دیتا ہے۔ خود عدالت بھی اپنے مقام پر ایک حقیقت ہے۔ لیکن اسلام کچھ ایسے شعائر بھی رکھتا ہے جن کی بنیاد پر ہم کہیں گے کہ ہمارے دین میں اصولِ عدالت ہے' ہمارے دین میں اصولِ انصاف ہے' ہمارے دین میں ظلم کے خلاف جدوجہد اور ظلم کو قبول نہ کرنا ہے۔ یعنی ہم ان اصولوں کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔

کاموں کی ابتدا کے لئے شعار

اب ہم توحید کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ایک اسلامی شعار (جو اب ہمارے درمیان متروک ہو رہا ہے' ہمیں چاہئے کہ خاص طور پر اس کا ذکر کریں) وہ یہ ہے کہ: ہم جس کسی کام کے آغاز کا ارادہ رکھتے ہوں' ایک ایسا کام جو امیر المومنین کی تعبیر کے مطابق بال و پر رکھتا ہو۔ یعنی ہم اسکی اہمیت کے قائل ہوں۔ جب ہم اسے شروع کرنا چاہیں' اگرچہ غیر اہم کام کے شروع کرنے کے لئے بھی اچھا ہے' لیکن ہمیں چاہئے کہ اہمیت رکھنے والے کاموں کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کریں۔ کام شروع کرنے کے لئے ہر قوم کا اپنا ایک شعار ہوتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے پاس بھی اپنے کام شروع کرنے کے لئے ایک شعار ہے اور وہ توحید ہے۔ (کوئی مسلمان) گاڑی پر سوار ہونا چاہے تو شعارِ توحید دیتا ہے' کھانا شروع کرنے لگتا ہے تو شعارِ توحید دیتا ہے' گھر میں داخل ہونے لگتا ہے تو شعارِ توحید دیتا ہے' کسی عمارت کی تعمیر شروع کرنے لگتا ہے تو شعارِ توحید دیتا ہے اور ہر کام جس کی اہمیت کا قائل ہوتا ہے اسے شروع کرنے لگتا ہے تو شعارِ توحید دیتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مسلمان کا شعار ہے۔ اللہ جو رحمان و رحیم ہے' اُسکے نام سے۔ آپ دیکھئے کہ اس جملے میں کیا کیا معانی جمع ہیں۔ اللہ' یعنی میں ایک ایسی ذات پر ایمان رکھتا ہوں جو

لامتناہی ہے' تمام صفاتِ کمالیہ اس میں جمع ہیں' میں ایک ایسی ذات پر اعتقاد رکھتا ہوں کہ تمام عالمِ ہستی جس کی رحمانیت و رحمت کا مظہر ہے۔ عالمِ ہستی اُسکی رحمت کا مظہر ہے۔ میں اُس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو رحیم ہے۔ یعنی اگر کوئی بندہ اُسکی رضا کے راستے پر قدم اٹھائے تو اُسکی خاص عنایات والطاف اسکے شاملِ حال ہوں گی۔

ہم کیوں اس شعار کو بھولتے جا رہے ہیں؟ کیوں اسے فراموش کرنا چاہتے ہیں؟ کیوں اس شعار کی تحقیر کرتے ہیں؟

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' دراصل لا الہ الا اللہ سے وابستگی کا اعلان ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی کو قابلِ اطاعت نہیں سمجھتا۔ غیر از خدا جو کوئی بھی ہے میں اُس سے آزاد ہوں۔ میں فقط ایک ہستی کے سامنے جھکتا ہوں اور وہ خدا ہے۔ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' یعنی) اُس خدا کے نام سے کہ میں بس اُسی کا بندہ ہوں۔ اگر آپ کو اس سے بہتر کوئی چیز مل جائے تو ہم اس اسلامی شعار سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو اس سے عالی تر اور ترقی یافتہ تر کوئی اور شعار مل جائے' تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

کہتے ہیں کہ یہ رجعت پسندی ہے۔ جبکہ رجعت پسندی یہ ہے کہ انسان ایک انتہائی عالی شعار کو چھوڑ کے ایک کمتر اور پست شعار کو اپنا لے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فرنگی لوگ اپنی کتابوں کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھتے' بلکہ اللہ کا نام ہی نہیں لکھتے۔ یہ دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ ہم بھی نہ لکھیں کیونکہ اس کا فیشن نہیں رہا اور یہ کہنہ اور قدیم ہو گیا ہے۔ ایک شخص جو مادہ پرست ہے اور واقعاً اللہ پر اعتقاد نہیں رکھتا' (اس سلسلے میں) ہم اُس سے بنیادی بات یعنی اللہ کے وجود کے بارے میں گفتگو کریں گے کہ آیا وہ وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ لیکن اُس شخص پر تعجب ہے جو اللہ کے وجود کو مانتا ہے لیکن اپنی کتاب کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اب بعض افراد اس شعار کا دوسرا درجہ لکھتے ہیں ''بہ نام خدا'' یہ اچھا جملہ ہے۔ خدا کے نام سے شروع کیا گیا ہے لیکن ہمیں یہ بات جاننی چاہئے کہ خود ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ایک شعار ہے۔ ہمیں خود اس جملے کو زندہ رکھنا چاہئے۔ آرزو ہے کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے نہایت عالی' ظریف اور خوبصورت

کتبے بنوائے جائیں۔ انہیں اپنے گھروں میں لگائیں۔ ڈریں نہیں' کس کا ڈر ہے؟

ہم اپنی خودی گنوا دینے والے لوگ ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم کسی فرنگی کے سامنے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہیں گے تو وہ ہمیں قدامت پرستی کا الزام دے گا' لہذا ہم کچھ نہیں کہتے۔ (حالانکہ) آپ کی منطق قوی ہے' آپ کسی کے سامنے بھی جائیں اس منطق کا دفاع کیجئے' با آواز بلند بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہیے۔ کیوں نہیں کہتے؟ کیوں بسم اللہ کہنے سے اجتناب کرتے ہیں؟ ہمیں ایک شعار کی حیثیت سے بسم اللہ کی حفاظت کرنی چاہئے اور شعار کی طرح ہی اسکی حفاظت کرنی چاہئے۔ میں اگر دل میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہوں اور کوئی اسے نہ سنے تو پھر یہ شعار نہیں ہے۔ ہمیں اسے بلند آواز سے کہنا چاہئے۔ بلند آواز سے کہنے کی تاثیر ہوتی ہے۔

اگر آپ اپنے گھر میں ہمیشہ بسم اللہ کہتے رہیں' تو آپ کے بچے پر اثر پڑے گا۔ بچے کی روح پر جس قدر شعار اثر ڈالتا ہے اصل حقیقت اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یعنی بچے میں اسکی استعداد نہیں ہوتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ موحد بنے تو شروع ہی سے شعارِ توحید کو اپنے گھر میں داخل کریں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ اسلام' پیغمبر اور قرآن پر اعتقاد رکھے تو شروع ہی سے شعارِ نبوت کو اپنے گھر میں رواج دیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ ائمہؑ اطہار پر ایمان رکھے تو شعارِ امامت کو اپنے گھر میں لے جائیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ اسلام کے اصولِ اجتماعی کا پابند ہو اور اسلام کے اصولوں کو پہچانتا ہو تو اسلام کے حقوق اور عدالت کے شعائر کو اپنے گھر میں لے جائیں۔ جس بچے نے ابھی آنکھ کھولی ہے' اسکے کان سننے لگے ہیں اور وہ سمجھنے لگا ہے' جب وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا باپ ہر کام کرتے وقت' حتیٰ دسترخوان پر بیٹھتے وقت سب سے پہلے بلند آواز میں (آہستہ نہیں کہ بچہ سمجھے ہی نہیں اور اُسکی روح پر کچھ اثر نہ ہو) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے' اُسکے بعد کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جب کھا چکتا ہے تو کہتا ہے الحمدللہ رب العالمین' شکر اللہ' یا اللہ تیرا شکر ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا باپ گاڑی پر سوار ہوتے وقت' گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے' تو یہ عمل بچے کی روح پر بہت اثر کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک شعار جو ہمارے درمیان زندہ رہ گیا ہے اور اسے اور زیادہ

زندہ کرنا چاہئے اور ہمیں اُسکی حفاظت کرنی چاہئے' وہ شعار نبوت ہے' وہ ''صلوات'' ہے' جو ہمارے درمیان معمول ہے اور بہت اچھی بات ہے۔ واقعاً جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم مبارک لیا جائے تو ہمیں صلوات بھیجنا چاہئے اور صلوات بھی بلند آواز سے بھیجنا چاہئے۔ یہ شعار معنی رکھتا ہے۔ جب آپ بلند آواز سے صلوات بھیجتے ہیں تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں قرآن پر اعتقاد رکھتا ہوں' میں قرآن لانے والے پر ایمان رکھتا ہوں' میں قرآن کی باتوں کا پابند ہوں' ان پر ایمان رکھتا ہوں اور انہیں قبول کرتا ہوں۔

''حی علی خیر العمل'' اذان میں تشیع کا شعار ہے۔ سب جانتے ہیں اور اس بات کو اہل سنت کی ادلہ سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شعاری جملہ ہے جو اسلامی متون میں موجود ہے۔ ہمیں یہ شعار بلند کرنا چاہئے۔ علیؑ ولی اللہ ہمیں ایک شیعہ شخص کے گھر میں دکھائی دیتا ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھنے کے بعد اسکے نیچے ہم علیؑ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ یہ وہ شعائر ہیں جنہیں ہمیں زندہ رکھنا چاہئے۔

میں جب اپنے بارے میں سوچتا ہوں' تو دیکھتا ہوں کہ میرے مرحوم پدر بزرگوار جو ابھی دو تین ماہ پہلے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں (ان سے میں نے اس سلسلے میں کئی باتیں سیکھی ہیں) ممکن نہ تھا کہ وہ معمولی اہمیت کا بھی کوئی کام شروع کریں اور بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ کہیں اور کہتے بھی اس طرح سے کہ سب سنتے۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے اس مرد بزرگ نے دنیا سے جانے سے پہلے جو آخری جملہ کہا وہ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی تھا۔ یہ کہا اور ایک دقیقے بعد چل بسے۔ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ انسان اس شعار کے ساتھ دنیا سے جائے۔

نام رکھنے کا مسئلہ

ہمارے شعائر میں سے ایک اور شعار جسے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا معاشرہ مغرب زدگی کے زیر اثر ترک کرتا جارہا ہے' نام رکھنے کا معاملہ ہے۔ ہر قوم اپنے بچوں کے جو نام رکھتی ہے وہ اسکے اپنے مخصوص نام ہوتے ہیں۔ رابرٹ ہمارا نام نہیں' دنیائے عیسائیت کا نام ہے۔ ہم مسلمان

ہیں' مسلمانوں کے اپنے نام ہوتے ہیں اور اسکے لئے حکم بھی موجود ہے۔ حکم ہے کہ ان ناموں کو فراموش نہ ہونے دیں۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہماری جدت پسندی (۱) کے مظاہر میں سے ایک مظہر وہ احساس ہے جو ہمارے بعض طبقات' خصوصاً بعض خواتین میں پیدا ہوگیا ہے۔ اُن کے خیال میں اسلامی نام دقیانوسی ہو چکے ہیں اور اپنے بچوں کے نام حسن اور حسین رکھنے کی وجہ سے ان کی شخصیت مجروح ہوتی ہے (اگرچہ یہ خواتین امام حسن اور امام حسین پر ایمان رکھتی ہیں) لیکن اپنے بچوں کا نام علی' احمد' مصطفیٰ' مرتضیٰ' ابوالقاسم' رضا' کاظم' صادق' باقر اور انبیا کے اسمائے گرامی پر ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' موسیٰ اور عیسیٰ رکھنے پر آمادہ نہیں۔

گویا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نام پرانے ہوگئے ہیں اور ویسے بھی کوئی ممانعت تو ہے نہیں' مسلمانی ان باتوں میں تو نہیں ہے۔ اب اگر میں ان کی جگہ مثلاً تین اور چار ہزار سال پہلے کے آتش پرستوں کے ناموں میں سے کوئی نام رکھ لوں (تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟)

نہیں جناب' مسلمان ہونا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اسلام کو بھی ہماری ضرورت نہیں کہ اس صورت میں وہ ہم سے مصالحت کرے کہ کوئی بات نہیں' میں اس مسئلے میں چشم پوشی کر لیتا ہوں۔ ہمیں یا مسلمان ہونا پڑے گا اور ان اسلامی شعائر کی حفاظت اور نگہداشت کرنا ہوگی جو اسلام سے ہماری وابستگی کا اظہار ہوتے ہیں' یا پھر ہمیں اسلام سے استعفیٰ دینا ہوگا۔ شعائر کو ترک کرنے کا رفتہ رفتہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ بعدازاں ہم اصل مفہوم کو ہی بھلا بیٹھیں گے۔

ہم بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ اسلام کی ماہیت وحقیقت اس بات سے ہرگز وابستہ نہیں کہ میرا نام حسن ہو یا کامران۔ کتنے ہی افراد ایسے گزرے ہیں جن کے نام حسن' حسین اور احمد تھے اور انہوں نے اسلام کی کمر توڑ ڈالی۔ جبکہ ممکن ہے میرا نام ایک غیر اسلامی نام ہو لیکن میں عملاً ایک حقیقی مسلمان ہوں۔ ہم اس بات کے منکر نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر کوئی (مسلمانوں کا

۱۔ یا یہ کہیں کہ ہماری بدقسمتی کے مظاہر میں سے ہے۔ کیونکہ یہ متمدن ہونا تو نہیں' درک وفہم وشعور تو نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کسی چیز کی جگہ کوئی جدید اور تازہ چیز لے آئیں تو یہ تمدن اور ترقی ہے۔

سا) نام (رکھ لینے) سے مسلمان ہو جاتا ہے اور ہر کوئی (غیر اسلامی) نام رکھنے سے اسلام سے نکل جاتا ہے' لیکن عرض کرتے ہیں کہ اس کا بھی دنیائے اسلام میں اپنا ایک حساب ہے۔ ہمیں ان ناموں کی ظروف کی حیثیت سے حفاظت کرنی چاہئے تاکہ ان کا مفہوم و مظروف ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

ایک ایسا شخص جس کے بارے میں ہم صرف یہ جانتے ہوں کہ وہ اپنی پوری زندگی اسلام کا دشمن رہا' جس کے اندر ہمیں اسکے سوا کوئی اور خصوصیت نظر نہ آئے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مصروفِ جنگ رہا' اسکے باوجود ہم اپنے بچے کا نام اسکے نام پر رکھیں۔ مثلاً اپنے بچے کا نام بابک رکھ لیں' کل کو جب ہمارا بچہ بڑا ہوگا' اپنے آپ سے کہے گا کہ میرے دوستوں کے نام حسن' حسین' عباس' علی اور مرتضیٰ ہیں' جبکہ میرا نام بابک ہے' میں دیکھوں تو جس شخص کے نام پر میرا نام رکھا گیا ہے وہ کون ہے؟ جب وہ اُسکے بارے میں معلومات حاصل کرے گا تو دیکھے گا کہ اُس آدمی میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہی نہیں اور اُس میں ظلم اور اسلام کے خلاف جنگ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسکے بارے میں غلط بتایا گیا ہے کہ وہ عربوں سے جنگ کرتا رہا۔ بابک عربوں کے خلاف کہاں لڑا ہے؟ بابک عربوں سے نہیں بلکہ ایرانیوں سے لڑتا رہا ہے۔ بابک کو ایرانیوں نے قتل کیا تھا اور خود اُنہوں نے دو لاکھ پچاس ہزار جانیں دی تھیں۔ عرب تو (وہاں) ایک چھوٹی سی قوم تھے' اُن کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ اُن کا سردار ایک ایرانی تھا جس کا نام ''افشین'' تھا' جس نے بابک سے جنگ کی تھی۔ اُسکے سپاہی بھی سب ایرانی تھے۔ آپ تاریخ کا مطالعہ کریں' آپ دیکھیں گے کہ اُن کے شعار ایرانی تھے' سب کے نام بھی ایرانی تھے۔ جو ایرانی بابک سے جنگ کر رہے تھے اُن کے پاس ایک گرز تھا' جس کا نام اُنہوں نے ''کافرکوب'' (کافر کو مارنے والا) رکھا ہوا تھا۔ بابک عربوں سے نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ عربی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ (اُس زمانے میں) معتصم خلیفہ تھا لیکن اس نے معتصم سے تو جنگ نہیں کی۔ اگر ایرانی مسلمان بابک کو اسلام کا مخالف نہ سمجھتے' تو معتصم کے مفاد میں اس سے جنگ نہ کرتے۔ ایرانیوں کو معتصم سے انتہائی نفرت تھی لیکن وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ معتصم جیسوں سے جنگ کی قیمت پر بابک جیسوں کی حمایت کریں۔ وہ سمجھتے

تھے کہ اگر بابک اور معتصم کے درمیان چناؤ کی نوبت آئے تو پھر معتصم بابک سے بہتر ہے۔

(وہ) بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اُس کا نام بابک ہے فطرتاً اسے اپنے ہم نام سے ایک اُنسیت پیدا ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے بعدازاں صرف اپنے اس نام کی وجہ سے وہ بچہ منحرف ہو جائے۔ یا وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا نام چار ہزار سال پہلے گزرنے والے ایک آتش پرست کے نام پر ہے۔

یہ اسلام ہے مذاق کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اسلامی شعائر کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر ہم اسلام کو چاہتے ہیں، تو ہمیں اسکے شعائر کی بھی حفاظت کرنی چاہئے۔ ہاں اگر اسلام ہی کو نہیں چاہتے تو پھر بات دوسری ہے۔ میں یہ بات اُن لوگوں سے کر رہا ہوں جو مسلمان ہیں اور غفلت کی وجہ سے ایسے کام کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ غفلت سے باہر نکل آئیں۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی نہیں اور اسلام سے عناد رکھتا ہے تو پھر ایسے لوگوں کے لئے ہماری کوئی اور منطق اور کوئی دوسری بات ہے۔

امام حسین کی عزاداری منانے کا مقصد

ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلام میں کچھ اصول اور شعائر ہیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے سوچا ہے کہ ہر سال امام حسین علیہ السلام کی عزاداری منانے کا فلسفہ کیا ہے؟

اسلام کہتا ہے کہ عام افراد کے لئے تین دن عزاداری کی جائے۔ یعنی اگر کسی کا باپ یا بھائی مر جائے تو وہ سوگ کے لئے تین دن گھر میں بیٹھے۔ مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ تعزیت کے لئے اُسکے پاس جائیں اور تین دن بعد یہ غم ختم کر دیں۔ صرف ایک چیز ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہمیشہ اسے منائیں، اس موقع پر گریہ کریں، اسے زندہ رکھیں اور اسے فراموش نہ ہونے دیں اور وہ ہے حسین ابن علی کی عزاداری۔

ایسا کیوں ہے؟

کیا حسین ابن علی کو ہمارے جمع ہونے اور بیٹھ کر اُن کے لئے رونے کی ضرورت ہے؟۔ کیا

ہمارے اس عمل سے اُن کے دل کو تشفی ہوتی ہے۔ العیاذ باللہ کیا اس سے اُن کے دل کی کوئی بھڑاس نکل جاتی ہے؟ یا فاطمہ زہرا علیہا السلام یا حضرت امیر علیہ السلام کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے؟ کیا سرے سے اُن کے دل میں کوئی بھڑاس ہے بھی جسے وہ نکالنا چاہتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: سورۂ فجر پڑھو وہ ہمارے جد حسین ابن علی کا سورہ ہے۔ لوگوں نے کہا: مولا کس مناسبت سے؟ فرمایا: سورۂ فجر کی آخری آیات کی مناسبت سے:

"یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ."

"اے صاحبِ نفسِ مطمئن! اپنے رب کی طرف پلٹ آ' اس عالم میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں شامل ہو جا' اور میری جنت میں داخل ہو جا۔" (سورۂ فجر ۸۹۔ آیات ۲۷ تا ۳۰)

امام حسین علیہ السلام تو اپنے باپ' بھائی' والدہ اور جد بزرگوار کے پاس چلے گئے۔ وہ تو ایک ایسی سعادت سے ہمکنار ہیں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اُن کے دل پر کوئی غبار نہیں جس کی تشفی کے لئے ہم کوئی کام کریں۔

پھر مسئلہ کیا ہے؟

تشفی یہ ہے کہ اسلام کا ایک اصول ہے جسے عدل کہتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ."

"بے شک اللہ عدل' احسان اور قرابتداروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری' ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے۔" (سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۹۰)

اسلام کا ایک اصول ظلم کے خلاف جنگ ہے۔ اس کا ایک اصول ہے رزم آرائی۔ شہادت۔ حسین اسلامی عدل وانصاف کے احیا کی علامت (Symbol) ہیں۔ حسین دنیائے اسلام میں ظلم کے خلاف جہاد کی علامت ہیں۔ حسین اسلامی عدل وانصاف کا شعار ہیں۔

آپ نامِ حسین کو زندہ رکھ کر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم عدلِ اسلامی کے حامی ہیں۔ یہ جو آپ اپنے گھروں پر سیاہ پرچم لگاتے ہیں' اپنے اس عمل سے گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم حسین سے وابستہ ہیں۔

کون حسین؟

وہی حسین جو راہِ عدالت میں شہید ہوئے۔ لہٰذا میں عدالتِ اسلامی سے وابستہ ہوں۔

میں حسین سے وابستہ ہوں۔

کون حسین؟

وہی حسین جن کے پاس جو کچھ تھا انہوں نے اسے راہِ خدا میں دے دیا۔ وہ حسین جس نے راہِ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا دیا' پس میں بھی راہِ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کا طرفدار ہوں۔

یہی شعار ہے۔ آپ جو اپنے بچے کا نام حسین رکھتے ہیں' اگر سوچیں' تو آپ اسی شعار کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے جو ہم سے کہا گیا ہے کہ اسے (واقعۂ کربلا کو) فراموش نہ ہونے دیں۔ ہر سال اس یاد کو زندہ کریں۔ جب آپ اس یاد کی تجدید کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو اسکے واقعات سناتے ہیں اور جب آپ اسکے واقعات دُہراتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ امام حسین نے کس طرح اسلامی عدل کے لئے قیام کیا تھا اور ظلم کے مقابل اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ ایسا معرکہ اور رزم آرائی دیکھتے ہیں جس کی نظیر ساری دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ خود اپنی جگہ تعظیمِ شعائر ہے۔

"ذٰلِکَ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ." (۱)

جو کوئی بھی شعائرِ الٰہی کو زندہ کرتا ہے اور اُن کی تعظیم کرتا ہے' یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ پاک' متقی اور پرہیز گار دل کا مالک ہے۔

جی ہاں! امام حسین ہر حقیقت پسند اور عدالت طلب مسلمان کے دل میں بستے ہیں۔

۱۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۲

"اِنَّ لِلْحُسَیْنِ مَحَبَّۃً مَکْنُوْنَۃً فِی قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ."
"یقیناً ہر مومن کے دل میں حسین کی محبت چھپی ہوتی ہے"۔

ایسا کیوں ہے؟

بالکل واضح ہے۔ کیونکہ ہر مومن کے دل میں اسلام کی محبت ہے۔ جب وہ حسین کو دیکھتا ہے کہ انہوں نے جان و مال' اولاد اور اپنی ہر چیز راہِ اسلام میں فدا کر دی' تو وہ انہیں اسلام سے جدا نہیں سمجھتا اور اسلام کو حسین سے جدا نہیں سمجھتا۔ وہ جس قدر اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ پاتا ہے اسی قدر حسین ابن علی سے وابستہ پاتا ہے۔ صرف ابا عبداللہ الحسین ہی نہیں' بلکہ وہ سب جو راہِ خدا میں اور ابا عبداللہ الحسین کی رکاب میں شہید ہوئے' سب ایسے ہی ہیں۔

آج نویں محرم ہے' لہٰذا میں کچھ ذکرِ مصیبت کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی توجہ قیامِ حسینی کے فلسفے کی طرف اور حسین ابن علی کی عزاداری کے مقصد کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔

یزیدی حکومت میں عیسائیت کا اثر و رسوخ

قیامِ حسینی کا فلسفہ یہی تھا کہ امام حسین علیہ السلام نے اسلام کو خطرے میں دیکھا' اور یہ بات سمجھ لی کہ اگر انہوں نے ایک جانبازانہ قیام نہ کیا' تو اسلام یکسر نابود ہو جائے گا۔ ملتِ اسلامیہ سوئی ہوئی ہے۔ حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو اسلام کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا' اسلام کا دشمن ہے۔ یہاں تک کہ اُسکے باپ میں جس قدر سیاست تھی (وہ اپنی سیاست کے لئے ضروری سمجھتا تھا کہ کچھ نہ کچھ اسلام کو بچائے رکھے) اس میں وہ بھی نہیں ہے۔ یزیدی حکومت میں عیسائیت نے بھی اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اسکے مشیر اور مشاور عیسائی افراد تھے' جن سے وہ ہدایات لیتا تھا۔ (امام حسین نے سمجھ لیا تھا کہ) اگر اسے بے نقاب نہ کیا گیا' تو اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

شام' جو اس زمانے میں دارالحکومت تھا' عیسائی دنیا کے دارالحکومت کا ہمسایہ تھا۔ یعنی یہی آج کا استنبول جو آج ایک اسلامی شہر ہے اور موجودہ ترکی جو ایک اسلامی ملک ہے۔ اس وقت

استنبول مشرقی روم کا مرکز اور عیسائیت کے بڑے مراکز میں سے تھا۔ بلکہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ معاویہ نے رفت و آمد کا دروازہ کھول دیا تھا۔ معاویہ کے زمانے ہی سے انہوں نے حکومت میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور امام حسین علیہ السلام کے قتل کا واقعہ آج کی اصطلاح میں ایک استعماری منصوبہ اور عیسائیوں کی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوا؟

ایک مقام جس کے بارے میں تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ وہاں عیسائیوں کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یزید کا ایک غلام تھا جس کا نام "سرجون" تھا۔ یہ غلام عیسائی تھا۔ یزید خود اپنا بہت سا وقت عیسائی گرجوں اور کلیساؤں میں بسر کرتا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت تک دنیائے اسلام میں شراب نوشی اور بدکاری جیسے بُرے کاموں نے رواج نہیں پایا تھا اور مسلمانوں میں یہ کھلم کھلا رائج نہ تھے۔ جو افراد ایسے کام کرنا چاہتے تھے وہ ان گرجوں اور کلیساؤں میں چلے جاتے تھے جہاں پر شراب بھی فراواں تھی اور بدکار عورتیں بھی۔ یزید نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ انہی گرجوں اور کلیساؤں میں بسر کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری نظر میں کئی داستانیں ہیں لیکن انہیں آپ کی خدمت میں عرض کرنے کا وقت نہیں۔

معاویہ کے دورِ اقتدار کے آخر میں عبیداللہ ابن زیاد دربارِ حکومت سے دھتکار دیا گیا تھا۔ اسکے اور یزید کے مابین ایک معمولی سی رنجش پیدا ہوگئی تھی اور ان دونوں کے مابین یہ رنجش عبیداللہ کے باپ کے زمانے سے تھی۔ لہٰذا یزید اسے کوئی بڑا منصب نہیں دیتا تھا۔ جب حسین ابن علی سے بیعت لینے کا معاملہ پیش آیا اور پھر شام خبر پہنچی کہ حسین ابن علی مکہ چلے گئے ہیں اور انہوں نے مکہ میں پناہ لے لی ہے۔ یعنی بیت اللہ الحرام کی اہمیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پھر اسکے بعد پتا چلا کہ امام حسین مکہ سے عراق کی طرف روانہ ہوگئے ہیں تو اس خبر سے مرکزِ خلافت وحشت زدہ ہوگیا کہ کہیں اہلِ عراق جو علی ابن ابی طالب کے حامی ہیں سنجیدگی کے ساتھ امام حسین کے گرد اکٹھے نہ ہو جائیں۔ یزید اس فکر میں پڑ گیا کہ اب اس معاملے کی روک تھام کیسے کی جائے؟ (اس موقع پر) یہی عیسائی غلام آیا اور کہنے لگا: اگر آج تیرا باپ معاویہ زندہ ہو جائے اور تو اس معاملے میں

اپنے باپ سے مشورہ کرے اور تیرا باپ تجھے حکم دے کہ فلاں کام کر' تو کیا تو وہ کام کرے گا؟ کہنے لگا: کروں گا۔ کیونکہ خود یزید معاویہ کی سیاست کا غیر معمولی معترف تھا۔ کہنے لگا: تو پھر اگر میں تیرے باپ معاویہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اور دستخط شدہ ایک حکم تجھے دکھاؤں' تو کیا تو قبول کرے گا؟ کہنے لگا: قبول کروں گا۔ وہ گیا اور خفیہ طور پر لکھی گئی معاویہ کی ایک تحریر لے آیا۔ اب یہ خدا جانتا ہے کہ وہ تحریر جعلی تھی یا اصلی۔ بہر حال یزید کو یقین آ گیا کہ یہ معاویہ ہی کا حکم ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر تم عراق میں پھنس جاؤ اور حسین ابن علی عراق کی طرف چلنے لگیں تو صرف ایک شخص اس صورتحال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے' اور وہ عبیداللہ ابن زیاد ہے (یعنی وہ کسی ظلم سے نہیں کترائے گا اور ضمیر کی کوئی آواز اسے نہ روک سکے گی اور وہ تیرے حکم پر آخری حد تک عمل کرے گا) یزید نے کہا: میں نے قبول کیا۔ بعد ازاں خود کہنے لگا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ خون کا ایک دریا جاری ہے اور میں اس دریا کو عبور کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر پاتا' عبیداللہ ابن زیاد آتا ہے اور وہ مجھے یہ دریا پار کرا دیتا ہے۔

عبیداللہ ابن زیاد کا کردار

اس واقعے کے بعد یزید نے فوراً ایک چھوٹی سی حکومت عبیداللہ کے سپرد کر دی۔ یہ دونوں ایک ہی قوم و قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ولد الزنا ہونے کے اعتبار سے عبیداللہ یزید کا چچازاد تھا۔ عبیداللہ کے باپ زیاد کو الحاق کے ذریعے معاویہ کا بھائی بنایا گیا تھا۔ یعنی سالہا سال اسے بغیر باپ کے (زیاد ابن ابیہ یعنی ایسا شخص جس کا کوئی باپ نہیں) کہا جاتا رہا۔ پھر دورِ جاہلیت میں شراب بیچنے والے ایک شخص نے گواہی دی کہ فلاں وقت زیاد کی ماں اور ابوسفیان نے باہم مباشرت کی تھی اور یہ زیاد ابوسفیان کا بیٹا ہے۔ معاویہ بھی سیاسی ضرورت کے پیش نظر اُسے اپنے نسب سے ملانا چاہتے تھے' لہذا انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا۔ یوں زیاد ''ابوسفیان کا بیٹا'' ہو گیا۔ اس دن سے وہ ان کے خاندان کا فرد بن گیا۔

یزید اگرچہ عبیداللہ سے نفرت کرتا تھا لیکن کیونکہ وہ اس کے خاندان کا فرد تھا اور بنی امیہ

اپنے خاندان کا بہت لحاظ کرتے تھے' اس لیے حکومتِ بصرہ کے مکمل اختیارات اسے سونپ دیئے۔ البتہ کوفہ جو مرکز تھا وہ کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ اس موقع پر یزید نے فوراً عبیداللہ کو خط لکھا اور کہا: کوفہ و عراقین کی حکومت بطورِ مطلق تمہارے حوالے کی جاتی ہے' وہاں چلے جاؤ' وہاں حسین ابن علی آرہے ہیں' اُنہیں وہاں سے دور رکھنے کے لیے تمہیں جو صورت بھی مناسب نظر آئے اسے اختیار کرو۔ بعدازاں وہ واقعہ ہوا جس کی تفصیل ایک حد تک آپ جانتے ہیں۔

انصاف کی بات ہے' عبیداللہ ابن زیادہ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو کم از کم ایک مقام پر ٹھہر جاتا۔ اس آدمی نے یہ کام انتہائی قساوت' بے رحمی اور بے مروتی کے ساتھ انجام دیا' اور یزید کی جڑیں بھی اسی کام کی وجہ سے اکھڑ گئیں اور اسی کی وجہ سے آلِ ابوسفیان کی بنیادیں ڈھے گئیں۔

یہاں تک کہ عمر ابن سعد بھی اپنے آپ کو قتلِ حسین کے جرم سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خدا کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور دنیا کو بھی۔ جس زمانے میں وہ کربلا میں تھا' اُس نے عبیداللہ کو پے در پے خط لکھے' بلکہ ایسے کام کیے کہ عبیداللہ' ابا عبداللہ الحسین کے قتل کا حکم دینے سے گریز کرے۔ گاہے وہ مصلحت آمیز اور سیاسی جھوٹ بھی لکھ دیتا تھا (مثلاً): میں نے حسین سے بات کی ہے' حسین بھی کوئی ایسے ناقابلِ لچک نہیں ہیں' اُن سے کسی نہ کسی صورت معاملہ کیا جاسکتا ہے اور صلح ہوسکتی ہے۔

عمر سعد چاہتا تھا کہ مسئلہ امن و امان سے حل ہو جائے۔ اس مقام پر موجود ایک راوی کہتا ہے کہ: یہ باتیں وہ اپنے پاس سے گھڑ لیتا تھا تا کہ اپنے آپ کو بچا سکے اور اس جرم میں اپنے ہاتھ نہ رنگے۔

جب اس کا آخری خط عبیداللہ کے پاس پہنچا' تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اسکے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اے امیر! غلطی کر رہے ہو' کہیں تم ابن سعد کے خط سے متاثر نہ ہو جانا' اگر آج حسین تمہارے چنگل سے بچ نکلے' تو کل کو وہ قوی اور طاقتور ہو جائیں گے اور تم کمزور۔ عبیداللہ نے جواب دیا: تو ٹھیک کہتا ہے۔ اس نے فوراً ایک تند و تیز خط ابن سعد کو لکھا کہ: ابن سعد! ہم نے تجھے ان فضولیات کے لیے نہیں بھیجا تھا' بلکہ حسین سے جنگ کرنے کے

لئے روانہ کیا تھا اور تو ہر روز ہمیں خط لکھ رہا ہے اور حسین کی خیر خواہی چاہتا ہے۔ فضولیات بند۔ جوں ہی میرا خط تیرے پاس پہنچے' تو فوراً حسین ابن علی سے جنگ کر' اگر تو تیار نہیں ہے' تو فوج کی کمان اس حامل نامہ (شمر ابن ذی الجوشن) کے سپرد کر دے۔ ہم نے اُسے بتا دیا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ عبیداللہ نے خفیہ طور پر ایک حکم شمر کے نام بھی صادر کر دیا کہ اگر ابن سعد نہ مانے تو فوج کی کمان تو سنبھال لے اور جونہی تو فوج کی کمان سنبھالے اور عمر سعد ایک عام آدمی بن جائے' تو فوراً اسے حاضر کر' اُسکی گردن اُڑا' اور اُس کا سر میرے پاس روانہ کر دے۔

اب یہ خط کس وقت پہنچا؟ آج کے دن کی طرح کے دن عصر کے وقت' نویں محرم کی عصر کے وقت' غروب کے نزدیک۔ اُس وقت جبکہ عام طور پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ میں مصروف افراد جنگ سے رک جاتے ہیں۔

اچانک انہوں نے دیکھا کہ تیز رفتار قاصد ''شمر ابن ذی الجوشن'' کوفہ سے آ پہنچا ہے۔ آتے ہی اُس نے عبیداللہ کا خط (عمر سعد کے) حوالے کیا۔ عمر سعد نے جوں ہی خط پڑھا' اُسکے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اُس نے اس جوان کے سراپے پر نگاہ ڈالی تو سمجھ گیا۔ کہنے لگا: یقیناً تو نے رکاوٹ پیدا کی ہے' قریب تھا کہ میں معاملے کو کسی جگہ پہنچا دیتا لیکن تو حائل ہو گیا۔ اُس نے کہا: بہر حال بتا اب تو کیا کرتا ہے؟ امیر کے حکم پر عمل کرتا ہے یا نہیں؟ بولا: ہاں' عمل کروں گا' تو بھی پیادوں کا کمانڈر بن جا۔ یہ وہ موقع تھا جب ابن سعد (۱) کے اندر بھی ابن زیاد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُس نے فوراً لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے' جیسے کہ وہ پہلے بھی دیتے آئے تھے: (نعوذ باللہ) حسین نے خروج کیا ہے' حسین اسلام سے خارج ہو گیا ہے' حسین اپنے نانا کے دین سے نکل گیا ہے' حسین نے امن وامان خراب کیا ہے۔ لہٰذا اس کا قتل جائز ہے اور

۱۔ ابن سعد اپنے زمانے کا ایک ممتاز آدمی تھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ ایک محدث تھا۔ وہ سعد بن وقاص کا بیٹا تھا جو ایک باحیثیت آدمی تھا۔ لوگ اُس کا احترام کرتے تھے۔ ابن زیاد نے بلاوجہ اُس کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسکی کثیف شخصیت سے فائدہ اٹھائے۔

حسین سے جنگ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے کافروں سے جنگ کرنے والا ہوتا ہے اور وہ اہل بہشت میں سے ہے۔ ایک مرتبہ اُکی آواز بلند ہوئی:

"یاخَیلَ اللّٰہِ ارْکَبِی وَبِالْجَنَّةِ اَبْشِرِی."

"اے لشکرِ خدا! سوار ہو جا میں تجھے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔

وہ تیار فوج ایک دم برق رفتاری سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوگئی اور انہوں نے محاصرے کا دائرہ مزید تنگ کر دیا۔ حضرت اباعبداللہ الحسین ان مختصر سے خیموں اور تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ ان تیس ہزار افراد کے محاصرے میں آ گئے۔

امام حسین علیہ السلام اس وقت ایک خیمے کے سامنے بیٹھے تھے۔ اپنا سر آپ نے اپنے زانو پر جھکایا ہوا تھا اور آپ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ آپ کی محترم بہن زینب سلام اللہ علیہا خیمے میں تھیں۔ اچانک انہوں نے شور سنا۔ بالکل ایسے جیسے دور سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ لشکر آ رہا تھا' سموں کی' گھوڑوں کے ہنہنانے کی اور اسلحے آپس میں ٹکرانے کی آواز تھی' اور مردوں کی آوازیں بھی تھیں۔ ان سب نے مل کر عجیب ہمہمہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ خیمے سے نکلیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ دور دُور تک' حدِ نظر تک لشکر ہی لشکر ہے' جو نزدیک آ رہا ہے اور حصار کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ نے آ کر حضرت اباعبداللہ الحسین کے شانے پر ہاتھ مارا: بھائی جان! آپ یہ شور و غل سن رہے ہیں؟ حضرت نے سر اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ اس شور و غل کی طرف توجہ کرتے' فرمانے لگے: میں ابھی اپنے نانا سے بات کر رہا تھا اور میں نے عالمِ خواب میں اپنے نانا کو دیکھا ہے۔ میرے نانا نے خواب میں مجھے نوید دی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے: میرے حسین! جدائی کا دور جلد ختم ہونے والا ہے اور تو عنقریب ہم سے آ ملے گا۔

اسکے بعد حسین ابن علی وہاں سے اٹھے۔ اپنے بھائی ابی الفضل العباس کو بیس افراد کے ایک گروہ کے ساتھ بلایا۔ فرمایا: فوراً اس لشکر کی طرف جائیں اور اس کے امیر سے بات کریں اور پوچھیں کہ کیا کوئی نئی خبر ہے؟ تمہارا کیا مقصد ہے؟ کیا ہم پر حملہ کرنا چاہتے ہو؟ اس وقت کیوں؟ سرِ شام کیوں؟

حضرت ابی الفضل بیس افراد کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ان میں حبیب ابن مظاہر اور زہیر ابن قین بھی شامل تھے۔ وہ جا کر لشکر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بلند آواز سے پکارے: اے لوگو! ہمیں تم سے کچھ بات کرنا ہے۔ وہ آگے بڑھے اور کہنے لگے: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: ہم حسین ابن علی کا ایک پیغام لائے ہیں۔ امام فرماتے ہیں کہ کیا اس وقت کوئی نئی خبر ہے؟ تمہارا مقصود کیا ہے؟ وہ کہنے لگے: ابھی ابھی ہمارے امیر کا پیغام پہنچا ہے کہ ہم تم پر حملہ کردیں۔ یا تو حسین سرِ تسلیم خم کردیں' اگر انہوں سرِ تسلیم خم کردیا تو اختیار ہمارے ہاتھ میں ہوگا' ہم انہیں اپنے امیر عبیداللہ ابن زیاد کے پاس لے جائیں گے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرنے پر تیار نہیں' تو پھر ہم اُن سے جنگ کریں گے' تاکہ انہیں قتل کردیں۔ فرمایا: کیا تم اتنا صبر کرو گے کہ میں تمہارا پیغام اپنے بھائی تک پہنچادوں؟ کہنے لگے: کوئی مضائقہ نہیں۔ زہیر ابن قین اور حبیب ابن مظاہر وہیں ٹھہر گئے۔ ان دو بزرگواروں نے تقریر شروع کی۔ کیا رزمیہ خطاب تھے اور کیا عمدہ نصیحتیں تھیں اور کیا کیا تنبیہات تھیں۔

اس عرصے میں حضرت ابی الفضل العباس حضرت ابا عبداللہ الحسین کی خدمت میں جا کر لوٹ آئے۔ واپس آکر انہوں نے امام کا پیغام پہنچاتے ہوئے فرمایا: بہت اچھا' جہاں تک سرِ تسلیم خم کرنے کی بات ہے' تو یہ تو ممکن نہیں' میں دشمن کے سامنے سر جھکادوں' ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا خون بہہ جائے۔ میں مردانہ وار جنگ کروں گا۔ البتہ تم ہماری طرف سے انہیں ایک پیغام دو' کہو: یہ جنگ کرنے کا وقت نہیں ہے' صبح تک صبر کرلو۔ کل صبح ایک دوسرے سے جنگ کریں گے' میں اس مختصر سی سپاہ کے ساتھ اور تم اپنی اس جمعیت کے ساتھ۔ پیغام کے ساتھ آپ نے ایک اور جملے کا اضافہ بھی کیا تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ فرزندِ علی کو کوئی وحشت یا خوف لاحق ہے اور وہ جنگ سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے بھائی سے کہا: برادرِ عزیز! خدا گواہ ہے کہ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میری آرزو ہے کہ آج اپنی زندگی کی آخری شب کی مناسبت سے اپنے اللہ سے مناجات کروں اور قرآن کی تلاوت کروں' میرا مقصد فقط یہ ہے' وگرنہ میرے لئے کوئی فرق نہیں کہ وہ اس وقت مجھ سے جنگ کریں یا کل صبح۔

جب یہ پیغام دشمن تک پہنچا' تو اُن میں سے بعض کہنے لگے ہمیں اِسے قبول کر لینا چاہیے اور بعض کہنے لگے نہیں قبول کرنا چاہیے۔ عمر سعد نے جب یہ دیکھا کہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اختلاف بھی شدید ہوتا جا رہا ہے اور ممکن ہے اس اختلاف کا نتیجہ حسین ابن علی کے حق میں نکلے۔ لہٰذا اس نے جلدی سے کہا: ہم کل جنگ کریں گے' آج رات نہیں۔

اگلے دن صبح ہوئی' تو حضرت ابا عبداللہ الحسین نے نماز پڑھ کر جلد ہی اپنا وہ چھوٹا سا لشکر یوں ترتیب دیا کہ گویا انہیں ایک سمندر کا سامنا نہیں۔ انہوں نے اپنے لشکر کا میمنہ' میسرہ اور قلب ترتیب دیا۔ اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ پرچمدار اور علمدار مقرر کیا۔ ان سب کو منظم و مرتب کیا۔ دشمن نے بھی اپنا کام مکمل کر لیا۔

عمر سعد کی کمینگی

عمر سعد نے پھر ایک کمینگی دکھائی (افسوس کہ جب انسان کسی دنیاوی منصب پر ریجھ جائے ابن زیاد کے اس وعدے نے اسے دیوانہ کر دیا تھا کہ میں "رے" کی حکومت اور گورنری تیرے حوالے کر دوں گا) اُس نے ایک ایسا کام کیا کہ جو مقرر کردہ افراد مسلسل رپورٹیں بھیج رہے تھے' وہ یہ رپورٹ بھیجیں کہ اے امیر! عمر سعد نہ فقط تمہارے حکم کی اطاعت کر رہا ہے' بلکہ بعض مزید اچھی خدمات اور نئے کام بھی انجام دے رہا ہے۔ اُسکی اچھی خدمات میں سے ایک یہ تھی کہ: جب آمنے سامنے ہوئے تو حضرت ابا عبداللہ نے (اپنے اصحاب سے) فرمایا کہ کیونکہ یہ لوگ مسلمان ہیں اور اسلامی جنگ کا ایک کلی قانون اور جنگ میں اسلامی اخلاق ہے جسے خاص طور پر حضرت علی ملحوظ رکھتے تھے' ہم جنگ کا آغاز نہیں کریں گے۔ انہوں نے سختی سے حکم دیا کہ ہم جنگ شروع نہیں کریں گے' اسی طرح جیسے حضرت علی کسی صورت جنگ کا آغاز نہیں کرتے تھے۔ جب دشمن جنگ شروع کرتا تھا تو پھر آپ دفاع کرتے تھے۔ لیکن عمر سعد آیا اور آگے آ کر کھڑا ہو گیا' اس نے ایک تیر کمان میں چڑھایا اور خود سب سے پہلا تیر امام حسین کے خیام کی سمت پھینکا۔ پھر اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہا: اے لوگو! امیر کے پاس گواہی دینا کہ پہلا تیر میں نے پھینکا تھا۔ جونہی یہ تیر چلا'

دشمن کے تیر اندازوں نے بارش کی طرح تیر برسانا شروع کر دیئے۔ حضرت ابا عبداللہ کے لشکر میں بھی چند ایک تیز انداز تھے' انہوں نے بھی اپنے تیر چلائے۔ حضرت ابا عبداللہ کے نصف اصحاب اسی تیر اندازی میں شہید ہو گئے۔ تاہم انہوں نے مردانہ وار دفاع کیا (کبھی کبھی انسان غالب تو آ جاتا ہے لیکن جوانمردی سے نہیں اور کبھی انسان قتل ہو جاتا ہے لیکن مردانگی کے ساتھ)

حسین ابن علی نے ایسا کام کیا کہ دشمن خوف زدہ ہو گیا۔ وہ ایک ایک کر کے میدان میں آئے۔ اس حربے سے دشمن شکست کھا گیا اور کہنے لگا کہ ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔

عابس میدان میں آئے۔ وہ ایک نہایت شجاع اور دلاور مرد تھے۔ اس مقام پر اُن کی روح اور بھی قوی ہو گئی تھی اور اُن کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ انسان کے اپنے ایمان کی خاطر جنگ لڑنے اور اپنے شکم کی خاطر جنگ کرنے کے درمیان بہت فرق ہے۔ وہ آئے اور میدان کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر پکارے: اَلَا رَجُل! کیا کوئی مرد ہے؟!

کسی ایک بھی فرد نے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی' حالانکہ یہ عربوں کی مروت اور مردانگی کے خلاف تھا' اُنہوں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا' تن بہ تن جنگ کرنے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے تیر اندازی' سنگ باری اور خشت باری شروع کر دی۔ یہ مردِ بزرگ واپس جا کر خیمے کے اندر چلا گیا۔ اچانک لشکر نے دیکھا کہ عابس نے تمام اسلحہ اتار دیا ہے' خود اور زرہ اتار دیئے ہیں' اپنی سپر اٹھائی ہوئی ہے اور اسی طرح خالی بدن میدان میں اُتر پڑے ہیں۔ کہنے لگے: اب مجھ سے لڑنے کے لئے آؤ' تم کس قدر ڈرپوک ہو! تمہارا خیال ہے کہ ہم قتل ہونے سے ڈرتے ہیں؟

وہ شہید ہو گئے لیکن کس مردانگی اور شجاعت کے ساتھ۔ دشمن اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے لیکن پتھروں اور اینٹوں سے کام لے رہے تھے۔ گالم گلوچ کر رہے تھے' نیزے پھینک رہے تھے اور تلواریں استعمال کر رہے تھے۔ جو ذریعہ بھی اُنہیں میسر تھا اس سے استفادہ کر رہے تھے۔

ہم نے عرض کیا کہ پہلا تیر عمر سعد نے پھینکا تھا۔ اس تیر سے جنگ کا آغاز ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ کس چیز پر ختم ہوئی؟ ایک تیر پر ہی جنگ کا خاتمہ ہوا۔ ایک تیر اندازی سے جنگ شروع ہوئی اور ایک تیر اندازی پر ہی ختم ہوئی۔

جانتے ہیں یہ کس وقت ہوا؟

یہ وہ وقت تھا جب حسین ابن علی کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔ تنہا حسین اور بس حسین۔ دشمن امام حسین کے سامنے سے یوں بھاگ رہے تھے جیسے شیر کے سامنے سے لومڑیاں۔

انہوں نے جنگ کو اس طرح ختم کیا: امام حسین تھک گئے تھے: فَوَقَفَ لِيَسْتَرِيحَ سَاعَةً. آپ وسطِ میدان میں گھڑی بھر کے لئے ستانے کو کھڑے ہوئے۔ اسی دوران ایک پتھر اباعبداللہ کی پیشانی پر آ کر لگتا ہے اور وہاں سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ لیکن جنگ ابھی جاری ہے۔ کیونکہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ ایک طرف امام حسین اور دوسری طرف فوج کا ایک سمندر۔ آخر کار ایک تیر نے اس جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ امام حسین نے اپنی پیشانی صاف کرنے کے لئے اپنا لباس اوپر کیا' اسی اثنا میں ایک زہر آلود تیر آیا اور اباعبداللہ کے سینے میں اتر گیا۔

"فَسَقَطَ الْحُسَيْنُ مِنْ فَرَسِهِ عَلَى الْأَرْضِ عَلٰى خَدِّهِ الْأَيْمَنِ......"

"حسین اپنے گھوڑے سے اپنے دائیں رخسار کے بل زمین پر آ رہے......"

ولاحول ولا قوة الا باللّٰه العليّ العظيم

وصلّى اللّٰه على محمد واله الطاهرين نسئلك اللهم وندعوک باسمک العظيم الاعظم الا عزّ الاجلّ الاکرم يا اللّٰه......

یااللہ ہم سب کا خاتمہ بخیر فرما۔

یااللہ حقائق اسلام ہم پر روشن فرما۔

یااللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے اسلامی شعائر کی حفاظت کر سکیں۔

یااللہ ہمیں اسلامی شعائر کے زیر سایہ کامیاب اور کامران فرما۔

یااللہ ہم تجھے محمد و آلِ محمد کے حق کا واسطہ دیتے ہیں' ان دنوں میں کہ جو ایامِ توسل ہیں ہمارے سب مرحومین کو غریق رحمت فرما۔

رحم اللّٰه من قرا الفاتحة مع الصلوات

شعائرِ اسلامی کا احترام☆

(۲)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"ذٰلِکَ وَ مَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ." (۱)

گزشتہ روز ہم نے جو گفتگو شروع کی وہ شعائرِ اسلامی کے بارے میں تھی۔ ان شعائر کی حفاظت' نگہبانی اور انہیں یاد رکھنے کے حوالے سے ہماری جو ذمے داری ہے' اس پر بات کرتے ہوئے کل ہم نے اختصار کے ساتھ شعار کے معنی بیان کیے۔ اس حوالے سے اشارتاً ہم آج بھی کچھ عرض کریں گے۔

ہر شعار ایک طرح کا اظہارِ وابستگی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں "شعائرِ اسلامی" تو اس سے مراد ایسی باتیں ہوتی ہیں جن سے اسلام کے ساتھ ہماری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ خصوصاً دین ِ اسلام میں بعض احکام ایسے ہیں جو اسی مقصد کے لئے وضع کیے گئے ہیں کہ ایک مسلمان یا

☆ یہ تقریر ۱۹۷۲ء میں مسجد الجواد تہران میں کی گئی۔

۱۔ اور جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا' یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگی۔ (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۲)

اسلامی معاشرہ ان کے ذریعے اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرے۔

کلی طور پر، حقیقی متن کے لحاظ سے اصول بنیادی اور شعائر مغز کے اوپر پوست اور کھال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی ہمارے پاس اسلام میں کچھ اصول ہیں (جن میں اعتقادی اصول، اجتماعی اصول اور عبادی اصول، سب شامل ہیں) یہ رکن اور اساس ہیں اور کچھ شعائر ہیں جو ان اصولوں سے وابستہ ہیں۔ مثلاً ہمارا ایک اصولِ اعتقاد توحید ہے اور ہمارے پاس کچھ شعائر ہیں جو اصولِ توحید سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم ان شعائر کے ذریعے اصولِ توحید سے اپنی وابستگی کا اثبات اور اظہار کرتے ہیں۔ گزشتہ روز ہم نے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے شعار کے بارے میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ ضروری ہے کہ ہم اپنے کام خصوصاً بڑے اور خاص طور پر اپنے دھوم دھام سے کئے جانے والے کام اللہ کے نام سے، صرف "بنامِ خدا" سے نہیں بلکہ "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" سے شروع کریں۔

اسی طرح ہمارے کچھ اور شعار بھی ہیں جو اصولِ نبوت سے ہماری وابستگی کا اظہار ہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں "صلوات" کی مثال دی تھی، نیز نام رکھنے کے بارے میں بات کی تھی کہ ضروری ہے کہ ہم انبیائے عظام اور خصوصاً اُن میں اشرف و افضل خاتم الانبیا سے اپنی وابستگی کے اظہار کے لئے اپنے بچوں کے نام، وہ بیٹا ہو یا بیٹی، ان مقدس ناموں میں سے منتخب کریں۔ اسی طرح امامت کے حوالے سے ہمارے کچھ اور شعار ہیں جن کے ذریعے ہم خاندانِ عصمت و طہارت اور اصولِ امامت سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سب کے لئے ہم نے مثالوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ اور مثالیں عرض کرتے ہیں۔

اصولِ معاد کے لئے ہمارے شعار

ہمارے اعتقادی اصولوں میں سے ایک اصول معاد ہے۔ ہم معاد کے مسئلے کو نظر انداز کر کے مسلمان نہیں ہو سکتے۔ معاد خود ایک حقیقت ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں موت کا مفہوم ایک مادّہ پرست انسان کی نظر میں موت کے مفہوم سے مختلف ہے۔ ایک مادّہ پرست اور مادّی انسان

کے نزدیک موت یعنی ختم ہو جانا' تمام ہو جانا' فنا ہونا' بکھر جانا اور معدوم ہو جانا ہے۔ لیکن ایک الٰہی انسان اور ایک مسلمان کی نظر میں موت ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا' ایک گھر سے دوسرے گھر میں داخل ہو جانا اور ایک زندگی سے دوسری زندگی میں منتقل ہو جانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم مسلمان ہوں لیکن موت کے بارے میں مادّی طرزِ فکر رکھتے ہوں' اور مادّہ پرستوں کی طرح سوچتے ہوں۔ اگر ہمیں اصولِ معاد کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک ہو' تو ہم اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا ہمارے یہاں بعض ایسے مسائل ہیں جو درحقیقت اصولِ معاد کے بارے میں ہمارے شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں ہماری گفتگو میں' ہمارے اعمال میں اور ہماری تحریروں میں نمایاں ہونا چاہئے۔ تاکہ ان سے ظاہر ہو کہ ہم قیامت پر ایمان رکھتے ہیں' روزِ جزا پر یقین رکھتے ہیں اور جاویدانگی اور ابدیت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم اور کوئی بھی انسان معدوم نہیں ہوگا بلکہ ہم معتقد ہیں کہ یہ سارا عالم اس زندگی سے ایک اور زندگی کی طرف چلا جائے گا اور سارا عالم ایک اور رُخ اختیار کرلے گا۔

"یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔"

"اس دن جب زمین دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب خدائے واحد و قہار کے سامنے پیش ہوں گے۔"

(سورۂ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۴۸)

مثلاً ہم اخبار میں ایک مجلسِ ترحیم کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے کہ اپنے اُس دوست کو تعزیت پیش کریں جس کا باپ' بھائی یا شریکِ حیات چل بسا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس مجلسِ ترحیم کے اپنے اعلان میں اس شعار کی حفاظت کریں کہ ہم قیامت کے معتقد ہیں۔ تعزیت کرتے ہوئے ہمیں اس امر کا اظہار کرنا چاہئے کہ ہم قیامت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان تعزیتی اشتہار میں یہ نہیں لکھتا کہ: ہم بھی اس غم میں آپ کے شریک ہیں۔

یعنی کیا؟

اس سے کیا مراد ہے؟

اوّل بات تو یہ ہے کہ اکثر یہ جھوٹ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں آیت اللہ آقائے حسین قمی مرحوم رضوان اللہ علیہ اپنے الفاظ کے بارے میں بہت محتاط رہا کرتے تھے۔ اُن کی خواہش ہوتی تھی کہ ان میں کوئی مبالغہ نہ ہو۔ وہ ایک شخص کو تعزیت کا ایک تار روانہ کرنا چاہتے تھے۔ جب اس تار کی عبارت بنا کر آپ کے دستخط کے لئے پیش کی گئی' تو لکھا تھا: ''باکمالِ تاسف'' (انتہائی افسوس کے ساتھ) مثلاً ''آنے والی مصیبت پر (آپ کو) تعزیت پیش کرتے ہیں۔'' انہوں نے کہا: نہیں' کیونکہ مجھے کمالِ تاسف (انتہائی افسوس) نہیں ہے۔ لہٰذا کمالِ تاسف کیوں لکھا ہے؟ یہ جھوٹ ہے۔ تکلفاً بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ جھوٹ ہے' انسان (ایسے اعلان کو) اسلامی رنگ کیوں نہ دے؟ مرنے والے کے لئے طلب مغفرت کیوں نہ کرے' کیوں اللہ کا نام نہ لے' کیوں نہ کہے کہ میں اللہ سے تمہارے لئے صبر اور اُسکے لئے مغفرت طلب کرتا ہوں؟ اگر ہم مسلمان ہیں' تو ہماری تعزیت کی شکل اور مجلسِ ترحیم کے اعلان کی شکل سے بھی اظہار ہونا چاہئے کہ ہم قیامت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعونَ یاھُوَ الْحَیُّ الْقَیومُ یاھُوَ الْحَیُّ الَّذی لایموتُ جیسے شعار استعمال کریں۔

ایک منٹ کی خاموشی

بہت عجیب ہے! ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور دین اسلام سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ہمارے ملک میں قومی اسمبلی اور سینٹ کی سطح کے اہم ترین ادارے مادہ پرستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کیسے؟

اُن کا کوئی ساتھی فوت ہوجاتا ہے' تو ایک آدمی آ کر اعلان کرتا ہے کہ: ہمارا فلاں عز

دوست چل بسا ہے۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہا۔ لہٰذا ہم ایک منٹ کی خاموشی کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر وہ ایک منٹ کے لئے "صمٌ بکمٌ" ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک منٹ کی خاموشی کا اعلان کرتے ہیں' اس سے کیا مراد ہے؟

اس خاموشی کا کیا اثر اور فائدہ ہے؟

وہ کہنا چاہتا ہے کہ میں قیامت' مغفرت' طلبِ مغفرت اور ایسی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ ایک منٹ کی خاموشی وہ افراد لے کر آئے ہیں جو اصلاً ایسی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ ایک اسلامی ملک میں جب ایک وفات پا جانے والے فرد کے لئے اظہارِ تعزیت کیا جائے' تو اسے ایک منٹ کی خاموشی کی صورت میں نہیں ہونا چاہئے۔ کہتا ہے:

یک دست بہ مصحفیم و یک دست بہ جام

"میرے ایک ہاتھ میں مصحف (قرآن) ہے اور دوسرے میں جام۔"

پتا ہی نہیں چلتا کہ ہم مسلمان ہیں یا غیر مسلم' اللہ پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ قیامت پر اعتقاد رکھتے ہیں یا اسکے منکر ہیں؟

ہماری کیفیت کا پتا ہی نہیں چلتا' فقط اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔

کیوں ایسا کرتے ہیں؟

کیونکہ یورپی دنیا میں وہ اپنے مرنے والوں کے لئے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

کیوں ڈرتے ہو؟ ہم مسلمان ہیں' کسی کی موت واقع ہو جائے تو مسلمان کے لئے طلبِ مغفرت کرنا چاہئے۔ قرآن کی کوئی چھوٹی سی سورت پڑھنی چاہئے' ایک حمد پڑھنی چاہئے' کوئی اور سورت پڑھنی چاہئے' یا چار مرتبہ قل ھواللہ پڑھنی چاہئے' یا گیارہ مرتبہ قل ھواللہ پڑھ لینی چاہئے' یا سات مرتبہ انا انزلنا پڑھنی چاہئے۔

جب ہمارے بچے سنیں گے کہ قومی اسمبلی اور سینٹ میں مرنے والے کے لئے ایک منٹ کی خاموشی کا اعلان ہوا ہے' تو وہ کیا سوچیں گے؟

معاد اصول ہے لیکن ان شعائر کی حفاظت ہونی چاہئے۔

احترامِ مسجد

رفتہ رفتہ ایصالِ ثواب کی مجالس کی شکل بھی بدلتی جا رہی ہے۔ ایک مرتبہ اسی مسجد کے بارے میں رفقا بات کر رہے تھے کہ اب یہاں ایسی مجالس کا انعقاد ہونا چاہئے یا نہیں؟ اسکی وجہ ایک ناپسندیدہ کیفیت ہے اور وہ یہ کہ مسجد کے منتظمین کے تمام تر اصرار اور زور دینے کے باوجود بعض خواتین اِن مجالس میں نامناسب حالت میں شرکت کرتی ہیں۔ احباب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجالسِ ترحیم مساجد سے یکسر ختم ہی کر دی جائیں۔ لیکن ایک خیال نے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ یہ کہ اگر ہم نے مساجد میں مجالسِ ترحیم کا انعقاد ختم کر دیا' تو پھر یہ انہیں کلبوں میں لے جائیں گے' جہاں نہ قرآن پڑھا جائے گا' نہ پارہ تقسیم کیا جائے گا اور نہ لوگوں سے وعظ و نصیحت کے دو بول کہنے اور دینی گفتگو کرنے کے لئے کوئی واعظ آ سکے گا۔ پھر ایک آدمی آئے گا اور اِدھر اُدھر کی چار باتیں کرنے کے بعد کہے گا کہ ایک منٹ کی خاموشی اور اس مردے کی روح کے لئے صلوات۔ اسی لئے ہم نے اپنے سینے پر پتھر رکھا اور کہا کہ فی الحال رہنے دیں' انشاءاللہ تدریجاً اس مشکل پر قابو پا لیا جائے گا۔

ہم یہ بات خاص طور پر عرض کرنا چاہتے ہیں:

حضرات! ہمارے شعائر میں سے ایک مساجد ہیں۔ مسجد کا احترام باقی رکھیں۔ اپنی خواتین' اپنے عزیزوں کی خواتین اور جس سے بھی آپ کا تعلق اور جان پہچان ہے' اُس سے کہیں اور اُسے سمجھائیں کہ کم از کم جب آپ مقدس مقامات پر (منعقد ہونے والے اجتماعات میں) شریک ہوتی ہیں' حرمِ امام رضا علیہ السلام میں جاتی ہیں' مسجد میں آتی ہیں' تو اسلامی شعار حجاب کو ملحوظ رکھیں۔ دوسرے جس جہنم کے درجے میں جانا چاہتی ہیں' جس حالت میں بھی جانا چاہتی ہیں جائیں لیکن آخر کار مسجد میں ایسے کیوں؟ اس عمل کے دو گناہ ہیں۔ ایک تو عورت غیر مردوں کے سامنے اپنے آپ کو بے پردہ کرتی ہے اور دوسرا اتنی بُری کیفیت کے ساتھ مسجد میں آ کر مسجد کا

احترام ضائع کرتی ہے۔ یہاں تک کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا گناہ اُس گناہ سے کم تر ہے۔ اس وقت اس بیچارے مرنے والے کا کیا حال ہوگا؟ مجلسِ ترحیم تو اس لئے برپا کرتے ہیں کہ مرنے والے کے لئے طلب مغفرت کریں۔ لیکن ایسی عورتیں اس مجلسِ ترحیم میں سو گناہوں کا باعث بنتی ہیں۔ آپ کو خدا کی قسم ہے۔ اگر آپ ایسی خواتین سے کوئی وابستگی اور واقفیت رکھتے ہیں' تو اُن سے کہیں کہ کم از کم اس ایک گھنٹے میں اپنی عزت اور مسجد کے احترام کا پاس کریں۔ میں فقط اس مسجد کی بات نہیں کر رہا' بہت سی دوسری مساجد کا بھی یہی حال ہے۔

شعارِ اذان

ہمارے دیگر شعائر میں سے ایک اور شعار جو اصولِ اسلامی سے تعلق رکھتا ہے' اذان ہے۔ اسلام میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اب ہمارا معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جو کوئی اپنی ذرہ برابر بھی حیثیت سمجھتا ہے' وہ کھڑا ہو کر اللہ اکبر' اللہ اکبر کہنا اپنے لئے کسرِ شان سمجھتا ہے۔ جبکہ یہ انتہائی باعث افتخار عمل ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنی خلافت کے زمانے میں' جبکہ وہ ظاہری اعتبار سے مملکت کے مردِ اوّل تھے (باطنی طور پر تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہمیشہ ہی پہلے نمبر کی شخصیت تھے) اُس وقت جبکہ معاشرتی عہدوں کے لحاظ سے بھی آپ مملکت کی اوّل درجے کی شخصیت تھے' مسجد کوفہ میں خود گلدستہ اذان پر جاتے اور بلند آواز سے پکارتے: اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ اُس آخری دن بھی جبکہ آپ مسجد میں آئے اور اس سے لحظہ بھر بعد آپ کے سر مبارک پر ضربت لگی' اس سے پہلے آپ اذان کہہ چکے تھے۔

اسلامی شعائر میں سے کوئی بھی شعار اذان جتنی شعاریت نہیں رکھتا۔ اسلام ایک بولنے والا اور ناطق دین ہے۔ جس طرح انسان اور دوسرے حیوانوں میں فرق کی وجہ نطق ہے اور انسان کو صامت حیوانات کے مقابلے میں حیوانِ ناطق کہتے ہیں' اسی طرح اسلام ایک دینِ ناطق ہے۔ اسکے تمام شعائر زبان دار ہیں' یہ انسان سے باتیں کرتے ہیں۔

اسلام کا کوئی تصویری شعار نہیں

اسلام کا کوئی تصویری شعار نہیں ہے۔ دو طرح کے شعائر اسلام میں نہیں پائے جاتے۔ ایک تصویری اور دوسرے عددی۔ بعض دوسری جگہوں پر تصویری شعائر مل جاتے ہیں۔ مثلاً صلیب جو عیسائیت کا شعار ہے۔ اسلام کا کوئی ایسا شعار نہیں جسے ہم صلیب کے مقابل رکھ سکیں۔ آج جو آپ دیکھتے ہیں کہ کسی حد تک ''ہلال'' (Crescent) کو (اسلامی) شعار سمجھا جاتا ہے اور اسے صلیب کے مقابل قرار دیتے ہیں۔ یہ حکومتِ عثمانیہ کا شعار تھا۔ کیونکہ قدیم زمانے میں یورپین کو جس پہلی عظیم ترین اور وسیع ترین اسلامی حکومت کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ عثمانی حکومت تھی اور ''ہلال'' عثمانی حکومت کا شعار تھا۔ لہٰذا یورپی دنیا میں ہمیشہ ہلال کو صلیب کے مقابل سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں صلیب اور ہلال کی جنگیں۔ کہاں صلیب نے ہلال کو مغلوب کرلیا اور کہاں ہلال نے صلیب کو مغلوب کردیا۔ لیکن اگر ہم ہلال کو ایک اسلامی شعار کی حیثیت دینا چاہیں تو اسلام میں ہمارے پاس ایسا کوئی شعار نہیں اور اسے اسلامی عنوان سے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

تصویری صورت میں اسلام کا کوئی شعار نہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس یا امیر المومنین علیہ السلام یا ائمۂ اطہار علیہم السلام کے نام پر اور اُن سے منسوب جو تصاویر بازار میں فروخت کی جاتی ہیں، اُن کی کوئی بنیاد نہیں۔ اسلام ابتدا ہی سے اس امر کی طرف رجحان نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس کا مخالف رہا ہے۔ اسلام کیونکہ توحید کے معاملے میں غیور ہے اور بہت زیادہ توحیدی غیرت رکھتا ہے، لہٰذا شروع ہی سے وہ مجسمہ سازی اور مجسمہ تراشی، خصوصاً اولیائے دین کے مجسمے بنانے کا سخت مخالف رہا ہے۔ اس زمانے میں بھی ایسے افراد تھے جو اگر قلم سے تصویر بنانا چاہتے تو بنا سکتے تھے، خصوصاً ائمہ کے دور میں جب اسلامی تمدن بہت وسعت اختیار کرچکا تھا، لیکن اسکے باوجود ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ خصوصاً اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ اطہار علیہم السلام میں سے کسی کی تصاویر ہوتیں، تو یقیناً ہم نے اس وقت انہیں حضرت عیسیٰ مسیح کی جگہ اپنا لیا ہوتا اور ان کی عبادت کررہے ہوتے۔

قطع نظر اسکے کہ یہ تصاویر بے بنیاد ہیں' خود ان شمائل کو رسول اللہ' حضرت امیر اور دیگر ائمہ مثلاً حضرت امام حسین کے نام پر قبول نہ کیجئے۔ (ان تصاویر میں ان ہستیوں کو) ترش رو دکھایا گیا ہے۔ عجیب قیافہ ہے' میں اسکے لئے کوئی بُرا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت علی کو ہمیشہ دو نوک والی تلوار' جیسے دو سروں والا زہریلا سانپ ہوتا ہے کے ساتھ ایک غصیلے قیافے کی صورت دکھایا جاتا ہے۔ کیا علی اس طرح کے تھے؟ علی کے دشمن کہتے تھے کہ خلافت کے لئے اُن کا نقص یہ ہے کہ وہ خندہ رو ہیں۔ امام فرماتے ہیں: عَجَباً لِابْنِ النَّابِغَةِ! يَزْعُمُ لِاَهْلِ الشَّامِ اَنَّ فِيَّ دُعَابَةً وَاَنِّي امْرُؤٌ تِلْعَابَةٌ. (۱) ابن نابغہ (عمرو عاص) پر تعجب ہے' وہ خلافت کے لئے مجھ میں یہ عیب نکالتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں ایک خوش مزاج شخص ہوں' مزاح کرتا ہوں اور خندہ رو ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بات اس سے پہلے حضرت عمر نے کہی تھی۔ ہاں' علی میں ہر مومن میں پائی جانے والی یہ خاصیت موجود تھی کہ:

"اَلْمُؤْمِنُ بُشْرُهُ فِي وَجْهِهِ وَحُزْنُهُ فِي قَلْبِه."

''مومن کی خوشی اسکے چہرے پر اور اُس کا غم اُسکے دل میں ہوتا ہے۔''

علی کا سوز' حزن اور خوف جو کچھ تھا' دل میں تھا۔ وہ ہمیشہ تیوریوں پر بل چڑھائے نہیں رہتے تھے۔ جب علی میدانِ جنگ میں جاتے تھے' تو اُن کی شمشیر اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی' لیکن کیا وہ جہاں بھی بیٹھے ہوتے تھے اُن کی دو نوک والی تلوار اُن کے زانو پر پڑی ہوتی تھی؟ بعض افراد نہایت غصیلے قیافے کے ساتھ ایک تصویر (جو پیشہ ور قاتلوں کا قیافہ ہوتا ہے' اور جس کے بارے میں ثابت ہو گیا ہے کہ اس میں دشمنوں کا ہاتھ ہے) امیر المومنین کی تصویر کے طور پر شائع کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں شیعیانِ امیر المومنین اسی کو اپنے گھروں میں لگا لیتے ہیں۔ ایک سال ان لوگوں نے زردشت کی تصویر بنا کر شائع کر دی اور حضرت امیر کی بھی۔ زردشت کے شمائل اور چہرے

ا۔ نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے یہ کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مسخرہ پن پایا جاتا ہے اور میں کھیل اور تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۲)

مہرے کی تو کچھ خبر بھی نہیں ہے کیونکہ اصلاً اسکی تاریخ تک معلوم نہیں۔ بعض افراد تو کہتے ہیں کہ زردشت رستم واسفندیار کی طرح ایک افسانوی کردار ہے اور ایسا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ جولوگ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی شخص گزرا ہے' انہوں نے بھی چھ سوسال سے لے کر چھ ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ بیان کی ہے۔ وہ کہاں پیدا ہوئے؟ ان سب امور کے بارے میں شک ہے۔ کئی ہزار سال پہلے گزرنے والے افراد کے چہرے مہرے کی کیا خبر ہے۔ ایک مجلّے نے ایک مقدس آدمی کی صورت میں زردشت کی تصویر شائع کی تھی' بہت نورانی چہرہ تھا' سر آسمان کی طرف کیے ہوئے' ایک نہایت محرابی داڑھی۔ جو کوئی بھی اس پر ایک نظر ڈالتا کہتا: کیا نورانی چہرہ ہے۔ انہوں نے امیرالمومنین کی ایک تصویر بھی شائع کی تھی۔ ایک خاص طرح کی داڑھی' جسم پر زرہ پہنی ہوئی' ایسا قیافہ جیسے دنیا بھر سے جھگڑا کیے بیٹھے ہوں۔ شیعیانِ علی بھی اُس تصویر کو اپنے گھروں میں لے گئے۔ اسلام میں ہمارے پاس شمائل تصویری نہیں ہیں۔ اسکی کیا ضرورت ہے؟ واللہ یہ نہ مستحب ہے اور نہ واجب' اگر شک ہے' تو وہ اسکے مباح ہونے میں ہے۔

لفظی شعائر

اسلام میں لفظی شعار ہیں۔ آپ اپنے گھروں میں ایسے کتبے لکھوایئے:

"اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ۔"

"لاالٰہ الاّاللّٰہ محمّدٌرسول اللّٰہ علیٌّ ولیُّ اللّٰہ۔"

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے کتبے اپنے گھروں میں لگائیں:

"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ۔"(۱)

ان عبارتوں کے انتہائی اعلیٰ طغرے بنوائیں اور اپنے گھروں میں نصب کریں۔ ہمارے پاس الحمدللہ ماشاءاللہ ایسے بہت سے شعار ہیں۔

۱۔ سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۳

ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام ناطق و گویا دین ہے۔ یہ انسان سے بات کرتا ہے۔ شمائل و تصویر کیا ہے؟

بعض افراد قرآنِ مجید سے ایسی عبارتیں منتخب کرتے ہیں جو آیات تو ہیں مگر شعار نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ہر قرآنی آیت مقدس ہے لیکن قرآن کی ہر آیت شعار تو نہیں ہے۔ فرض کیجئے کوئی اپنے گھر میں یہ آیت لکھ لے:

" اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ."(۱)

اسے جو کوئی دیکھے گا کہے گا کہ کیا یہ گھر فسق و فجور کا ٹھکانہ ہے؟

یا:

"اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ ....."(۲)

بعض گھروں میں ایک طرح کی بے مزہ اور بے ذائقہ چیز دکھائی دیتی ہے۔ (ایسی آیات آویزاں کر لیتے ہیں)

" وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ ."(۳)

یعنی ہم نے اسے اپنے آپ کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے یہاں آویزاں کیا ہے۔ یہ شعار نہیں ہے۔ شعارِ اسلامی سے مراد ایسی چیز ہے جس کے ذریعے آپ اسلام سے اپنی وابستگی کو ظاہر کریں اور جس سے اسلامی اصولوں میں سے کسی اصول کا اثبات ہوتا ہو۔

اسلام میں عددی شعار بھی نہیں

اسی طرح ہمارے یہاں عددی شعار بھی نہیں ہے۔ یعنی کوئی ایسا معین عدد ہو جس کے لئے

۱۔ زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ (سورہ نور ۲۴۔ آیت ۲)

۲۔ شراب، جوا، بت، پانسہ یہ سب شیطانی اعمال ہیں۔ (سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۹۰)

۳۔ اور یہ کفار قرآن کو سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ عنقریب اپنی نظروں سے آپ کے قدم اکھاڑ دیں گے۔ (سورہ قلم ۶۸۔ آیت ۵۱)

اسلامی حوالے سے ہم احترام کے قائل ہوں۔ مثلاً کلمہ مبارکہ "لا الہ الا اللہ" ایک حساب سے ۱۳۵ ہے۔ اگر لام کو مشدد شمار کریں تو پھر ۱۹۵ ہے۔ کیا ہمارے لئے ۱۳۵ یا ۱۹۵ ایک مقدس عدد ہے؟ نہیں۔ ۹۲ کا عدد اسمِ مبارک "محمد" کے مساوی ہے۔ کیا ۹۲ کا عدد ہمارے لئے ایک مقدس عدد ہے؟ اگر ہم ایک گروہ تشکیل دیں، تو کیا اس میں ۹۲ افراد ہونے چاہئیں، ۹۳ یا ۹۱ نہ ہوں؟ نہیں۔ ۱۱۰ کا عدد اسمِ مبارک "علی" کے مساوی ہے۔ کیا اسلام کی نظر میں اس عدد کا کوئی تقدس ہے؟ کیا ۱۱۰ کا عدد، ۱۱۱ اور ۱۰۹ سے کوئی امتیاز رکھتا ہے؟ نہیں۔

اسلام ایسے کھیلوں سے خوش نہیں ہوتا۔ ایسی چیزوں کے لئے آپ ایک ضعیف روایت بھی نہیں لا سکتے۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ میں یہ عمل صرف اس لئے انجام دیتا ہوں تاکہ اس ذریعے سے رسول اللہ، لا الہ الا اللہ اور امیر المومنین سے اپنی وابستگی کا اظہار کروں۔ ہم کہتے ہیں درست ہے، لیکن اسلام نے اور طریقوں کی نشاندہی کی ہے، جن کے ذریعے آپ اپنی وابستگی ظاہر کر سکتے ہیں۔ آپ خود اسلام کے انتخاب کردہ شعائر کو ایک طرف رکھ کر اپنے پاس سے شعائر کیوں بناتے ہیں؟ ابجد کا حساب دنیا کا کوئی حقیقی حساب اور رمز نہیں اور نہ یہ حقیقی قوانینِ عالم میں سے ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ان حسابات کا اثر قبول ہی نہیں کرنا چاہئے۔ کسی جگہ بھی نہیں، شعار کی حیثیت سے بھی نہیں۔

سوال: چہلم کے لئے مجلسِ ترحیم کا انعقاد کیسا ہے؟

چہلم کا معاملہ دوسرا ہے۔ مرحومین کے لئے جس وقت بھی طلبِ مغفرت کی جائے اچھی بات ہے، چاہے انتالیسواں ہو یا اکتالیسواں (اس سے فرق نہیں پڑتا) ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ خاص طور پر چہلم اسلام میں ہے، تو نہیں، ایسا نہیں ہے۔ چالیس سال بعد بھی اگر کوئی کسی مردے کے لئے صدقہ دے، طلبِ مغفرت کرے، قرآن پڑھے، جس وقت بھی ایسا کرے اچھا ہے۔

ہم نے اذان کے مسئلے پر بات کی اور وہاں سے ہم اس طرف آئے کہ عیسائیت کے برخلاف اسلام میں تصویری شعار نہیں ہے۔ یا آگ جلانے کی طرح کا کوئی شعار نہیں ہے۔ آگ

روشن کرنا آتش پرستوں کا شعار ہے۔ سال کے آخری بدھ کو آگ پر سے پھلانگنے سے اسلام کے نکتۂ نظر سے کفر کی بُو آتی ہے۔ ''تیری سرخی مجھ سے ہے اور میری زردی تجھ سے ہے'' (کہتے ہوئے آگ پر سے پھلانگنا) اسلام کی نظر میں شرک اور کفر ہے۔ یہ آتش پرستوں کا شعار ہے۔ اسلام تو ان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام اذان کا دین ہے' لا الہ الا اللہ کا دین ہے۔

سلام کا شعار

ہمارے شعائر میں سے ایک اور شعار جو خطرے کا شکار ہے' سلام ہے۔ اسلام نے افراد کے ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے موقع کے لئے ایک شعار وضع کیا ہے' جس کا تعلق اسلام سے ہے' یہ اسلام سے پہلے نہیں تھا' یہ اسلام کی اپنی ایجاد ہے۔ سلام یعنی السلام علیکم۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ سلام اہل جنت کا شعار ہے۔ کیونکہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ بہشت میں سلام علیکم ہے۔

دو مسلمان جب ایک دوسرے سے ملاقات کریں' تو انہیں کیا کرنا چاہئے؟

کیا اُن کی ملاقات دو حیوانوں کی طرح ہونی چاہئے؟

کیا ملنے کے آغاز پر کوئی عنوان' کوئی سرخی اور کوئی کام نہیں ہونا چاہئے؟

کیا ہم اپنی ٹوپی اتار لیا کریں؟

نہیں' ٹوپی اتارنا اسلام کا شعار نہیں ہے' ایران کا شعار بھی نہیں ہے۔

یا کیا پھر چینیوں کی طرح آپس میں اپنی ناک رگڑ لیا کریں؟

یہ بھی اسلام کا شعار نہیں۔ اسلام ناطق اور گویا دین ہے۔ یہ انسان سے بات کرتا ہے۔ جیسے کہ ہم نے بسم اللہ کے بارے میں عرض کیا ہے۔ آپ جائیں' پھریں۔ میں آپ کو مہلت دیتا ہوں' اگر آپ دیکھیں کہ آپس میں ملتے ہوئے لوگوں اور قوموں میں سلام اور السلام علیکم سے زیادہ معنی خیز' عالی تر اور ترقی یافتہ تر کوئی شعار موجود ہے' تو آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ پھر آپ سلام نہ کریں۔

اس سے بلند تر کیا ہو سکتا ہے؟ جب دو افراد آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے لئے سلامتی اور سلام کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہتا ہے: تم پر سلام ہو۔ تمہارے لئے

سلامتی کی آرزو کرتا ہوں۔ یہ ایک لحاظ سے صلح و آشتی کا اعلان ہے۔ اسلام صلح و آشتی اور خیر کا دین ہے۔ یہ اخوت و برادری کا دین ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ہم سلام کرتے ہیں۔ یعنی میں تیرا بھائی ہوں اور تو میرا بھائی ہے اور میں اپنے بھائی کے لئے آرزو کرتا ہوں (آرزو کہنا بھی غلط ہے' دعا کرتا ہوں' مسلمان کی آرزو دعا ہے) میں تیرے لئے سلامتی اور تندرستی کی آرزو اور دعا کرتا ہوں' روحانی سلامتی کی' معاشرتی سلامتی کی' جسمانی سلامتی کی اور ہر طرح کی سلامتی کی۔

ایک عجیب بات ہے۔ اسلام کا طریقہ ''سلام علیکم'' ہے۔ یعنی جمع کی صورت میں ہے چاہے ایک آدمی سے کہا جائے۔ اس میں ایک نکتہ ہے جس کا ذکر حدیث میں بھی آیا ہے اور تین مقامات کے لئے ہے کہ چاہے سامنے ایک آدمی ہو لیکن سنت ہے کہ ہم جمع کے صیغے میں کہیں۔ ایک مقام یہ ہے کہ اگر کسی کو چھینک آجائے تو کہیں ''یرحمکم اللہ'' (یرحمک اللہ نہیں) تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ دوسرا موقع' جب طلب عافیت کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی غسل خانے سے نکلتا ہے تو ہم کہتے ہیں ''عافاکم اللہ'' یہ نہیں کہتے کہ عافاک اللہ۔ حدیث میں ہے کہ ہم سلام میں بھی خاص طور پر کہتے ہیں ''سلام علیکم''۔ یعنی جب ہم کسی ایک آدمی سے بھی ملتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ میں صرف تمہاری ذات کے لئے سلامتی اور صلح و آشتی چاہتا ہوں' بلکہ ہم کہتے ہیں کہ میں تم سب برادران کے لئے سلامتی کی آرزو کرتا ہوں۔

ہم دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہم ایک چیز کو چھوڑنا چاہتے ہوں' تو پہلے غور کریں اور دیکھیں کہ اسکے بعد ہم جس چیز کا انتخاب کریں گے کیا وہ اس سے بہتر ہے؟ بعد میں ہم ایک بے معنی اور بے مفہوم چیز کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ آپس میں ملتے ہیں تو سرے سے سلام ہی نہیں کرتے' جیسے حیوانِ صامت ہوں۔ جب آپس میں ملتے ہیں تو گویا گونگے ہیں اور ان کی زبان نہیں ہے۔ کچھ ہیں جو کہتے ہیں: تعظیم عرض کرتا ہوں۔ کیا تعظیم عرض کرنے کی چیز ہے؟ نادانی کہاں تک پہنچتی ہے؟ یا کبھی ایک شخص صرف کہتا ہے: سلام (صرف) سلام تو سلام نہیں ہے۔ (کہنا چاہئے) سلام علیکم اس پر شرمانا بھی نہیں چاہئے۔ شجاعت اور وقار کے ساتھ کہنا چاہئے۔ بلند آواز سے کہنا چاہئے۔ سلام علیکم۔ اسلام میں بلند آواز سے سلام کرنا سنت ہے۔ کیونکہ رسولِ اکرم

نے فرمایا ہے کہ: میں نے معراج میں انتہائی بلند مقامات دیکھے۔ میں نے پوچھا یہ مقامات کن لوگوں کے لئے ہیں؟ کہنے لگے: اُن لوگوں کے لئے ہیں جو کھانا کھلاتے ہیں' دوسروں کو سیر کرتے ہیں اور جو بلند آواز سے سلام کرتے ہیں۔ اور جب دوسرے لوگ راتوں کو سوئے ہوئے ہوتے ہیں' تو یہ اٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔

یہ بھی جان لیں کہ سلام میں پہل کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب۔ بعض افراد جو احساسِ کمتری کا شکار ہیں' وہ ہر طریقے سے تکبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ہم جو ہیں وہ وہ نہیں ہیں' میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں' بڑی شخصیت ہے میری۔ احساسِ کمتری کے اظہار کی ایک علامت یہ ہے (خصوصاً اگر وہ ایک میز کے اُس طرف بیٹھے ہوں) کہ ایک آدمی دروازے سے داخل ہو' مسلمان ہونے کے ناطے سلام کرے' تو وہ سر اٹھاتا ہے اور سلام کا جواب نہیں دیتا۔ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ سلام کرنا اور سلام میں پہل کرنا سنت ہے۔ اگر سلام کے لئے دس نیکیاں ہوں' تو نوا سکے لئے ہیں جو سلام میں پہل کرتا ہے اور ایک اُسکے لئے ہے جو جواب دیتا ہے۔ اگر چہ وہ سنت بجالاتا ہے اور یہ واجب۔

آپ نے سیرتِ رسول کے بارے میں سنا ہوگا کہ تمام عمر کوئی شخص رسولِ اکرم پر سلام میں سبقت نہیں لے جاسکا۔ آپ اس بات کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جو کوئی بھی دکھائی دیتا' اس سے پہلے کہ وہ سلام کرے' رسول اللہؐ سے سلام کرتے تھے۔ یہ باتیں کہاں گئیں؟! بالکل بھلادی گئی ہیں۔

ایک اور موضوع بھی عرض کرتے ہیں۔ روزِ عاشور ہے' اس لئے حضرت ابا عبداللہ الحسین کے مصائب کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

ہجری تاریخ کا شعار

کبھی کبھی ہمارے بعض اخبارات کچھ باتیں چھیڑتے ہیں۔ ہمارے شعائر میں سے ایک جو اسلام کے سیاسی اصولوں میں سے ہے' یعنی اسلام کے خود مختاری چاہنے سے تعلق رکھتا ہے (وہ

ہے ہجری کیلنڈر کی ابتدا)

اسلامی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اسلام کبھی نہیں چاہتا کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلمان کا مرہونِ منت ہو یا اسلامی سوسائٹی کسی دوسری سوسائٹی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اس طرح کسی سوسائٹی کی مقلد بن جائے۔ اسلام اس مسئلے میں ایک حساسیت رکھتا ہے۔

ہمارے کیلنڈر کی ایک ابتدا ہے۔ ہر قوم کی تاریخ کی ایک ابتدا ہے۔ ہم مسلمانوں کی تاریخ کا مبدا ہجری ہے۔ یہ ہجرتِ پیغمبر اکرم سے شروع ہوتا ہے۔ استعمار نے ہم سے ہجری کیلنڈر چھیننے اور اسکی جگہ دوسرا کیلنڈر جو عیسوی ہے اسے نافذ کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس سے قطع نظر کہ عیسوی تاریخ کی ابتدا جعلی ہے اور مجہولات میں سے ہے' یہ جو کہتے ہیں کہ مثلاً اس وقت میلادِ مسیح کا ۱۹۷۲واں سال ہے' بنیادی طور پر یہ جھوٹ ہے۔ یہ اُن اکاذیب میں سے ہے جو بعد میں گھڑے گئے ہیں۔ محققین کا نظریہ ہے کہ عیسیٰ مسیح اس تاریخ سے دو تین سو سال قبل' یا دو تین سو سال بعد گزرے ہیں۔ یہ ایک جعلی بات ہے۔ البتہ اس وقت فرنگیوں نے اسے قبول کیا ہوا ہے۔ علاوہ ازایں یہ زیادہ سے زیادہ ایک نبی کی ولادت پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن ہجری تاریخ سو فیصد درست ہے۔ آپ ہزار سال قبل کی تاریخوں میں سے کسی ایسی تاریخ کا سراغ نہیں لا سکتے جو ہجری تاریخ جتنی درست ہو کہ جس کا دن تک بھی معلوم ہو۔

خلیفۂ دوّم کے زمانے میں مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی' تاکہ اپنے لئے ایک جداگانہ تاریخ کا تعین کریں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام کو تقلید پسند نہیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ ہمیں پیغمبر اکرم کی تاریخِ وفات سے اپنی تاریخ کا آغاز کرنا چاہیے۔ دوسروں نے اسکی اس رائے کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا: وفاتِ پیغمبر ایک غمناک اور رنج آور واقعہ ہے' ہماری تاریخ کی ابتدا ایک رنج آور واقعہ کیوں قرار پائے؟ بعض نے کہا ہم اپنی تاریخ کی ابتدا بعثت کو قرار دیتے ہیں۔ یہ تجویز بھی رد ہو گئی۔ اسکی وجہ کے متعلق کہا گیا کہ یہ بات درست ہے کہ بعثت ظہورِ اسلام ہے لیکن خود ہم سب اس وقت کافر تھے اور یہ خود ہمارے لئے کوئی خوش گوار یاد نہیں ہے۔ ولادت پیغمبر کی تاریخ کے بارے میں بات

ہوئی کہ وہ کیسی رہے گی؟ کہا گیا کہ: ولادت پیغمبر کے زمانے میں اسلام ہی نہیں تھا۔ ان میں ایک تجویز ایسی تھی جو قبول کر لی گئی اور وہ تجویز حضرت علی نے دی تھی۔ فرمایا: ہماری تاریخ کا نقطۂ آغاز ہجرت کو ہونا چاہئے۔ لگتا یہ تھا کہ ہجرت کوئی اہم معاملہ نہیں ہے۔ مکہ سے مدینہ آنے کا سفر کوئی اہم بات تو نہیں۔ لیکن کہا گیا کہ اہم ہے' کیونکہ ہجرت کی وجہ سے ہی ہم خودمختار ہوئے' جب تک ہم مکہ میں تھے کفار قریش کے زیر اثر تھے' تقیے میں اور چھپ کر زندگی گزار رہے تھے' ایک آزاد گروہ نہ تھے' ہماری اپنی کوئی حکومت نہ تھی' ہمیں آزادی میسر نہ تھی لیکن ہجرت کے موقع پر ہماری تاریخ کا ورق پلٹا' ہم مدینہ آئے' استقلال حاصل کیا' ہم نے ایک خودمختار حکومت تشکیل دی' ہمیں آزادی میسر آئی' ہم نے اعلانیہ عبادت شروع کی۔ لہٰذا ہجرت ہمارے استقلال کا آغاز ہے۔ اسی کو ہماری تاریخ کی ابتدا بننا چاہئے۔ جب ہم اپنی آزادانہ تاریخ انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو ہماری تاریخ کی ابتدا ہمارے استقلال کی ابتدا ہونی چاہئے۔

ہمیں اس تاریخ کی حفاظت کرنی چاہئے۔ گاہ بگاہ اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں کہ جمعے کی تعطیل مشکل کا باعث ہے' ساری دنیا کے لوگ اتوار کو تعطیل کرتے ہیں' ہمیں بھی اتوار کو چھٹی کرنا چاہئے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ ایک دن چھٹی ہو' تو وہ جمعے کا دن کیوں نہ ہو؟ ہم کیوں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں؟ اگر طے پائے کہ کسی اور دن چھٹی کریں' مثلاً اگر منگل کی چھٹی کریں' تو وہ بھی اتوار کی چھٹی سے بہتر ہے کیونکہ اتوار کی چھٹی کا مطلب تو تقلید کرنا ہے۔ کبھی لکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ کی ابتدا اچھی نہیں ہے' ہمیں بھی عیسوی کیلنڈر اختیار کر لینا چاہئے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کام بہت سے اسلامی ممالک میں ہو چکا ہے۔ استعمار کی یہ تاثیر اس وقت بھی عرب ممالک میں موجود ہے اور یہ ہم ایرانیوں کے افتخارات میں سے ہے کہ اس مسئلے میں الحمدللہ ہم نے سر نہیں جھکایا اور اسکے بعد بھی ہرگز ایسا نہیں کریں گے اور وہ یہ کہ ہماری تاریخ تاریخ ہجری ہے۔ ہم اپنا ہجری کیلنڈر ہرگز ترک نہیں کریں گے۔

یہ چند ایک شعائر ہیں' جن کے بارے میں ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انہیں زندہ رکھیں۔

ائمہؑ اطہار نے حسین ابن علی کی عزاداری کو ہمیشہ زندہ رکھنے پر اس قدر تاکید کیوں کی ہے اور اتنا زور کیوں دیا ہے؟ ہر سال محرم آتا تو خود ائمہؑ اطہار اظہارِ عزا کرتے تھے۔ اُن کی کیفیت بدل جاتی تھی' وہ اپنے شیعوں کو بھی حکم دیتے تھے کہ ہمیشہ اس عمل کو جاری رکھیں۔

ایسا کیوں تھا؟

یہ عزاداری شخصی نہیں ہے' یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ حسین ابن علی کے قیام کی یاد کو زندہ رکھنا ہے۔ حسین ابن علی کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تھا' عدلِ اسلامی کے لئے تھا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اپنے مقام پر ایک اسلامی اصول ہے۔ عدالت ایک اسلامی اصول ہے۔ امامت جو اصولِ اسلامی کی محافظ و نگہبان ہے' خود ایک جداگانہ اسلامی اصول ہے۔ عدالت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصولوں کا احیا ایک ایسے امام کے ہاتھوں ہوا جس کی اطاعت فرض کی گئی ہے۔ اگر ہم نے اس سلسلے اور اس تحریک کو ہمیشہ زندہ رکھا' تو گویا ہم نے امامت کے عظیم ترین شعار کی حفاظت کی ہے' ہم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عظیم ترین شعار کی حفاظت کی ہے' ہم نے عدل کی حمایت اور ظلم کے خلاف جنگ کے شعار کی حفاظت کی ہے۔ جب ہم میدانِ عاشورا اور روزِ عاشورا پر نگاہ ڈالتے ہیں' تو وہاں کیا دیکھتے ہیں؟ وہاں ہم اسلام اور اسلامی روحانیت کی تجلی دیکھتے ہیں۔

شبِ عاشور

حضرت ابا عبداللہ الحسین نے شبِ عاشورا اپنے اصحاب کے ساتھ بسر کی۔ صبح طلوع ہوئی تو آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ باجماعت نمازِ صبح ادا کی اور پھر مختصر سے خطاب اور چند جملے کہہ کر سلسلۂ کلام ختم کر دیا۔ فرمایا: اے میرے ساتھیو! آج تیار رہنا۔ تم سب کے لئے موت لکھی جا چکی ہے اور موت کی حقیقت ایک پل سے زیادہ نہیں' جسے تم عبور کر جاؤ گے۔

حسین ابن علی کے نزدیک مرنا ایک پل عبور کرنا اور ایک طرف سے دوسری طرف جانا ہے۔ فرمایا:

"وَماهِيَ اِلّا قَنطَرَةٌ تَعبُرُوها."

"موت تمہارے سامنے موجود ایک پل کے سوا کچھ نہیں اور اسے لازماً پار کیا جانا ہے۔"

پھر امام کے حکم سے اُس بظاہر چھوٹے سے اور بباطن عظیم گروہ نے اپنی صف ترتیب دی۔ امام کسی صورت اس بات پر تیار نہ تھے کہ اپنے آپ پر شکست خوردگی کی کیفیت طاری کرلیں کیونکہ اصل شکست روحانی اور معنوی شکست ہوتی ہے۔ روحانی اور معنوی لحاظ سے فریق مخالف نے شکست کھائی تھی۔ آپ نے اسی بہتّر رکنی چھوٹی سی جمعیت کے لیے بھی میمنہ' میسرہ اور قلب لشکر ترتیب دیئے اور علمدار مقرر کیا۔

عاشورا کے زیادہ تر واقعات بعد از ظہر رونما ہوئے۔ ظہر تک ابھی حضرت ابا عبداللہ کے بہت سے اصحاب بقیدِ حیات تھے۔ ابا عبداللہ نے اسلام کی اس سنت پر عمل کیا جسے آپ کے والد حضرت علی نے ہمیشہ زندہ رکھا' اور وہ یہ کہ آپ کسی صورت کاموں میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر جنگ میں' جنگ کی ابتدا کرنے کو آپ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ شبِ عاشور حضرت ابا عبداللہ کے حکم پر راتوں رات خیمے اکھاڑ کر اُن سب کو ایک دوسرے کے پہلو میں ہلالی شکل میں نصب کردیا گیا تھا۔ البتہ وہ بہت زیادہ ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اس طرح کہ ایک خیمے کی طناب دوسرے خیمے کے اندر گاڑی گئی تھی' تاکہ اگر کوئی پشت سے آئے تو آسانی سے خیموں سے نہ گزر سکے۔ اسی طرح حکم دیا کہ اسی رات کے دوران خیموں کے پیچھے ایک خندق کھود دی جائے۔ اس خندق کو گھاس پھوس سے بھر دیا گیا۔ کیونکہ وہاں درخت' سرکنڈے اور گھاس پھوس بہت تھی۔ علی الصبح شاید سورج کے نکلتے ہی حکم دیا کہ اسے آگ لگادی جائے تاکہ دشمن خیموں پر ان کے پیچھے سے حملہ نہ کریں۔

شمر ابن ذی الجوشن' ازلی و ابدی لعین نے' علی الصبح حملہ کردیا' تاکہ خیموں کے پیچھے سے آکر اصطلاحاً شب خون مارے۔ لیکن جب اُس نے آکر یہ کیفیت دیکھی اور سمجھ گیا کہ آگے نہیں جاسکتا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے ہتک آمیز' فحش اور جسارت آمیز کلام شروع کردیا۔

اصحاب میں سے کسی نے' ظاہراً مسلم بن عوسجہ یا حبیب ابن مظاہر نے عرض کیا: مولا! اجازت دیں' ایک تیر سے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: مولا! میں اسے جانتا ہوں' یہ کس قدر خبیث ہے' کتنا بدذات کافر ہے۔ فرمایا: میں جانتا ہوں' میں اس لئے منع نہیں کر رہا کہ یہ قتل کا مستحق نہیں ہے لیکن میں جنگ کی ابتدا نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ پہلا تیر میرے لشکر کی طرف سے پھینکا جائے۔

حضرت علی نے بھی صفین میں یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا' اور وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ جب تک دشمن کی طرف سے کوئی نہ آتا اور مبارزہ طلبی نہ کرتا' حضرت علی نہ خود جاتے تھے اور نہ کسی کو بھیجتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمیشہ تم اپنے آپ کو مدافع کی صورت میں رکھو جارح کی نہیں۔ حضرت ابا عبداللہ نے بھی جنگ کا آغاز نہ کیا۔ عاشور کے دن ظہر کے وقت تک ابا عبداللہ بار بار آتے اور لوگوں پر اتمامِ حجت کرتے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ مسئلے میں معمولی سا ابہام بھی باقی رہے۔ لہٰذا بہت سے افراد متنبہ ہو گئے' انہوں نے توبہ کی اور (امام کی طرف) آ گئے۔ جنابِ حر بھی انہی میں سے تھے۔

امام حسین کے خطبات

امام حسین علیہ السلام متعدد بار آئے اور آپ نے لوگوں سے گفتگو کی۔ آپ نے بہت طولانی اور انتہائی بلیغ خطبے ارشاد فرمائے۔ سب راویوں نے لکھا ہے کہ حسین آئے اور میدان کے وسط میں کھڑے ہو گئے۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا کی' انبیا و ملائکہ کی تعریف کی اور اپنی تقریر کے لئے ایک مقدمہ قائم کیا۔

عرب خود اہلِ فصاحت و بلاغت ہیں۔ یعنی کلام کو خوب سمجھتے ہیں۔ خود اُن کا کہنا ہے کہ آپ نے یوں کلام فرمایا کہ اس جیسا کلام اور اس سے بلیغ تر سخن اُس روز تک کسی نے نہ سنا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابا عبداللہ کو (آج کی اصطلاح میں) اپنے اعصاب پر کس قدر کنٹرول تھا' اور اپنی روح پر کس طرح مسلط تھے اور آپ کی سوچ کس قدر رزمیہ اور زوردار تھی۔

حضرت اباعبداللہ کے وجودِ مقدس میں ذرہ بھر بے اطمینانی نہ تھی۔ آپ نے اپنے انہی خطبات کے ذریعے طرح طرح سے اتمامِ حجت کردی۔ دشمن اکثر اس گفتگو کے درمیان رکاوٹ ڈال دیتے تھے۔ لیکن جیسے بھی ہوسکتا' آپ انہیں خاموش کر دیتے تھے۔ کبھی لشکر کو حکم ملتا تھا کہ شور مچاؤ تا کہ آپ کی آواز سنائی نہ دے۔ کبھی کسی اور صورت سے رکاوٹ پیدا کردیتے تھے۔ لیکن آپ کسی نہ کسی صورت اپنی بات کہہ دیتے تھے اور لوگ خاموشی پر مجبور ہو جاتے تھے' اور آپ کی بات سنتے تھے۔ آپ نے ہر طرح سے اتمامِ حجت کردی۔

آپ نے حکومت وخلافت کے لئے اپنی اہلیت اور ان لوگوں کی نااہلی کا مسئلہ اٹھایا جن کی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے۔ انہوں نے جو خطوط لکھے اور دعوت دی اُس کا مسئلہ بھی بیان کیا۔ آپ نے نام بنام ایک ایک کرکے ان افراد کو پکارا جنہوں نے خطوط لکھے تھے اور اب لشکرِ عمر سعد میں موجود تھے۔ کہا: کیا تم ہی لوگ نہیں تھے جنہوں نے یہ خطوط لکھے تھے؟ اِسکے بعد اتمام حجت کی تکمیل کی خاطر اور اس مقصد سے کہ کسی کے لئے ابہام باقی نہ رہے' آپ نے رسولِ اکرم کا قول (۱) فرمایا: اے لوگو! ان تمام مسائل کو ایک طرف رکھتے ہیں' مسئلہ' امامت اور خلافت سے قطع نظر کر لیتے ہیں (۲) فرمایا: ایک اور مسئلہ ہے' تم مجھے ایک عام آدمی سمجھ لو۔ قتل کرنے کے لئے بھی اسلام کے پاس کچھ قوانین ہیں' کہ ایک مسلمان کو کن شرائط کی بنیاد پر قتل کیا جاسکتا ہے۔

ایک مسلمان نے ناحق قتل کیا ہو تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے' اُس نے دین میں کوئی بدعت ایجاد کی ہو' دین کو الٹا پلٹا ہو' تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے' میں نے کیا کیا ہے؟ کیا میں نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے؟ کیا میں نے دین میں کوئی بدعت ایجاد کی ہے؟

ان لوگوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آخر (ان کے دل کی بات) باہر آگئی۔ ایک گروہ نے کہا: حسین! کیا تم جانتے ہو معاملہ کیا ہے؟ ہم صرف تمہارے باپ کے دشمن ہیں۔ بُغضاً مِنّ ـــــ (۳) اَبیکَ۔ فقط تمہارے باپ کی دشمنی میں۔

۱،۲۔ کیسٹ میں خرابی ہے۔
۳۔ غیر واضح کلمہ ہے۔

حسین کو اپنے والد ہر کسی سے بڑھ کر محبوب تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جب آپ نے اپنے والدِ گرامی کا نام سنا تو اونچی آواز سے رونے لگے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ روزِ عاشور حضرت اباعبداللہ کے شعائر میں سے ایک شعار اپنے والد پر افتخار کا اظہار تھا۔

أنـا ابـنُ علـيّ الطُّهر من آل هـاشم

كـفـانـي بهذا مـفـخـراً حين افـخـر

''میں پاک ومطہر علی کا بیٹا ہوں جو آلِ ہاشم میں سے ہیں۔ اور اگر میں افتخار کروں تو یہی افتخار میرے لئے کافی ہے۔''

یہ وہ وقت تھا جب آپ دوبارہ آئے۔ اس مرتبہ نسبتاً اونچائی کی وجہ سے اور آواز بہتر پہنچانے کی خاطر ایک اونٹ پر سوار ہوئے۔ آ کر کے اور انتہائی رزمیہ خطبہ ارشاد فرمایا:

''تَبّاً لَكُمْ اَيَّتُهَا الْجَمَاعَةُ وَتَرَحاً.''

اب کے وہ پہلے والی منطق نہ تھی۔

''اے جماعت! تمہارے سر پر خاک۔''

یہ بہت مفصل اور واقعاً ایک عجیب خطبہ ہے۔ (اس خطبے میں) لگتا ہے جیسے علی بول رہے ہیں۔ بالکل آتشیں احساسات ہیں اور ایک سو فیصدی انقلابی روح ہے جو خطاب کر رہی ہے۔ اسی خطاب میں ایک معروف جملہ ہے۔ آپ نے تیس ہزار کی اُس جمعیت کی طرف رخ کیا اور بلند آواز سے پکارے:

''أَيُّهَا النَّاسُ! اَلَا وَاِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدْ رَكَزَ بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ وَ الذِّلَّةِ وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ يَأْبَى اللّٰهُ ذٰلِكَ لَنَا وَرَسُولُهُ وَحُجُورٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ.''

''لوگو! جان لو (یعنی ساری دنیا کے لوگو! جان لو)! اس ذلیل ابن ذلیل (زنا زادے ولدِ زنا زادے عُبیداللہ ابن زیاد) نے مجھ سے کہا ہے: (اے حسین) دو کاموں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔ یا ذلت قبول کر لو یا پھر تلوار (کا سامنا

کرنے پر تیار ہو جاؤ) اس سے کہہ دو: هَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ (ہم ذلت قبول کریں؟! ہم کہاں اور ذلت کہاں؟!) يَأْبَى اللّٰهُ ذٰلِكَ لَنَا (ہم خدا پرست ہیں، ہم موحد ہیں، ہم کہہ چکے ہیں لا الہ الا اللہ۔ ہم یہ اصول ماننے والے ہیں کہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ منافقون ۶۳۔ آیت ۸) جس خدا کی ہم پرستش کرتے ہیں اسے قبول نہیں کہ ہم ذلت گوارہ کرلیں۔ اُس خدا کے رسول کو پسند نہیں کہ ہم ذلت قبول کرلیں۔"

پھر فرمایا: جس آغوش میں حسین پروان چڑھا ہے اور جس ماں کا حسین نے دودھ پیا ہے، کیا وہ اجازت دیتا ہے کہ حسین خود کو ذلت کے حوالے کردے؟ پس میں اپنے بابا علی کو کیا جواب دوں گا؟ میں اپنی ماں زہرا کو کیا جواب دوں گا؟ میری ماں زہرا مجھ سے کہیں گی: میری جان حسین! کیا تو نے میرا دودھ نہیں پیا تھا؟

یہ باتیں مذاق نہیں ہیں۔

جنگِ جمل میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کو پرچم دیا۔ امام حسین علیہ السلام جنگِ جمل میں موجود تھے۔ (خود حضرت علی نے محمد حنفیہ سے) کہا: بیٹے! حملہ کرو۔ انہیں آگے بڑھنا تھا اور مالک اشتر جیسے دوسرے افراد کو ان کے پیچھے جانا تھا۔ دشمن تیر اندازی کر رہا تھا۔ تیر بارش کی طرح برس رہے تھے۔ محمد رک گئے تا کہ تیروں کی بارش کچھ کم ہو تو آگے بڑھیں۔ یہ دیکھ کر حضرت علی غصے کے عالم میں آئے۔ اُن کی توقع کے انتہائی برخلاف ہوا تھا۔ آپ نے ایک زوردار مکا محمد بن حنفیہ کے سینے پر مارا اور فرمایا:

"اَخَذَتْكَ عِرْقُ اُمِّكَ."

"یہ تمہاری ماں کا اثر ہے۔"

تو علی کا بیٹا ہے۔ میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ آگے بڑھ اور تو کہہ رہا ہے کہ تیر آ رہا ہے؟ پرچم اُن سے لیا اور اکیلے حملہ آور ہوئے۔ ایسا حملہ کیا کہ آپ کا لشکر بہت پیچھے کہیں رہ گیا اور آپ مخالف لشکر میں غائب ہو گئے۔ مالک اشتر اور دوسرے دوڑے کہ مولا کہاں گئے؟ کہتے ہیں: جب

ہم لوگوں کو ہٹاتے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا علی کے گرد کوئی نہیں' سب بھاگ کھڑے ہوئے ہیں اور علی اپنے گھوڑے سے اتر کر اپنی خم شدہ تلوار کو سیدھا کر رہے ہیں اور وَلَہُ زَئِیرٌ کَزَئِیرِ الْاَسَدِ (شیر کی طرح غرا رہے ہیں) ہم نے سامنے جانے کی جرأت نہ کی۔

علی میدانِ جنگ میں غیظ و غضب کا مظہر تھے۔ لیکن صرف میدانِ جنگ میں۔ کیا اس صورت میں حسین محمد بن حنفیہ والا کام کرنا چاہتے تھے؟ اگرچہ محمد بن حنفیہ کا کام بھی عظیم ترین بہادروں کی شجاعت کے برابر تھا لیکن علی کو پسند نہ آیا۔

امام حسین علیہ السلام نے بھی یوم عاشور فرمایا: اگر میں سرِ تسلیم خم کر دوں' تو یہ بات میرے والد علی کو پسند نہیں آئے گی۔ ہم علی کے دامن میں پروان چڑھے ہیں' ہم علی کے بیٹے ہیں۔

تن بہ تن جنگ شروع ہوئی۔ حضرت وسطِ میدان میں آئے اور مبارز طلب کیا۔ عربوں کے قانون اور روایت کے مطابق یہ ذلت و بے عزتی کی بات تھی کہ کوئی مبارز طلب کرے اور مقابلے پر کوئی مبارز نہ آئے۔ وہ تیس ہزار افراد تھے اور یہ اکیلے۔ ان کے بڑے بڑے بہادر آئے اور جونہی کوئی آتا حسین اُسکے دو ٹکڑے کر دیتے۔ ایک کے بعد دوسرا آتا رہا۔ سب پر وحشت طاری ہوگئی۔ ایسے ہی مواقع پر ایسے لوگ دھوکا اور بزدلانہ عمل کا سہارا لیتے ہیں۔ عمر سعد نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ اگر تم اس طرح اس سے لڑنے جاتے رہے' تو وہ تم سب کو تلوار کی گھاٹ پر رکھ دے گا۔ وَاللّٰہِ لَنَفْسُ اَبِیهِ بَیْنَ جَبِینِهِ هٰذَا ابْنُ اَبِی طَالِبٍ هٰذَا ابْنُ قَتَّالِ الْعَرَبِ. یہ علی کا بیٹا ہے۔ یہ مشرک عرب کے قاتل کا بیٹا ہے۔ اسکے چہرے میں روحِ علی نمایاں ہے' کہاں جاتے ہو؟!

امام حسین کی شہادت

یہ وہ موقع تھا جب جنگ کی صورت تبدیل ہوگئی۔ وہ ایک شخص پر تیر اندازی کرتے رہے اور اُن کی طرف پتھر پھینکتے رہے۔ امام حملہ کرتے' تو سب بھاگ کھڑے ہوتے۔ یہاں تک کہ ایک صف بھی امام کے سامنے' ایک چھپن سالہ شخص کے سامنے نہیں ٹھہر پاتی تھی۔ لکھتے ہیں کہ جیسے بکری شیر کے آگے سے بھاگتی ہے' یہ لوگ اسی طرح سے بھاگتے تھے۔ لیکن آپ کچھ دور آگے

بڑھنے کے بعد اس نقطے پر واپس آ جاتے جسے آپ نے منتخب کر رکھا تھا' آپ وہاں جا کھڑے ہوتے۔ وہ مقام حرم کے خیموں کے نزدیک تھا کیونکہ آپ کا دل حرم کی طرف بھی متوجہ تھا کہ وہ مطمئن رہیں کہ ابھی حسین زندہ ہیں۔ آپ کی صدا بلند ہوتی:

"لاحولَ ولاقوۃَ اِلّا باللّٰہ العلیِّ العظیم."

یہ شعارِ توحید ہے (یعنی): خدایا! حسین کی قوتِ بازو بھی تجھ سے ہے' یہ نعمت تو نے حسین کو دی ہے۔ آپ یہ کہتے تاکہ زینب کے دل کو قرار رہے کہ ابھی اُن کا بھائی حسین زندہ ہے' تاکہ حسین کے بچے مطمئن رہیں کہ ابھی حسین زندہ ہے۔

یہی سلسلہ جاری تھا' حسین تھک کر کھڑے تھے کہ اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے ایک پتھر امام حسین علیہ السلام کی پیشانیٔ مبارک پر مارا۔ آپ کی پیشانی پھٹ گئی' خون جاری ہوگیا۔ آپ نے اپنا لباس اوپر کیا تاکہ سامنے سے اپنی آنکھوں کو اور پیشانی کو صاف کرلیں۔ اسی اثنا میں ایک تیر آیا' جو سینۂ مقدس میں یوں اترا کہ آپ گھوڑے سے زمین پر آرہے۔ یہ گھوڑا جو جنگ کے لئے ایک تربیت شدہ جانور تھا' اُس نے اس موقع پر یا بعد میں آپ کے سرِ مقدس جدا کیے جانے کے موقع پر اپنے ماتھے کو امام حسین کے خون سے رنگین کیا اور اپنے ٹھہرنے کی اصل جگہ پر لوٹ آیا۔

یہ جو کبھی کبھی آپ ایسی باتیں سنتے ہیں کہ حضرت اباعبداللہ کے بچے العطش العطش کی صدائیں بلند کر رہے تھے' ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ مجھے کسی ایک بھی مقتل میں یہ دکھائی نہیں دیا۔ ان کی عزت و حیثیت و شرف ایسی باتوں سے بالاتر ہے۔ علاوہ ازایں ایسی کوئی بھی بات کسی معتبر مقتل میں موجود نہیں۔ امام اُن سے فرما چکے تھے کہ تم اپنے خیموں سے باہر نہ آنا اور وہ ہرگز باہر نہیں آئے تھے' وہ خیموں کے اندر تھے۔

حضرت کئی مرتبہ اُن سے وداع کے لئے تشریف لائے۔ آپ کا دوبارہ وداع کے لئے آنا تو یقینی ہے۔ یہ جو تیسری مرتبہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی تو بچوں نے سمجھا کہ مولا پھر خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔ لیکن جب باہر آئے تو اپنے بابا کے گھوڑے کو اس حال میں دیکھا کہ اُس کا ماتھا

خون سے تر ہے اور زین ڈھلکی ہوئی ہے۔ اس موقع پر وہ اس گھوڑے کے اردگرد اکھٹے ہوئے اور مصیبت زدوں کی طرح انہوں نے نالہ وفریاد شروع کردی۔

حضرت ابا عبداللہ کی ایک بیٹی تھی' جو آپ کو بہت عزیز تھی' اور وہ بچی بھی اپنے بابا سے غیر معمولی پیار کرتی تھی۔ یہ ننھی بچی آئی تو اس نے اپنے آپ سے چند جملے کہے' گویا جیسے وہ گھوڑے سے باتیں کر رہی ہو۔ ایک بچی جو اپنے باپ سے بہت پیار کرتی ہے' اپنے آپ کو بھول جاتی ہے (وہ بچے اپنی پیاس یاد نہیں کر رہے تھے بلکہ امام حسین کی پیاس کو یاد کر رہے تھے) وہ گھوڑے سے کہتی ہے: یاجوادابی ھَلْ سُقِیَ اَبی اَمْ قُتِلَ اَبی عَطْشاناً (میں جانتی ہوں کہ میرے بابا تشنہ لب تھے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے میرے بابا کو تشنہ لب قتل کیا' یا انہیں سیراب کیا)

"وَاَسْرَعَ فَرَسُکَ شارِداً مُحَمْحِماً باکِیاً. فَلَمّارَأیْنَ النِّساءُ......"

امامِ زمانہ صلوات اللہ علیہ اسی منظر کی مرثیہ گوئی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اے جدِ بزرگوار! جس وقت آپ کا گھوڑا فریاد کرتا ہوا آیا' تو جونہی آپ کے گھر والوں نے آپ کے گھوڑے کو اس حال میں دیکھا' وہ قتل گاہ کی طرف چل پڑے۔"

"خَرَجْنَ خَواسِرَ مُسَلَّباتٍ حافیاتٍ باکیاتٍ."

وہ آئے تاکہ دیکھیں کہ مولا کس حال میں ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ جب وہ پہنچے تو انہوں نے مولا کو کس حال میں دیکھا؟

انہوں نے دیکھا کہ شمر ابا عبداللہ کے سینے پر سوار ہے۔

ولاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلیّ العظیم وصلّی اللّٰہ علی محمّد وآلہ الطاھرین. نسئلک اللّھم وندعوک باسمک العظیم الاعظم الاعزّ الاجلّ الاکرم یااللّٰہ......

خدایا! ہم سب کی عاقبت بخیر فرما۔

ہمیں دینِ مقدس اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔

ہمارے درمیان اسلامی شعائر کو زندہ رکھ۔

ہمیں اسلامی شعائر زندہ رکھنے کی لیاقت عطا فرما۔

یااللہ! مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں اپنے لطف و کرم سے اُن کی مشکلات کو دور فرما۔

ان کے دشمنوں کو ذلیل و ناکام اور نامراد فرما۔

خدایا! آج کے دن ہمارے تمام مرحومین کو اپنی رحمت میں غرق فرما۔

رحم اللہ من قرأ الفاتحۃ مع الصلوات

حقیقت کی جستجو☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"الحمد للّٰه ربّ العالمين بارى الخلائق اجمعين و الصلوة و السلام على عبداللّٰه ورسوله وحبيبه وصفيّه سيّدنا ونبيّنا ومولانا ابى القاسم محمد(صلى اللّٰه عليه و آله وسلم)و على اله الطيبين الطاهرين المعصومين."

اعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم

"وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا."(۱)

یہ گفتگو کا ایک ایسا موضوع ہے جو دینی بھی ہے اور فلسفی بھی اور یہ ایک ایسے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے جسے میں حقیقت کی جستجو کے زیر عنوان بیان کروں گا' اور یہ شک اور شک کرنے والے کے بارے میں ہے۔

☆ یہ تقریر ۱۹۶۹ء مطابق ۱۲ محرم ۱۳۸۹ھ حسینیہ ارشاد میں کی گئی۔

۱۔ اور یہ کہتے ہیں کہ پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔ (سورۂ طہٰ ۲۰۔ آیت ۱۱۴)

مقدمے کے طور پر عرض ہے کہ انسان میں قطعی اور یقینی طور پر ایک خاصیت پائی جاتی ہے' اس خاصیت کا نام جستجوئے حقیقت' حقیقت کی تلاش اور کھوج لگانے کی حس ہے۔

انسان کھوج کیوں لگاتا ہے؟

یہ انسان کے اندر ایک حس اور ایک محرک ہے کہ وہ جس کسی چیز کا سامنا کرتا ہے اور جو چیز بھی اُسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے' وہ اُسے سمجھنا چاہتا ہے۔ اسے کھوج لگانے اور جستجوئے حقیقت کی حس کہتے ہیں۔ کھوج لگانے اور حقیقت جاننے کی حس ہی ہے جس نے انسان کو فلسفوں' علوم اور ادیان کی طرف متوجہ کیا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں' بالخصوص علوم کو حاصل کرنے کے لئے انسان کی تگ ودو کی ایک وجہ ایک حد تک ضروریات زندگی کی تکمیل کرنا بھی ہے۔ کیونکہ علم انسان کے لئے اچھی زندگی گزارنے کی ایک کلید ہے۔ لیکن بلاشبہ اس پہلو کے ساتھ ساتھ یہ حس بھی انسان میں پائی جاتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ممکنہ حد تک ہر چیز میں گھس جائے اور حقیقت کو سمجھ جائے۔

انسان میں تو ایسی حس موجود ہے لیکن اس امر پر کوئی دلیل نہیں کہ حیوانات بھی ایسی حس رکھتے ہیں کہ وہ کسی چیز کو سمجھنے اور اُسکی حقیقت تک پہنچنے کے لئے اُسے جاننے کی خواہش کریں۔

شک

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کے لئے شک کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کے سامنے کچھ مجہولات آتے ہیں جنہیں وہ حل نہیں کر پاتا اور سمجھ نہیں پاتا کہ وہ اس طرح سے ہیں یا اُس طرح سے' وہ (ان کے سلسلے میں) شک وشبہ اور ابہام سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنے سامنے ایک سوالیہ نشان دکھائی دیتا ہے۔ اِسے شک کہتے ہیں۔

شک اچھی چیز ہے یا بُری چیز؟

فلسفے' سائنس اور سب سے بڑھ کر دین میں' کیا شک کو اچھی چیز سمجھا جاتا ہے یا بُری چیز قرار دیا جاتا ہے؟

یقیناً جو چیز ابتدائی طور پر ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین میں شک بری چیز ہے' شک خبث طینت اور سیاہ دلی کی علامت ہے۔

کیا یہ بات درست ہے کہ دین میں اور جو چیزیں دین سے تعلق رکھتی ہیں ان میں شک کرنا بری چیز ہے؟

ہاں' یہ بات درست ہے' شک بری چیز ہے' مقصد و منزل یقین ہے۔ سائنس اور فلسفے میں بھی اور دین میں بھی مقصد یہ ہے کہ انسان صاحب یقین ہو۔ ایمان اُس وقت ایمان بنتا ہے جب اُسکے ساتھ یقین بھی ہو۔ جبکہ شک تزلزل اور عدم اطمینان ہے۔

زندگی میں بھی (۱) انسان کے لئے شک بری چیز ہے۔ آپ نے اپنے لئے کسی خاص پیشے کا انتخاب کیا ہے۔ آپ نے کسی خاص شعبے کو اختیار کیا ہے۔ کیا یہ بہتر ہے کہ آپ اپنے اس کام' پیشے اور شعبے کے بارے میں متزلزل ہوں اور اس شک میں پڑے ہوں کہ کیا میرے لئے اس شعبے کو اختیار کیے رکھنا اچھا ہے یا اسے چھوڑ دینا بہتر ہے؟ یا پھر یہ مناسب ہے کہ آپ کو اپنے کام پر ایمان اور اعتقاد ہو اور نتیجے کے طور پر آپ پُر جوش اور شوق و نشاط کے حامل ہوں؟ مسلّمہ طور پر انسان کا اپنے کام پر ایمان ہونا اچھی بات ہے۔

دین میں بھی ضروری ہے کہ انسان ایمان رکھتا ہو۔ مقصد ایمان رکھنا ہے۔ آپ کو قرآن میں کہیں دکھائی نہ دے گا کہ وہ لوگوں کو شک کی دعوت دے رہا ہو۔ یہ بات واضح ہے کہ شک کی دعوت ایک غلط کام ہے۔ ہر جگہ ایمان کی دعوت ہے' لہٰذا شک بری چیز ہے۔

مقدس شک

لیکن ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ ایک لحاظ سے اور ایک مقام پر شک اچھی چیز ہے' حتیٰ بعض شکوک (تمام شکوک نہیں) مقدس ہیں اور ہم انہیں مقدس شک کا نام دیتے ہیں۔ پہلے پہل اپنی

۱۔ اس مقام پر کیسٹ میں خرابی ہے۔

پیدائش کے وقت انسان یقین اور ایمان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ شروع شروع میں بالغ ہوتا ہے تو یقین کے ساتھ بالغ نہیں ہوتا۔ یقین ایک ایسی چیز ہے جسے انسان میں پیدا ہونا چاہئے۔ انسان کو خدا پر ایمان ہونا چاہئے۔ کیا یہ ایمان ابتدا ہی سے انسان میں پایا جاتا ہے اور بالفعل موجود ہوتا ہے؟

انسان کو معاد پر ایمان ہونا چاہئے۔ اسے رسول اور اولیائے دین پر ایمان ہونا چاہئے۔ یہ ایمان کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ ایمان انسان میں پیدا ہونا چاہئے۔ جب تک انسان میں شک پیدا نہ ہوائے یقین کی طرف دھکا نہیں لگتا۔ انسان کے لئے شک اچھی چیز ہے لیکن یہ کوئی اچھا مقصد اور اچھی منزل نہیں۔ شک کوئی اچھا مقام نہیں۔ ہاں یقین ایک اچھا مقام ہے۔ انسان میں شک کا پیدا ہونا' اسکے ایمان و یقین تک پہنچنے کے لئے ایک اچھی گزرگاہ اور ایک اچھا دالان ہے۔ جب تک انسان اس دالان اور گزرگاہ کو عبور نہ کرے' اُس وقت تک اس نہایت عالی اور شیریں منزل تک نہیں پہنچ سکتا جس کا نام یقین ہے۔ قرآن نے بھی اشارتاً شک کی دعوت دی ہے۔ کہاں؟ اس سلسلے میں پہلے ایک مختصر سا مقدمہ عرض کرتے ہیں:

طبیعی طور پر انسان تقلید اور دوسروں کی پیروی پر مجبور ہے۔ واضح ہے کہ بچہ کیونکہ والدین کے دامن میں پروان چڑھتا ہے' ان والدین کے کچھ افکار و عقائد ہوتے ہیں' چاہے یہ مذہبی افکار ہوں یا غیر مذہبی۔ والدین کے وہی افکار و عقائد طبیعی اور تقلیدی طور پر بچے کی روح میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر بچہ جب تک شعور اور تمیز کی عمر کو نہیں پہنچتا والدین کے تمام عقائد کو جوں کا توں یقین کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔

ایک چھوٹی بچی کی ماں اگر باپردہ عورت ہے اور اپنے آپ کو نامحرموں سے چھپا کر رکھتی ہے' تو اس بچی کے اندر بھی یہ فکر اور عقیدہ پیدا ہو جائے گا کہ ایک عورت کو لازماً ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اسکے برعکس اگر کوئی بچی کسی ایسی ماں کے دامن میں پروان چڑھے جس میں ایسی کوئی بات نہ ہو اور اس میں بالکل عفت کی کوئی علامت ہی نہ ہو۔ وہ بچی اپنی ماں کو دیکھتی ہو کہ وہ ہر کسی کے ساتھ میل جول' آنا جانا رکھتی ہے' بعض لوگوں کی اصطلاح میں "آزاد" ہے' ناچتی گاتی ہے' تو اس بچی کو بھی

چیزیں اچھی لگنے لگتی ہیں۔

مذہبی اعتقادات ہوں یا قومی' کوئی بھی نظریہ دیکھ لیں بچہ اپنے بچپن کے دور میں اپنے والدین کے عقائد کو پوری طرح قبول کرتا ہے۔

لیکن کیا اسی طرح رہنا چاہیے؟

نہیں' والدین کے نظریات درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان اہلِ تحقیق ہونا چاہتا ہے' تو اُس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اُس نے والدین سے جو کچھ تقلیداً حاصل کیا ہے اُس میں شک کرے۔

تقلید کے خلاف قرآن کی جنگ

جن کتابوں نے تقلید کے خلاف زبردست جنگ کی ہے' اُن میں سے ایک قرآن ہے۔ شاید دنیا کی کوئی اور ایسی کتاب نہ لائی جاسکے جس نے اس موضوع پر اس قدر تاکید کی ہو اور اتنا اصرار کیا ہو۔ جس دور تک قرآن سامنے نہیں آیا تھا' یہ اُس وقت تک کی بات ہے۔ البتہ بعدازاں کتابوں نے اسکی پیروی کی ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ ایک مرتبہ میں نے قرآن کی آیات کا جائزہ لیا تو دیکھا (بلا استثنا) ہر پیغمبر نے اسلاف' گزشتگان اور ماحول کی اندھی تقلید پر تنقید کی ہے۔ (قرآن) لوگوں کی زبان میں کہتا ہے:

"اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ......"

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔" (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۳)

ایک اور آیت میں ہے:

"اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ......"

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر ہدایت پانے والے ہیں۔" (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۲)

(قرآن مجید) کہتا ہے اُنہوں نے انبیا کے جواب میں کہا: ہم نے اپنے گزشتگان اور اسلاف کو ایک طریقے پر پایا اور ہم اپنے اجداد کے اسی طریقے پر گامزن ہیں۔

یا انہوں نے کہا کہ وہی راستہ درست ہے جس پر ہمارے آباواجداد چلتے رہے ہیں۔

قرآنِ کریم ایک مقام پر فرماتا ہے:

''اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ......''

''کیا یہ ایسا ہی کریں گے' چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔'' (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۷۰)

ممکن ہے ان کے آبا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں' تو کیا یہ پھر بھی اپنے آبا کی پیروی کریں گے؟

قرآن جب اپنی گردن سے تقلید کا طوق اتار پھینکنے کی دعوت دیتا ہے' تو وہ شک کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی جو کچھ تم نے اپنے والدین' اسلاف اور ماحول سے حاصل کیا ہے اُس میں شک کرو۔ البتہ قرآن جو کہتا ہے کہ شک کرو' تو اسکی مراد یہ نہیں ہے کہ شک اچھی چیز ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ شک کرو تاکہ تحقیق کرسکو۔ جب تک انسان اپنے ماحول کے رسم و رواج اور آباواجداد کے تقلیدی امور میں شک نہیں کرے گا کسی صورت تحقیق کی طرف نہیں آئے گا۔

لہٰذا یہ جو ہم نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے بھی شک کی دعوت دی ہے' تو وہ اس طرح کی دعوت ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے اُن سے جو کچھ حاصل کیا ہے' اُسکی صحت و درستگی کے بارے میں شک کرو' تاکہ تمہارے لئے تحقیق کی راہ کھل سکے۔ ہم اس شک کو ''مقدس شک'' کا نام دیتے ہیں' یعنی وہ شک جو تحقیق کے لئے ہے اور تحقیق کا مقدمہ ہے۔

غزالی کا قول

ہمارے اپنے غزالی نے' جو نو سو سال پہلے گزرے ہیں' ایک جملہ کہا ہے۔ اپنی ایک کتاب میں انہوں نے چند باتیں کہنے کے بعد کہا ہے کہ ہماری گفتگو کا اتنا فائدہ ہی کافی ہے کہ تو نے جو کچھ موروثی طور پر حاصل کیا ہے اُسکے بارے میں تجھے شک میں ڈال دے۔ کیونکہ اس شک کے بعد

ہی تو خود بخود تحقیق کی جانب چل پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک میں تجھے شک میں نہیں ڈالوں گا تو تحقیق کی جانب نہیں چلے گا' تجھے شک میں ڈالتا ہوں تا کہ تو تحقیق کی طرف چل پڑے۔

یہی غزالی صرف دنیائے اسلام ہی کے نہیں' بلکہ پوری دنیا کے عجیب افراد میں سے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی کی سرگزشت بھی عجیب ہے۔ ان میں انتہا درجے کی ذہانت تھی۔ وہ نظامیہ نیشاپور میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں وہ علمی مراتب میں بہت اونچے چلے گئے۔ بعد ازاں وہ نظامیہ بغداد میں آ گئے۔ اتفاقاً بغداد کی جامعہ نظامیہ کے سربراہ دنیا سے چل بسے تھے۔ وہ لوگ کسی ایسے فرد کی تلاش میں تھے جو بغداد کی جامعہ نظامیہ کا سربراہ بن سکے۔ اس زمانے میں جو شخص جامعہ کا سربراہ ہوتا تھا وہی اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہوتا تھا۔ غزالی بغداد میں آئے' تو اُن کے علمی مقام کا آوازہ یوں مجالس ومحافل میں گونجا کہ کہا جانے لگا کہ بلاشبہ یہی وہ یگانہ شخصیت ہے جسے ہمیں اس نظامیہ کا سربراہ بنانا چاہیے۔ وہ سلجوقیوں کے دور میں' خاص طور پر ملک شاہ کے زمانے میں اپنے زمانے کے اعلم علما کے طور پر پہچانے گئے۔ کبھی کبھی وہ سلجوقی بادشاہ اور بغداد کے خلیفہ کے مابین رابطے کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ یعنی بسا اوقات وہ اُن کے درمیان پیدا ہو جانے والے اختلافات کو حل کیا کرتے تھے۔ انہیں اس قدر زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یوں انہیں اپنے زمانے میں بلند ترین سماجی وروحانی مقام حاصل تھا۔

وہ شخص جس نے یہ علمی مراحل طے کیے' اس نے اپنی سرگزشت ''المنقذ من الضلال'' (یعنی گمراہی سے نجات دینے والا) نامی کتاب میں لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ میں اپنے آپ میں غوطہ زن ہوا' تا کہ دیکھوں کہ وہ معلومات جو میں نے حاصل کی ہیں کیا انہوں نے مجھے واقعاً یقین تک پہنچا دیا ہے یا یہ کچھ اس استاد سے اور کچھ اُس استاد سے حاصل کیا ہوا تقلیدی مسائل کا ایک سلسلہ ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ کیونکہ استاد نے کہا ہے کہ درست ہے لہٰذا میں نے بھی کہہ دیا کہ درست ہے اور کیونکہ اُن کے بھی استاد نے اسے درست کہا لہٰذا انہوں نے بھی کہہ دیا کہ درست ہے۔ کیا میں خود اور میرا شعور انہیں کافی سمجھتا ہے' یا نہیں؟ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ نہیں' کافی نہیں ہے۔ تدریجاً یہ احساس مجھ میں قوی ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ اُس نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ میں درس

دے رہا ہوتا' نماز میں ہوتا' گھر میں ہوتا' کوچے اور سڑک پر ہوتا' جہاں بھی ہوتا اپنے اندر ایک خلش محسوس کرتا۔ اپنی روح میں ایک سوزش محسوس کرتا' جو مجھے چین نہ لینے دیتی۔ رفتہ رفتہ اس کیفیت نے میرے جسم پر بھی اثر ڈالا' میرا کھانا پینا چھوٹ گیا' میں لاغر' ضعیف اور نحیف ہو گیا۔

ایک طرف میں دیکھتا تھا کہ اگر آزادانہ طور پر حقیقت کی طرف جاؤں' تو اس عہدے و مقام کا کیا بنے گا؟ جامعہ کی سربراہی کے اس عظیم منصب کا کیا ہوگا؟ دوسری طرف میں دیکھتا تھا کہ اس مقام و منصب اور قیادت اور اس مصروفیت کے ساتھ بات نہیں بنتی۔ مسلسل سوچا کرتا کہ اپنے زمانے کے اس بلند ترین سماجی و روحانی مقام کو کس طرح سے چھوڑوں۔

اس طرح میں دو متضاد قوتوں کے درمیان پھنس گیا۔ انہوں نے میرے اندر آگ بھڑکا دی تھی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور میں دنیاوی مقامات کو چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔

تاہم غزالی نے دیکھا کہ اگر انہوں نے اعلان کیا کہ میں (اس مقام کو) چھوڑ رہا ہوں' تو لوگ انہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیں گے۔ بادشاہ بھی انہیں نہیں چھوڑے گا اور کہے گا کہ: لازماً آپ اس عہدے پر باقی رہیں۔

انہیں ایک تدبیر سوجھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں مکہ جانا چاہتا ہوں' وہ بغداد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ افراد ان کے ہمراہ ہو لئے۔ چلتے رہے' چلتے رہے۔ جونہی کچھ دور ہوئے اچانک قافلے سے چھپ کر غائب ہو گئے اور جنوب مغرب کے بجائے وہ مغرب کی طرف لوٹ گئے۔ شام اور بیت المقدس چلے گئے۔ لباس بھی تبدیل کر لیا۔ درویشی لباس پہن لیا۔ اس لباس میں کوئی انہیں نہیں پہچانتا اور انہوں نے خود بھی کسی سے اپنا تعارف نہیں کروایا۔ اچانک غزالی دنیا سے گم ہو گئے۔ دسیوں خیالات پیدا ہوئے۔ کیا وہ قافلے سے بچھڑ گئے؟ کیا کسی درندے نے انہیں چیر پھاڑ دیا؟ کیا کسی کنویں میں گر گئے؟ کیا کسی گوشے میں اُن کے دل نے کام کرنا بند کر دیا اور وہ مر گئے اور کسی کو اُن کی لاش نہ ملی؟ اتنی بڑی شخصیت اور ایسی عظمت کے ہوتے ہوئے غزالی گم ہو گئے۔

وہ مسلسل دس برس تک بیت المقدس میں مختلف طریقوں سے تحقیق و جستجو میں مشغول رہے یہاں تک کہ اُن کے اپنے خیال کے مطابق انہیں حقیقت معلوم ہو گئی۔ وہ واقعاً تبدیل ہو گئے

تھے۔ انہوں نے اپنی بنیادی کتابیں اسی زمانے میں لکھیں۔ وہ خود اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں کہ بیت المقدس میں' میں اپنا نام سنتا تھا لیکن اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ دیکھتا تھا کہ طلاب آپس میں مباحثہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں: قال الغزالی.... اس مسئلے میں غزالی کا نظریہ یہ ہے' میں بھی سنتا تھا لیکن اُن سے یہ نہیں کہتا تھا کہ جس غزالی کا قول تم بیان کر رہے ہو اب وہ غزالی نہیں رہا۔ آج کا غزالی اس روز کے غزالی سے مختلف ہے۔

غرض یہ کہ غزالی ایک مقام پر کہتے ہیں کہ میری گفتگو کا اتنا فائدہ ہی کافی ہے کہ تمہیں تمہارے موروثی عقائد کے بارے میں شک میں ڈال دوں' تاکہ بعدازاں تم حقیقت کی جستجو کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اگر تم نے ایسا کیا تو تم حقائق کو پالو گے۔

اللہ کا وعدہ

اس مقام پر ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان واقعاً حقیقت کا متلاشی ہو' اور اس میں عناد نہ رکھتا ہو' تو کیا اِسکے سامنے راستہ واضح ہو جاتا ہے؟ جی ہاں' قرآن نے اللہ کے وعدے کے طور پر جن امور کا ذکر کیا ہے' اُن میں سے ایک یہی ہے:

"وَالَّذِیْنَ جٰهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ."(۱)

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش اور مجاہدہ کرتے ہیں' ہم اُنہیں گمراہ نہیں رہنے دیتے' اُن کے سامنے حقیقت کا ایک دروازہ کھول دیتے ہیں' اُن کے قلب اور روح کی ہدایت و راہنمائی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں کیا کیا واقعات ہیں' کیا کیا باتیں ہیں اور کیا مطالب ہیں اور جن افراد نے حقیقت کی جستجو کی ہے وہ کن مقامات تک پہنچے ہیں اور اُن کے سامنے غیب سے کیا کیا دروازے کھلے ہیں' ہم اس سلسلے میں زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ فقط ایک معروف داستان نقل کرتے ہیں۔

۱۔ اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہے' ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ حسن عمل والوں کے ساتھ ہے۔" (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۹)

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ صبح کے بعد اصحاب صُفہ کے پاس گئے۔(۱)
لکھتے ہیں کہ جُھٹ پٹے کا وقت تھا۔ یعنی نہ زیادہ روشنی تھی اور نہ زیادہ اندھیرا۔ آپ کی نگاہ ایک جوان پر پڑی۔ آپ کو اس جوان کی حالت غیر معمولی دکھائی دی۔ آپ نے دیکھا: یَخْفِقُ وَ یَهْوِی یعنی ہماری اصطلاح میں دائیں بائیں جھوم رہا ہے ڈگمگا اور لڑکھڑا رہا ہے۔ رسول اکرم سمجھ گئے کہ یہ آدمی کسی اور ہی عالم میں ہے۔ فرمایا:

"کَیْفَ اَصْبَحْتَ؟"

"تم نے کیسے صبح کی؟" (تمہارا کیا حال ہے؟)

عرض کیا:

"اَصْبَحْتُ موقِنا."

"(اے اللہ کے رسول) میں نے اس حالت میں صبح کی کہ میں اہل یقین ہوں۔"
(یعنی) میری آنکھوں کے سامنے سے پردے پوری طرح ہٹا دیے گئے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا دعویٰ تھا۔

رسول اکرم نے فرمایا:

"ماعَلامَةُ یَقینِکَ؟"

"تمہارے یقین کی علامت کیا ہے؟"

کہنے لگا: یا رسول اللہ:

"اِنَّ یَقینی اَسْهَرَ لَیْلی وَ اَظْمَاَ هَواجِری."

اسکی علامت یہ ہے کہ اس نے میری رات کی نیند اڑا دی ہے اور دن کو مجھے تشنہ رکھتا ہے۔
یعنی دن کو میں روزہ رکھتا ہوں اور رات بھر بیدار اور عبادت اور راز و نیاز میں مشغول رہتا ہوں۔

۱۔ اصحاب صُفہ نادار اور مفلس مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جو مسجد نبوی کے ایک چبوترے پر رہتا تھا اور آنحضرت اُن کی احوال پرسی کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے دلیر اور آزاد مردوں میں سے تھے۔

فرمایا: مزید کوئی علامت بتاؤ۔

عرض کیا: یارسول اللہ! اس وقت جبکہ میں آپ کی خدمت میں ہوں ایسے ہے کہ دوسرے عالم میں ہوں اہلِ بہشت کو بہشت میں اور اہلِ دوزخ کو دوزخ میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر اس وقت میں عرض کرنا چاہوں کہ آپ کے انہی اصحاب میں سے کون کون اہلِ بہشت ہے اور کون کون اہلِ دوزخ ہے تو بتا سکتا ہوں۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں اس راز کو آشکار کر دوں؟

فرمایا: نہیں خاموش رہو۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسکے ساتھ اپنی گفتگو ختم کر دی اور فرمایا: چپ رہو اور اس سلسلے میں مزید بات نہ کرو۔

"وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ."

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا ایک شک ایسا بھی ہے جو مقدس ہے۔ کون سا شک مقدس ہے؟ یہ وہ شک ہے جو تقلید کی زنجیروں کو توڑ دینے والا ہو لیکن شرط یہ ہے کہ وہ انسان کو تحقیق اور کشف حقیقت کی طرف دھکا دے اور اُس کی روح میں ایک درد کی کیفیت پیدا کرے۔

درد کا فلسفہ

کیا کبھی آپ نے درد کے فلسفے کے بارے میں سوچا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ درد بُری چیز ہے۔ درد بھی شک کی طرح ہے۔

درد اچھا ہے یا بُرا؟

ممکن ہے کسی کا خیال ہو کہ درد بُری چیز ہے۔

(ہم کہتے ہیں کہ) نہیں درد بُرا ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ اچھا بھی ہے۔ اگر درد نہ ہو تو انسان کو بیماری اور ضرورت کا پتا کیسے چلے گا؟

اگر انسان کے دل میں درد نہ ہو تو وہ کیسے سمجھے گا کہ اسے زخمِ معدہ ہے یا زخمِ اثنی عشر اور وہ کس طرح سے دوا یا آپریشن کے لئے اقدام کرے گا۔ اگر انسان کے سر میں درد نہ ہو تو وہ علاج

کے لئے کیسے جائے گا؟

خود بھوک بھی ایک درد ہے' انسان بے آرام ہو جاتا ہے' لیکن یہ ضروری ہے۔ اگر انسان کو یہ درد محسوس نہ ہو' تو وہ کھانے کی طرف نہیں جائے گا۔ اگر انسان پیاس محسوس نہ کرے' تو وہ پانی کی طرف نہیں جائے گا۔

درد جہاں انسان کو بے چین کر دیتا ہے' وہیں طبیعت کی کسی ضرورت کا اعلان بھی ہے۔ آپ کے بدن کی طبیعی کیفیت فریاد کر رہی ہوتی ہے۔ اگر وہ آپ کو کسی بات سے آگاہ کرنا چاہے تو اسکی کوئی زبان تو ہے نہیں کہ وہ ہوا میں لہر پیدا کر دے "مجھے کھانے کی ضرورت ہے"۔ (اس موقع پر وہ) بھوک کے نام سے ایک درد آپ پر مسلط کر دیتی ہے۔ جب وہ چاہتی ہے کہ آپ سے کہے کہ مجھے پانی کی ضرورت ہے' تو پیاس نام کا ایک درد مسلط کر دیتی ہے۔ جب کہنا چاہتی ہے کہ تمہارے بدن کے فلاں حصے میں کوئی فرسودگی یا خرابی پیدا ہوگئی ہے اور ایک عضو میں کوئی گڑبڑ ہے' تو طبیعت درد کی صورت میں تمہیں بتا دیتی ہے۔ لہٰذا اس مریض کے حال پر افسوس کرنا چاہیے جس کے مرض کا درد محسوس نہ ہو۔ ایسے مریض کو کچھ پتا نہیں چلتا اور وہ کچھ نہیں جانتا ہوتا۔ اسے اس وقت پتا چلتا ہے جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ درد بُرا ہے کیونکہ انسان کو تکلیف دیتا ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اسے درد نہ ہو۔ تاہم درد اچھا ہے اس لحاظ سے کہ انسانی طبیعت کی ضرورت کا اعلان کرتا ہے۔

مقدس شک یا روحانی درد

مقدس شک ایک روحانی درد کی حیثیت رکھتا ہے۔ درد ہونا پسندیدہ بات ہے۔ (اس طرح) انسانی روح کہتی ہے کہ مجھے غذا کی ضرورت ہے' مجھے علم کی ضرورت ہے۔ میں کوئی حیوان' نبات یا پتھر نہیں ہوں' میں انسان ہوں' اللہ نے مجھے ایک روح دی ہے' ان آسمانوں سے زیادہ عظیم' مجھے اس عالم سے باہر نکلنا چاہیے' مجھے سمجھنا چاہیے کہ میں کہاں سے آیا ہوں' کہاں موجود ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ مولانا روم کیا خوب کہتے ہیں:

حسرت و زاری کہ در بیماری است
وقت بیماری نشانِ زاری است

بیماری میں درد کا ہونا احتیاج کی نشانی ہے۔

ہر کہ او بیدار تر پر درد تر
ہر کہ او ہشیار تر رخ زرد تر

کہتے ہیں: جو بھی زیادہ بیدار ہے' زیادہ جاگتا ہے' اُس کا درد زیادہ ہے۔ دنیا میں بے درد افراد (دراصل) سوئے ہوئے ہیں' اُن میں احساس نہیں ہے۔

پس بدان این اصل را ای اصل جو
ہر کہ را درد است او بردہ است بو

لہٰذا حقیقت کے متلاشی انسان اس اصول کو جان لے کہ جسے بھی درد ہو گا اُسی کو علم ہو گا۔

ہم اجتماعی مسائل کے حوالے سے ایک مثال عرض کرتے ہیں: بہت سے افراد ایسے ہیں جنہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یعنی اُن کے معاشرے میں جو کچھ گزر جائے۔ یہاں تک کہ انسان انسان کو کھا جائے اُنہیں کوئی فکر نہیں۔ اُن کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ خود آرام سے ہیں' اُنہیں کھانا' رہائش اور انفرادی آرام و آسائش مہیا ہے' اسکے بعد معاشرے پر جو کچھ بھی گزرنے چاہے اُن کی دیوار کے اُس طرف کوئی فقیر و مسکین گھرانہ ہو جو نانِ شبینہ کا محتاج ہو' اُنہیں یکسر کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اُن کے معاشرے میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہو یا نہ ہو' وہ ایسے مسائل کے بارے میں سوچتے تک نہیں۔

معروف مثال ہے' کہتے ہیں مشروطہ (۱) کی ابتدا میں لوگوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ آئین پسندوں کا تھا اور دوسرا آمریت پسندوں کا۔ (اُس زمانے میں) ایک آدمی سے پوچھا گیا' تم آئین پسند ہو یا آمریت پسند؟ اُس نے جواب دیا: میں عیال دار ہوں۔

۱۔ ایران میں آئینی حکومت کے قیام کی تحریک کو مشروطہ کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ زندگی میں صرف عیال دار ہوتے ہیں۔ کوئی اور مسئلہ انہیں درپیش ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک سید جمال الدین اسد آبادی (۱) ہیں' وہ ایران میں ہوتے ہیں اور کوئی شخص ہندوستان میں درد میں مبتلا' تو وہ یہاں پر درد محسوس کرتے ہیں' وہ سارے عالمِ اسلام کا درد محسوس کرتے ہیں کہ وہ استعمار کی زنجیر میں کیوں جکڑا ہوا ہے۔

واضح ہے کہ درد انسان کو تکلیف دیتا ہے' بے آرام کر دیتا ہے۔ کیا یہ صاحب درد بہتر ہے یا وہ بے درد؟ ایسا ایک درد اس ہزار سالہ بے دردی سے بہتر ہے جس کا نام لوگ راحت و آرام رکھ دیتے ہیں۔

حضرت علی کا کلام

حضرت علی ابن ابی طالب نے بالکل اسی درد کا ذکر فرمایا ہے:

"هَيْهَاتَ اَنْ يَغْلِبَنِي هَوَايَ وَيَقُودَنِي جَشَعِي اِلىٰ تَخَيُّرِ الْاَطْعِمَةِ وَلَعَلَّ بِالْحِجَازِ اَوِ الْيَمَامَةِ مَنْ لَا طَمَعَ لَهُ فِي الْقُرْصِ وَلَا عَهْدَ لَهُ بِالشِّبَعِ!! اَوْ اَبِيتَ مِبْطَاناً وَحَوْلِي بُطُونٌ غَرْثیٰ وَاَكْبَادٌ حَرّیٰ. اَوْ اَكُونَ كَمَا قَالَ الْقَائِلُ:

وَحَسْبُكَ دَاءً اَنْ تَبِيتَ بِبِطْنَةٍ
وَحَوْلَكَ اَكْبَادٌ تَحِنُّ اِلَى الْقِدِّ." (۲)

۱۔ ہمارے یہاں سید جمال الدین افغانی کے نام سے معروف ہیں۔

۲۔ ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب کر لیں اور حرص مجھے اچھے اچھے کھانوں کے چن لینے کی دعوت دے جبکہ حجاز و یمامہ میں شاید ایسے لوگ ہوں جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو اور انہیں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہا کروں؟ اس حال میں کہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں۔ یا میں ویسا ہو جاؤں جیسا کہنے والے نے کہا ہے: تمہاری بیماری یہ کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر لمبی تان لو اور تمہارے گرد کچھ ایسے جگر ہوں جو سوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں۔ (نہج البلاغہ' مکتوب ۴۵)

بنیادی طور پر انسانیت ہے ہی درد رکھنا۔

فرماتے ہیں: مجھے نعمتیں حاصل کرنے کی تمام راہوں کا پتا ہے' انہیں حاصل کرنے کی طاقت بھی میرے پاس ہے۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں میں سے جسے بھی چاہوں فراہم کرسکتا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ علی کی عقل نہیں پہنچتی اور وہ نہیں سمجھتا کہ بہترین لباس اور بہترین غذا کیسے فراہم کی جاسکتی ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ لیکن میں ہرگز ایسا نہیں کرتا۔ میں وہ نہیں کہ عراق میں شکم سیر سوجاؤں جبکہ ممکن ہے حجاز یا یمامہ (۱) میں ایسے افراد ہوں جو ایک روٹی کے محتاج ہوں اور وہ انہیں نہیں ملتی ہو۔

پھر فرماتے ہیں: کیا میں ویسا ہو جاؤں جیسے ایک کہنے والے نے کہا ہے: تیرے لئے یہ درد کافی ہے کہ تو شکم سیر سو جائے اور تیرے اردگرد بھوکے پیٹ ہوں۔

آپ کو دنیا میں کتنے افراد ایسے ملتے ہیں جو اتنے صاحبِ درد ہوں؟ لیکن ایسے افراد دنیا میں گزرے ہیں۔ اگرچہ اس درجے کے نہ ہوں ایک درجہ کم تر ہی ہوں۔

(اب) میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ درد کوئی اچھی چیز تو نہیں لیکن انسان ایسے درد کا حامل ہو تو اچھا ہے یا بُرا؟ درحقیقت انسانیت درد کے ہونے کا نام ہے۔ کہا گیا ہے:

الٰہی سینہ ای درد آشنا دہ
غم از ہر دل کہ بستانی بہ مادہ

"الٰہی! ایسا سینہ دے جو درد آشنا ہو اور ہر ایک دل سے غم لے کر ہمیں دے دے۔"

انسان کے لئے شک روح کا درد ہے۔ سست افراد کے شک کی بات نہیں کر رہا کہ جنہیں اگر کسی مسئلے میں شک ہو تو اس شک میں چالیس سال مبتلا رہتے ہیں اور ذہن میں ایک خلجان لئے ہمیشہ اپنے گھر میں پڑے رہتے ہیں' میں تو باغیرت افراد کے شک کی بات کر رہا ہوں۔ غیرت مند

۱۔ یمامہ خلیج فارس میں حجاز کے شمال میں واقع ہے' گویا احسا اور قطیف کے قریب ہے۔ ان علاقوں کی مثال دے رہے ہیں جہاں کے لوگ انتہائی غریب تھے۔

افراد جب تک حقیقت معلوم نہ کرلیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔ انسان کے لئے ایسا شک رکھنا اچھا ہے۔ اللہ نے بھی وعدہ کیا ہے کہ ایسے افراد جو اہلِ دردو اور کوشش کرنے والے ہوں ہم اُن کے لئے راہِ حقیقت کھول دیتے ہیں۔

غیر مقدس شک

ہم نے عرض کیا ہے کہ شک دو طرح کا ہوتا ہے۔ مقدس شک اور غیر مقدس شک۔

غیر مقدس شک کیسا ہوتا ہے؟

یہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بعض افراد بہت شک کرتے ہیں' اس اعتبار سے وہ بیمار ہوتے ہیں۔ یعنی زیادہ شک کرنا بذاتِ خود ایک طرح کی بیماری ہے۔ اسکی مثال آپ عبادات' نماز' طہارت اور نجاست میں دیکھتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بعض افراد نماز میں بہت شک کرتے ہیں۔ اصطلاح میں انہیں ''کثیر الشک'' کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات ان کا شک وسواس کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ طہارت و نجاست میں بے انتہا شک کرتے ہیں۔ اس شک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ یہ بے بنیاد اور بے اساس شک ہوتا ہے۔ جس مقام پر ایک صحیح آدمی یقین کا حامل ہوتا ہے' وہاں ایسا شخص شک میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایسا شک غیر مقدس شک ہے۔ (ایسے) انسان کو چاہئے کہ اپنا علاج کرے۔ اسکے علاج کا طریقہ بھی عرض کریں گے۔ لہٰذا نماز کے بارے میں کہتے ہیں: لَا شَکَّ لِکَثِیرِ الشک. (کثیر الشک کا کوئی شک نہیں۔ یعنی اُسکے شک کی کوئی حیثیت نہیں)

جو کوئی بھی شک میں مبتلا ہو اسکی ذمے داری ہے کہ وہ اکثر پر بنا رکھے اور البتہ کثیر الشک کی ذمے داری ہے کہ وہ صحیح ہونے پر بنا رکھے کیونکہ اسلام نہیں چاہتا کہ کثیر الشک' کثیر الشک رہے۔

وسواس کرنے والے لوگ بھی بہت ہیں۔ بعض کو طہارت و نجاست میں وسواس پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ شک میں رہتے ہیں۔ بعض کو قرأت میں وسواس پیدا ہو جاتا ہے۔ پے در پے شک کرتے ہیں۔ 'وَلَا الضَّآلِّیْنَ' کو دس دس مرتبہ ادا کرتے ہیں' اسکے باوجود شک کرتے ہیں کہ صحیح کہا ہے یا نہیں۔ مذہبی طلاب میں ایسے وسواس کرنے والے بہت مل جاتے ہیں۔ عام طور پر ایسے

افراد جن کی ذہنی سرگرمی زیادہ ہوتی ہے یعنی وہ بہت سوچتے ہیں اور اُن کا ذہن تھک جاتا ہے اگر وہ مذہبی مسائل کی طرف توجہ دیں تو تھکے ہوئے اذہان وسواس کے لئے بہت آمادہ ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے عجیب وسواسی دیکھے ہیں کہ انسان کو یقین نہیں آتا۔ مثلاً (ایک ایسا وسواسی ہے جو) پانی کے اندر چلا جاتا ہے۔ بہت زیادہ زیر آب چلا جاتا ہے پھر بھی شک کرتا ہے کہ اُس کا سر زیر آب گیا تھا یا نہیں۔ واقعاً حقیقت ہے کہ ایک وسواسی پرانے تالابوں میں اپنا سر اس قدر نیچے لے جاتا کہ اُس کا سر تالاب کے فرش کو جا لگتا پھر بھی شک کرتا کہ اُس کا سر زیر آب گیا ہے یا نہیں۔

ایک وسواسی ایسا تھا جو کم ہی کسی پر اعتماد کرتا تھا لیکن میری بات پر اعتماد کر لیتا تھا۔ وہ خود رسالے (توضیح المسائل) میں مسائل پڑھتا تھا لیکن جب تک پوچھ نہ لیتا اُسے یقین نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے (اُسکے) عجیب مضحکہ خیز سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نماز جماعت کی پہلی رکعت کے دو سجدے ادا ہو چکے تھے اور نمازی کھڑے ہو رہے تھے۔ جب یہ شخص کھڑا ہوا (دیکھئے وسواسیوں کے ذہن میں کیسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے) تو اُسکی پیشانی اگلی صف میں کھڑے شخص کی پشت سے ٹکرا گئی۔ وہ کہنے لگا کہ کیا میری نماز باطل ہو گئی ہے؟ میں نے اُس سے پوچھا کہ تمہاری نماز کیسے باطل ہو گئی؟ وہ کہنے لگا کہ یہ اضافی سجدہ ہے۔ بھلا اضافی سجدہ کہاں اور یہ کہاں؟ ایسی ہی اور مثالیں ہیں۔

یہ بیماری ہے اور بیماری بھی ایسی جو بے عقلی کی ایک قسم ہے۔ یعنی (یہ) انسان فاتر العقل ہے جب تک انسان کی عقل و فکر کمزور نہ ہو وہ ایسا نہیں ہوتا۔

اس کا علاج کیا ہے؟

وسواسی کا علاج بے اعتنائی ہے۔ اسلام کا حکم بھی یہی ہے۔ اگر کوئی کثیر الشک والے شک یا وسواس سے دوچار ہو جائے تو اُس کا فقط ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ اس شک پر توجہ نہ دے۔ (ایک شخص) خیال کرتا ہے کہ اُس کا بدن نجس ہو گیا ہے۔ اُسے خود سے کہنا چاہئے کہ اسلام اسی نجس بدن کے ساتھ مجھ سے نماز طلب کرتا ہے۔ شک کرتا ہے کہ اسکی قرأت صحیح ہے یا غلط۔ اُسے کہنا چاہئے کہ اسلام مجھ سے یہی غلط طلب کرتا ہے اصلاً اس کا حکم یہی ہے۔

انھی شکی مزاجوں اور وسواسیوں میں سے ایک شخص قم کے مراجع تقلید میں سے ایک کے ہاں گیا۔ اُن سے کہنے لگا: مجھے نیت میں شک ہو جاتا ہے اور میں نیت نہیں کر پاتا' نیت کرنے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن نہیں کر پاتا۔

نیت اصلاً ایک طبیعی چیز ہے اور اس سے مراد فقط یہ ہے کہ انسان جب نماز کے لئے کھڑا ہو تو متوجہ رہے کہ کیا کام کر رہا ہے؟ جب آپ نمازِ ظہر پڑھنے لگیں' اس حالت میں اگر یہ ہو کہ آپ نہیں سمجھ پا رہے ہوں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں یا ورزش کر رہے ہیں' تو اس صورت میں آپ نے نیت نہیں کی۔ اگر یوں ہو کہ آپ نہیں جانتے کہ دو رکعت نماز پڑھ رہے ہیں یا چار رکعت' تب بھی نیت نہیں ہوئی۔ اگر یوں ہو کہ آپ نہیں جانتے کہ جو چار رکعتیں آپ پڑھنے لگے ہیں وہ ظہر کی ہیں یا عصر کی' تب بھی آپ کی نیت نہیں ہوئی۔

لیکن اگر آپ نماز کے لئے کھڑے ہوں اور کوئی آپ سے پوچھے کہ کیا کر رہے ہیں اور آپ کہیں کہ نماز پڑھ رہا ہوں۔ وہ پوچھے کون سی نماز؟ کہیں' نمازِ ظہر' چار رکعت' واجب۔ یہ سب باتیں آپ کے ذہن میں موجود ہیں' تو یہ کافی ہے۔ انسان کیا عمل انجام دے رہا ہے یہ اُسکے ذہن میں موجود ہو تو یہی نیت ہے۔

وہ وسواسی اُن عالم کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ: میں نیت نہیں کر پاتا۔ اُنہوں نے اُس سے کہا: تم نیت نہیں کر سکتے' اس کا کیا مطلب ہے؟ مزید پوچھا: تم کس کی تقلید کرتے ہو؟ کہنے لگا: آپ کی۔ کہنے لگے: میرے فتوے کے مطابق نماز میں نیت واجب نہیں ہے۔ (وہ شخص) مطمئن ہو کر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا: میں (بغیر نیت کے نماز ادا) نہیں کر سکتا۔ پوچھا: کیوں؟ کہنے لگا: میں کچھ بھی کرلوں نیت خود بخود آ جاتی ہے۔ کہنے لگے: میرے فتوے کے مطابق نیت آئے یا نہ آئے تمہاری نماز درست ہے۔

یہ انسان کے ذہن کا ایک خلل ہے۔ مجھے نہیں معلوم اسکی بنیاد اعصابی ہے یا روحانی لیکن اس کا علاج یہی ہے۔

اصولِ دین میں وسوسہ

بعض افراد میں فروعِ دین میں کثیر الشک کی یہ حالت' العیاذ باللہ اصولِ دین میں بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ہر چیز میں شک کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ وسواس کی ایک صورت ہے۔ ایسے شخص کا شک مقدس شک نہیں ہے' وسوسہ ہے۔ ایسے اشخاص کے علاج کے بارے میں علما کا کہنا ہے کہ اگر وہ علم و فکر اور برہان کا آدمی ہے۔ یعنی اس حد تک پہنچ چکا ہے' تو اسے ایک عرصے تک علومِ ریاضی مثلاً حساب میں کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ علومِ ریاضی علومِ برہانی ہیں اور سادہ ترین علومِ برہانی ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کا ذہن اس کجی اور انحراف سے نکل آئے۔ لیکن اگر وہ عام آدمی ہے اور ایسے شکوک اور وسواس سے دوچار ہوگیا ہے' تو اسکے علاج کا طریقہ عمل اور عبادت ہی ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے شک کو اہمیت نہ دے اور عبادت کرے۔ خاص طور پر قرآن زیادہ پڑھے۔ زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہے' وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا (۲) کہے۔

بہرحال اگر انسان کی روح اور اس کا دل زیادہ تر اللہ کی یاد میں رہے گا (تو یہ شکوک اور وسوسے ختم ہوجائیں گے) کیونکہ یہ شیطانی وسوسے ہیں۔ جہاں پر یادِ خدا آجائے یہ شیطانی وسوسے ختم ہوجاتے ہیں۔

ایک شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ اِھْلَکْتُ' اے اللہ کے رسول! میں ہلاک ہوگیا' میری مدد کیجیے۔ رسول اللہ نے اُسکی طرف دیکھا' قبل اسکے کہ وہ کچھ کہے' آپ نے فرمایا: کیا میں بتاؤں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ یقیناً شیطان نے آکر تم سے سوال کیا ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ کہنے لگا: ہاں یارسول اللہ۔ (فرمایا) تم نے

۱۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۵۸۔ اس آیت کی ابتدا اس صورت میں ہے: وتوکل......

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۱۱۔ اسکی ابتدا اس صورت میں ہے: وقل الحمد......

اسے جواب دیا کہ مجھے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ بولا: جی ہاں یارسول اللہ۔ فرمایا: وہ دوبارہ آیا اور اُس نے تم سے کہا: اب ذرا یہ بتاؤ کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور تم اُس کا جواب نہیں دے سکے۔ کہنے لگا: یارسول اللہ! ایسا ہی ہوا ہے۔ فرمایا: تم کیوں خوفزدہ ہو؟ **هذا محض الایمان** 'یہ عین ایمان ہے۔

علما نے اس حدیث پر بحث کی ہے کہ رسول اللہ نے یہ جو فرمایا کہ: عین ایمان ہے۔ اس کا کیا مقصد ہے؟ یعنی تمہارا یہ شک ایک مقدس شک ہے۔ جب یہ وسوسہ تمہارے دل میں پیدا ہو اور تم اس طرح سے پریشان اور مضطرب دوڑ کر میرے پاس آؤ اور تم اپنے اس شک سے نجات چاہ کر یقین کی پناہ میں آنا چاہتے ہو تو یہ عین ایمان ہے اللہ تمہیں نجات دے گا۔

اللہ کیسے اسے نجات دے گا؟ (واضح ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا)

فرمایا: کیا تم اس بات پر بہت پریشان ہے؟ (بولا) ہاں یارسول اللہ۔ (فرمایا) عبادت کرو کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ تمہارے ذہن سے یہ تمام وسوسے دور ہو جائیں گے۔ اُس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس کا یہی نتیجہ برآمد ہوا۔

جوانوں کے مذہبی افکار و عقائد میں بحران

عام طور پر ہر شخص اپنی زندگی میں شک اور یقین کے لحاظ سے بحران سے دوچار ہوتا ہے۔ البتہ فرق اور اختلاف کے ساتھ۔ جو افراد گہرے اور غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں اُن میں شاید یہ عمل بارہ تیرہ سال کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔ بعض میں کچھ بڑی عمر میں سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں۔ لیکن وہ شخص انتہائی کورہ ہوتا ہے جس میں سرے سے ایسی کوئی چیز پیدا ہی نہیں ہوتی یا مثلاً تیس سال کی عمر میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے مذہبی افکار و عقائد میں ایک بحران ہوتا ہے۔ انسان بچپن میں ماں باپ سے اُن کے عقائد و نظریات ان کے خلاف بغیر کسی احتمال کے جوں کے توں اخذ کر لیتا ہے۔ وہ جونہی بڑا ہوتا ہے اُسے خیال آتا ہے کہ ممکن ہے میں نے ماں باپ سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ درست نہ

ہو۔اس طرح وہ ایک بحران سے دوچار ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر اس نوجوان میں ایک حساس کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اسکی مدد کی جانی چاہئے۔ اس مقام پر' عمر کے اس حصے میں کسی جوان کے ساتھ مذہبی عقائد کے حوالے سے سخت طرز عمل اختیار کرنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ بحران کے اس دور میں (جو ایک فطری اور معمول کا بحران ہے) اکثر جوان والدین یا اپنے دوستوں کے سامنے ایسے افکار کا اظہار کرتے ہیں جنہیں ممکن ہے وہ لوگ اس جوان کی خباثت کی دلیل سمجھیں اور اُس سے سختی سے پیش آئیں اور کہیں کہ دفع ہو جا' یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے' ایسی باتیں تو کفر کا باعث ہیں۔ جبکہ وہ فقط سوال کر رہا ہوتا ہے اور اپنے اس طرز عمل سے وہ لوگ اس جوان کی روح کو بدتر نافرمان بنا رہے ہوتے ہیں۔

یہ تو ہے انفرادی حوالے سے۔

دینی راہنماؤں کی مشکل ذمے داری

اجتماعی حوالے سے بھی ایسا ہی ہے۔ جس طرح ایک فرد اپنی عمر کے ایک دور میں ایک انتقالی حالت سے دوچار ہوتا ہے اور بحران و انتقال کا دور گزارتا ہے' (اسی طرح) معاشرہ بھی بسا اوقات بحران و انتقال کا ایک دور طے کرتا ہے۔ مثلاً اُس میں ایک ادبی' ثقافتی یا فکری تغیر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت ہمارا معاشرہ ایسی ہی حالت سے گزر رہا ہے۔ خود اہلِ مغرب بھی دو سو سال قبل ایسے ہی ایک شدید بحران سے دوچار ہوئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے جبکہ سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی' یورپی دنیا مذہبی مسائل کے بارے میں آج سے کہیں بڑھ کر شک و شبہ اور انکار میں گرفتار تھی۔ اُن کے معاشرے ہمارے آج کے معاشروں کی طرح ایسا ہی ایک دور طے کر رہے تھے۔ اسی لئے ایسے معاشرے کا سامنا کرنا غیر معمولی حساسیت اور سنجیدگی کا متقاضی ہے۔

یہی امر ایسی مذہبی نشستوں اور ایسے اداروں کی ذمے داری بڑی مشکل اور دشوار کر دیتا ہے۔ ایسے مسائل درپیش رہے ہیں کہ گزشتہ دور میں ہمارا معاشرہ ایک بچے کی حالت رکھتا تھا اور وہ معاشرہ ان مسائل پر سرے سے غور و فکر ہی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب معاشرہ غور کرتا ہے اور جب غور

کرتا ہے تو سوال کرتا ہے۔ جب سوال کرتا ہے تو مناسب جواب چاہتا ہے۔

مجھے یورپ سے ایک تعلیم یافتہ دوست کا خط ملا تھا۔ البتہ وہ خود ایک متدین اور نسبتاً غور و فکر کرنے والا شخص ہے۔ اُس نے لکھا تھا کہ یورپ میں آج جو جوان ایرانی موجود ہیں دینی حقائق جاننے کے لئے ان کی پیاس بہت بڑھ گئی ہے اور وہ بہت تشنہ ہیں اور (ان حقائق کا ان سے بیان کرنا) بہت موثر ہے۔ اُس نے خود بھی بعض سادہ مذہبی مسائل پر ایک خطاب کیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ یہ غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوا۔ اُس نے لکھا تھا کہ ایک اور شخص نے بھی اسلامی اقتصادی مسائل اور خصوصاً سود وغیرہ کے مسئلے پر گفتگو کی۔ اچانک ایک شخص کھڑا ہوا (وہ شاید اجتماعی سرگرمیوں میں ان جوانوں کا لیڈر تھا) اور کہنے لگا کہ: میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہمیں اب تک اسلام کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

مثلاً سو سال پہلے کسی نے سوچا ہی نہ تھا کہ اسلام میں حقوق نسواں کے نام سے بھی کوئی مسئلہ موجود ہے۔ موجود تو تھا لیکن کسی نے اسکے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ لیکن آج کچھ لوگ سوچتے ہیں۔ لہٰذا وہ جواب مانگتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں کوئی بھی سوذ سرمایہ داری یا غیر سرمایہ داری کے مسائل کے بارے میں سوچتا تک نہ تھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا اور کیسا ہے؟ کیا وہ آج کے سرمایہ دارانہ نظام سے سو فیصد مطابقت رکھتا ہے' یا آج کے سوشلسٹ نظام سے سو فیصد مطابقت کا حامل ہے' یا پھر ایک مستقل جداگانہ نظام ہے' نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے' بلکہ ایک مستقل مکتب ہے اور اگر وہ جدا اور مستقل مکتب ہے تو وہ کیسا ہے؟ یہاں تک کہ مادہ پرستی اور اسکے افکار سے متعلق آج جو کچھ سوالات ہیں وہ گزشتہ زمانے میں نہیں تھے۔

معاشرے کے قائدین اور مذہبی رہنماؤں کا فریضہ ہے کہ بحران سے دوچار اور ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہونے والے اس معاشرے کا پوری توجہ سے سامنا کریں۔ اسی طرح جیسے ایک چودہ تا سترہ سالہ جوان کے مسائل کا سامنا بہت سنجیدگی اور توجہ سے کرنا چاہئے۔ کہتے ہیں کہ اس عمر میں جوان میں اپنے باطنی حوالے سے ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے' خاص طرح کے کچھ مسائل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اُسکے اندر کچھ

خاص مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو اس قسم کے مراحل میں ہو' وہاں دینی راہنماؤں کا فریضہ غیر معمولی طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔

پس شک اگر مقدس ہو تو اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ جس کے اندر شک پیدا ہوا ہو وہ اس شک کو اپنی منزل اور ٹھہرنے کی جگہ قرار نہ دے دے' اسے گزر گاہ اور دالان قرار دے' اور بشرطیکہ معاشرہ اس روحانی درد کے علاج کے لئے تیار ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس دالان اور گزرگاہ سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

✿✿

اسلام کے بین الاقوامی تعلقات☆

ہماری اِس نشست کا موضوع ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات'' ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی تعلقات (کے عنوان) سے مقصد یہ ہے کہ ہم واضح کریں کہ ایک مسلمان کا ایک غیر مسلم کے ساتھ میل جول کیسا ہونا چاہئے' یا ایک اسلامی معاشرے کا کسی غیر اسلامی معاشرے سے تعلق کیسا ہونا چاہئے؟

تعلقات کی اقسام

ایک مسلمان فرد کے کسی غیر مسلم فرد سے تعلقات' اور ایک اسلامی معاشرے کے کسی غیر اسلامی معاشرے سے تعلقات' دو مختلف مسائل ہیں۔ ان دونوں کو ایک نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ میں جو ایک مسلمان ہوں' مجھے ایک دوسرے شخص سے' جو مسلمان نہیں ہے' کیسے تعلقات اور کیا طرزِ عمل رکھنا چاہئے؟ اُس کے بارے میں میری کیا ذمے داریاں ہیں اور اُسکے اور میرے درمیان کیا حقوق موجود ہیں؟ اور یہ ایک جدا مسئلہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ' جس کی

☆ یہ تقریر ۱۹۷۵ء میں دینی تعلیمات کے اساتذہ کے ایک سیمینار میں کی گئی جو مغربی تہران کے ایک مقام پر منعقد ہوا۔

حکومت اسلامی ہے' اُس اسلامی حکومت کا رابطہ ایک غیر مسلم فرد اور ایک غیر مسلم معاشرے سے کیسا ہونا چاہئے؟ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف مسائل ہیں۔ انہیں باہم خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

اس سلسلے میں مختلف نظریات ہو سکتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ:

مسلکِ صلحِ کُل اور دین ایک انفرادی وجدانی معاملہ ہے

ایک دین کے طور پر اسلام کو (اسلام ہی سے مخصوص نہیں' بلکہ کلی طور پر ہر دین کو) افراد کے ایک دوسرے سے روابط و تعلقات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ وہ افراد اُس دین کے پیرو ہوں یا پیروکار نہ ہوں۔

کیوں؟

اس لئے کہ ان کے بقول دین افراد کے قلب سے تعلق رکھنے والا ایک معاملہ ہے' ایک قلبی امر ہے۔ اس قلبی امر کو لوگوں کے باہمی تعلقات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہونا چاہئے۔ زید کا ضمیر اور دل چاہتا ہے کہ وہ ایک دیندار انسان کی حیثیت سے رہے۔ وہ اپنے دل کے اس کہے پر عمل کر سکتا ہے اور متدین بن سکتا ہے۔ ان کے بقول وہ ہفتے میں ایک بار یا جب بھی وہ عبادت کی ضرورت محسوس کرے کلیسا میں جائے اور عبادت اور راز و نیاز کرے۔ لیکن کلیسا کے باہر وہ دوسرے تمام افراد کے برابر ہے' کیونکہ دین ایک قلبی معاملہ ہے۔ ایک شخص کا ایک دین ہے' جبکہ دوسرا شخص کوئی دوسرا دین اپنانا چاہتا ہے' یا کوئی دین اختیار ہی نہیں کرنا چاہتا۔ پس کسی دین کو اپنانے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ دین انفرادی اور اجتماعی روابط اور تعلقات پر اثر انداز ہو۔

یہاں تک کہ عائلی معاملات میں بھی وہ کہتے ہیں کہ شوہر اور بیوی علیحدہ علیحدہ دین پر ہو سکتے ہیں' یا ہو سکتا ہے کہ بیوی کا سرے سے کوئی دین ہی نہ ہو۔ یا بیوی کا تو دین ہو لیکن شوہر کا کوئی دین نہ ہو۔ وہ اسے ''مسلک صلح کُل'' کہتے ہیں۔ یعنی سب کے ہمراہ صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہئے۔ عیسائی اس نظریے کی بہت زیادہ تبلیغ کرتے ہیں۔ البتہ وہ خود اسکی پابندی نہیں

کرتے۔ یعنی اُنکی تبلیغ دوسروں کے لئے کرتے ہیں خود اپنے لئے نہیں۔ یہ بھی ایک سوچا سمجھا معاملہ ہے۔ جو لوگ اپنے پروپیگنڈے میں بہت ہوشیار ہیں' جیسے عیسائی' جو (اس حوالے سے) بہت تربیت یافتہ ہوتے ہیں' وہ براہ راست بہت کم تبلیغ کرتے ہیں' یا اصلاً (ایسی تبلیغ) کرتے ہی نہیں۔ بلکہ وہ غیر مستقیم (Indirect) تبلیغ کرتے ہیں۔ ایسی تبلیغ کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر ادیان کے ماننے والوں اور پیروکاروں کی اُن کے اپنے دین سے وابستگی کو کمزور کردیتے ہیں اور اُن کے عقیدے کو متزلزل کردیتے ہیں۔

غیر متعصب روشن فکری کا اصول

مثلاً ایک اصول جو روشن فکری کا اصول کہلاتا ہے' اور جس نے آہستہ آہستہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ کچھ رسوخ حاصل کرلیا ہے' وہ کہتا ہے کہ روشن فکر انسان میں تعصب نہیں ہوتا۔ اخبارات کی منطق کے مطابق ''دینداری'' کا لفظ ''تعصب'' کے مترادف ہوگیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تعصب سے اُن کی کیا مراد ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک معنی کے لحاظ سے تعصب کا تعلق خودغرضی اور خود پرستی کے خاندان سے ہے۔ یعنی انسان کسی چیز یا کسی فکر کا اس وجہ سے پابند ہو کہ وہ اس سے وابستہ ہے' اس کے خاندان یا فیملی سے وابستگی رکھتا ہے۔

''تعصب'' کا مادّہ ''عصب'' ہے۔ مثلاً میں ایک بات کرتا ہوں اور میری گفتگو منطقی نہیں ہے لیکن کیونکہ یہ بات میں نے خود کی ہے' اس لئے اس پر ڈٹ جاتا ہوں' یہ تعصب ہے۔ اسی طرح میرے والد یا اجداد نے کوئی بات بیان کی ہے' جو منطقی نہیں ہے اور میں صرف اس بنا پر کہ وہ میرے اجداد کی بات ہے' اس غیر منطقی بات کی حمایت کرتا ہوں' یہ تعصب ہے۔ کیونکہ میں ایک ایسی بات کی حمایت کررہا ہوں جو منطق سے مطابقت نہیں رکھتی۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بات کی حقیقت کو پالیتا ہے۔ یعنی اُس نے وہ بات عقل و منطق کے مطابق دریافت کرلی ہوتی ہے اور اُس پر ایمان لے آیا ہوتا ہے' اسکے ساتھ اس کا تعلق تعصب کی بنیاد پر نہیں ہے' اس صورت میں اُسے چاہئے کہ اس بات کو (جسے اُس نے بطورِ حقیقت

قبول کیا ہے) اپنے عقیدے کا جز بنائے۔

بے تعصبی یا بے مسلکی

اگر انسان منطق کی بنیاد پر کسی نظریے کو قبول کرے' تو کیا پھر اسے اس نظریے کے بارے میں غیر جانبدار رہنا چاہیے؟

اگر ہم مکتب صلح کُل کے حامیوں سے سوال کریں کہ کیا انسان کا کسی مسلک پر ہونا پسندیدہ بات ہے' تو جواب میں وہ کہیں گے کہ ہاں' اچھا ہے کہ انسان کا کوئی مسلک ہو۔ ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ انسان کا کسی مسلک پر ہونا اچھی بات ہے۔ مسلک پر ہونا یعنی ایک مسلک اور طرزِ عمل کی حمایت کرنا' تو پھر آپ کیوں اس مقام پر اسے تعصب قرار نہیں دیتے۔

سب سے محبت

اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ روشن فکری اور صلحِ کُل کے نام پر عیسائی اور عیسائی مبشرین کے ذریعے درحقیقت مسیحی استعمار پسند عناصر نے دنیا میں اس فکر کی تبلیغ کی ہے کہ ایک باایمان شخص کو صلحِ کُل کے نظریے کا تابع ہونا چاہیے۔ جیسا کہ عیسیٰ مسیح نے کہا ہے کہ اگر کوئی آپ کے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو آپ بایاں رخسار بھی اُسکے آگے کر دیجیے' تاکہ وہ اس پر بھی تھپڑ مار دے۔ سب سے محبت کرو۔ بہر حال صلحِ کُل کا حامل ہونا ایک فکر اور نظریہ ہے اور اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ دین صرف ایک قلبی معاملہ ہے۔ یہ مسئلہ کہ دین ایک قلبی معاملہ ہے' اسکی بھی ایک بنیاد ہے اور وہ بنیاد یہ ہے کہ:

انفرادی اور ذوقی مسائل

انسان کے مسائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے مسائل سلیقے اور ذوق و مزاج سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی ایسے مسائل جو ہر انسان کے وجود کی عمارت سے متعلق ہیں۔ اس قسم کے مسائل میں ہر کسی کو آزاد رہنا چاہیے۔ یعنی اُسکے لیے وہی ''اچھا'' ہے جسے اُس نے منتخب کیا ہے۔

(اس سلسلے میں) ایک مثال عرض کرتا ہوں: کیا اپنے لباس کے رنگ کے بارے میں سارے انسانوں کا ذوق ایک جیسا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کپڑا بنانے والے کارخانے طرح طرح کے رنگوں کے کپڑے بنانے پر مجبور نہ ہوتے۔ بلکہ ایک ہی رنگ منتخب کرتے اور اپنا بنا ہوا تمام کپڑا اس رنگ میں بازار میں پیش کر دیتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ دسیوں رنگوں اور ڈیزائنوں کے کپڑے تیار کرتے ہیں اور اُن تمام کپڑوں کے خریدار ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ لوگ مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کو پسند کرتے ہیں۔

مزید مثالیں عرض ہیں:

کیا سب لوگوں کی کھانے کی پسند ایک جیسی ہے؟ کیا سب لوگ چاولوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا شوربا پسند کرتے ہیں؟ نہیں۔

کیا شعر اور شاعر کی پسند کے حوالے سے لوگوں کا ذوق اور سلیقہ ایک سا ہوتا ہے۔ یعنی کیا سب کے سب ایک طرح کے شعر اور فقط ایک شاعر کو پسند کرتے ہیں؟ آپ لوگوں میں سے شعر دوست افراد کو تلاش کیجئے اور پھر ان میں سے ہر ایک سے پوچھئے کہ آپ کو کونسا شعر اور کونسا شاعر پسند ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی حافظ کو' کوئی سعدی کو' کوئی فردوسی کو' کوئی خیام کو اور کوئی جامی کو پسند کرتا ہے۔ یہی حال موسیقی اور آوازوں کی پسند کا ہے۔

ایسے امور میں واقعاً مختلف ذوق ہوتے ہیں اور ہر کسی کی نظر میں ''اچھا'' وہ ہوتا ہے جو اُس نے منتخب کر رکھا ہے۔ ایسے مسائل میں کوئی مطلق اچھا اور کوئی مطلق بُرا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک وہی رنگ اچھا ہے جسے میں پسند کرتا ہوں' اور آپ کے نزدیک وہی رنگ اچھا ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ یہی حال انسانوں کو پسند کرنے کا ہے۔ مثلاً کیا سب مردوں کو ایک جیسی عورتیں پسند ہوتی ہیں اور کیا سب عورتیں ایک جیسے مردوں کو پسند کرتی ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک عورت ایک مرد کو محبوب ہوتی ہے جبکہ دوسرا مرد اسی عورت کو ناپسند کرتا ہے؟

ایسے مسائل میں حقیقی اچھا اور برا موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقی اچھا اور برا ہر انسان کے انفرادی وجدان اور ذوق سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنے بچوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرنا

چاہئے کہ لازماً تم فلاں رنگ کا لباس منتخب کیا کرو اور فلاں غذا کو پسند کیا کرو اور فلاں لڑکی سے محبت کرو اور اسے اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرو۔ اس طرح ٹھونسنا غلط بات ہے۔

البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کا میرے اور آپ کے ذوق اور سلیقے سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ وہ مسائل اور امور حقائق سے عبارت ہیں۔ مثلاً طب اور میڈیکل سائنس سے متعلق مسائل ہی کو لے لیجئے۔ اگر میں بیمار ہو جاؤں' تو کیا اپنے علاج کے لئے اپنے ذوق اور سلیقے کے مطابق عمل کر سکتا ہوں؟ میرا ذوق یہ کہے کہ میں علاج کے لئے فلاں دوا استعمال کروں گا' فلاں غذا سے پرہیز اور فلاں غذا سے استفادہ کروں گا۔ اسکے برخلاف ڈاکٹر کہے گا کہ علاج کا طریقہ اور پرہیز تمہاری پسند اور ذوق سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ ایسے امور ہیں جن کا تمہاری پسند سے تعلق نہیں' یہ ذوقی امور نہیں بلکہ حقیقی امور ہیں' ایسے امور کا اپنا ایک حساب ہوتا ہے۔ تمہارا مرض اس طرح بڑھ سکتا ہے اور اس کا علاج اس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ذوق پر عمل کیا' تو اس کا نتیجہ موت ہے اور طبابت کے حقیقی امور میں اطاعت کا نتیجہ زندگی ہے۔

جن افراد نے دینی امور میں صلحِ کُل کا نظریہ قبول کر لیا ہے' وہ درحقیقت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دین خیالی پہلو رکھتا ہے اور اس کا حقائق سے کوئی سروکار نہیں۔ جس طرح ایک شخص کو موسیقی پسند نہیں ہے' اُسی طرح دوسرا شخص دین کو پسند کرتا ہے۔ (بالکل اُسی طرح جیسے) ایک آدمی اصفہان میں رہنا چاہتا ہے اور دوسرا تہران میں اور تیسرا کسی دیہات میں۔ ہر شخص جس چیز کا بھی انتخاب کرنا چاہتا ہے' وہ اسکے لئے اچھی ہوتی ہے۔ (یہ حضرات) اس نظریے کو بہت ہوا دیتے ہیں کہ ایک روشن فکر انسان صلحِ کُل کا حامی ہوتا ہے اور دین ایک قلبی معاملہ ہے۔

جبکہ دین ایسا نہیں ہے اور کم از کم یہ چیز تو ثابت شدہ ہے کہ یہ بات دینِ اسلام کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتی۔ کیونکہ دینِ اسلام فرد اور معاشرے کی سعادت و کامیابی کی اساس پر ایک ضابطہ اور نظریہ ہے' اور اگر انسان اسے قبول کرے اور اس پر عمل پیرا ہو تو انسان کو انفرادی اور اجتماعی سعادت مہیا کرتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اس کا تعلق ہر شخص کے ذوق اور مزاج سے نہیں ہو سکتا۔

نظریے کے ساتھ ذمے داری بھی ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں اس نظریے کو قبول کرنا مجھ پر ذمے داری بھی عائد کردیتا ہے۔ پہلی ذمے داری مجھ پر اپنے وجود کے بارے میں عائد ہوجاتی ہے۔ پھر اپنے خاندان کے بارے میں' اسکے بعد اپنی قوم اور معاشرے کے بارے میں' بلکہ پورے انسانی معاشرے کے بارے میں۔

یہ قبولیت ذمے دار اور پابند بنادیتی ہے

جب میں دین کو ایک خیال اور تصور کے طور پر نہیں' بلکہ ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہوں' تو یہ قبولیت لازماً میرے روابط و تعلقات میں کچھ پابندیاں عائد کردیتی ہے۔

یہ پابندیاں کیا ہیں؟

جب میں جان گیا ہوں کہ بیماری اور صحت ایک حقیقی امر ہے' ذوقی معاملہ نہیں' تو کیونکہ مجھ پر اپنی صحت و سلامتی کی ذمے داری عائد ہوتی ہے' اس لئے میرے لئے ضروری ہے کہ اپنی صحت و نگہداشت کی حدود کو پیش نظر رکھوں اور کچھ پابندیوں پر عمل کروں۔

مثلاً اگر تپ دق کے فلاں مریض کے ساتھ رہن سہن میری سلامتی کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے' تو لازمی طور پر مجھے اسکے ساتھ اپنے تعلقات پر ایک طرح کی نظر ثانی کرنا ہوگی۔ یعنی حفظانِ صحت کے نکتۂ نظر سے ایک صحت مند شخص سے میرے تعلقات اور ایک بیمار اور تپ دق کے مریض شخص سے میرے تعلقات ایک جیسے اور یکساں نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح ایک صحیح و سالم اور جراثیم سے پاک ماحول سے میرا تعلق اور ایک جراثیم خیز ماحول سے میرا تعلق ایک جیسا نہیں ہوسکتا۔ یہ معاملہ انفرادی حوالے سے' خاندان کے حوالے سے اور اپنی فیملی کے حوالے سے ایک جیسا ہے۔ نیز معاشرے کے حوالے سے بھی ایسا ہی ہے' کیونکہ معاشرے کے بارے میں بھی میں ذمے دار ہوں۔ مجھے چاہئے کہ اپنے روابط و تعلقات میں حقیقی مسائل کی پیروی کروں۔

اس مقام پر میں ایک طرف اپنی سلامتی کا ذمے دار ہوں اور دوسری طرف مجھے معاشرے

میں اس بیماری کے خلاف بھی جدوجہد کرنا چاہئے اور معاشرے میں صحت وسلامتی کا ماحول پیدا کرنا چاہئے' اور اگر کبھی ضروری ہو جائے تو اپنے آپ کو اور اپنی سلامتی کو معاشرے پر فدا کردوں اور اگر کبھی کوئی مریض صحت وسلامتی کے لئے کی جانے والی میری کوششوں کے خلاف مزاحمت کرے' تو مجھے اُسے آزاد نہیں چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ بیماری ہی میں پڑا رہے' بلکہ مجھے اُسے صحت مند بنانا چاہئے۔ وہ صحت مند ہونے کے بعد میرا شکر گزار اور ممنون ہوگا۔ اس مقام پر اس داستان کا ذکر ضروری ہے:

عاقلی بر اسب می آمد سوار

در دھان خفتہ ای می رفت مار

قصہ یوں ہے کہ: ایک دانا شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ راستے میں وہ ایک نہر کے پاس پہنچا۔ نہر کے کنارے ایک سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک تھکا ماندہ آدمی گہری نیند سو رہا تھا۔ اُسکی نیند اتنی گہری تھی کہ ایک زہریلا کیڑا اس کے منہ کے قریب ہوا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے سوئے سوئے اس کیڑے کو نگل لیا اور وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ وہ دانا شخص یہ منظر دیکھ رہا تھا' سمجھ گیا کہ اگر زہریلے کیڑے نے اسکے معدے میں زخم کر دیا تو وہ مر جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے اُسے جگایا اور یہ بتایا کہ اُسکے ساتھ کیا ہو گیا ہے' تو دو خطروں کا امکان ہے۔ ایک یہ کہ وہ شخص خوفزدہ ہو جائے اور مارے خوف کے مر جائے' اور دوسرا یہ کہ وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرے اور کہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا' کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لہٰذا دانا شخص نے زور سے اپنا ڈنڈا اُسے مارا۔ یہ ڈنڈا عصا کے طور پر اسکے پاس تھا۔ سویا ہوا شخص اچھل پڑا۔ کہنے لگا: کیوں مارتے ہو؟ اُس مردِ دانا نے اسے ایک اور ڈنڈا رسید کیا اور کہا: میرے گھوڑے کے آگے آگے دوڑ لگاؤ۔ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہ تھا' لہٰذا اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ البتہ مسلسل اُسے بُرا بھلا بھی کہتا جاتا تھا اور چیخ چیخ کر فریاد بلند کر رہا تھا کہ ہائے میری قسمت' یہ جلاّد کون ہے جس نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے؟ جب تھک کر چور ہو گیا تو مردِ دانا نے اسے مجبور کیا کہ وہ وہاں پڑے ہوئے گندے اور سڑے ہوئے سارے سیب کھا لے۔ اسکے بعد پھر اس نے اسے اتنا مارا کہ اسے متلی ہوئی اور

اس نے جو کچھ کھایا تھا' اس زہر آلود کیڑے سمیت قے کی صورت میں اگل دیا۔ جب اُس شخص کی نظر اس دہشت ناک کیڑے پر پڑی' تو اس نے اس دانا شخص سے کہا: تم تو فرشتے ہو' پھر وہ مسلسل اسکی تعریف وستائش کرتا رہا۔

اس قصے میں صحت وسلامتی کا معاملہ درپیش تھا اور یہاں پر فرد اور معاشرے کی خیر اور مصلحت کا مسئلہ درپیش ہے۔

ذمے داری اور طاقت کا استعمال

ممکن ہے ایک انسان کو خود اپنی مصلحت کا علم نہ ہو۔ اس مقام پر اگر کوئی مصلح انسان فرد اور معاشرے کی مصلحت میں کسی بات کا تعین کرلے' تو اگر ہو سکے تو اُسے چاہئے کہ لوگوں کو اپنی اس تشخیص کی خوبیوں سے آگاہ کرے اور اسکے بعد ان سے اس پر عمل کا تقاضا کرے۔ لیکن اگر لوگ اسکی بات کو نہ سمجھیں' تو پھر اسے چاہئے کہ طاقت کا استعمال کر کے بھلائی اور سلامتی فراہم کرے۔

کیا آپ کی نظر میں زبردستی تعلیم دینا منطقی بات ہے؟

جی ہاں' ضرور یہ ایک منطقی عمل ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت کی وجہ سے کہتا ہے کہ میں ان پڑھ ہوں' پڑھنا بھی نہیں چاہتا' میرا بیٹا بھی ان پڑھ ہے اور میں اُسے پڑھانا لکھانا نہیں چاہتا۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتا' تو اس مقام پر ذوق اور مزاج کا معاملہ نہیں ہے۔ (بلکہ) وہ جاہل ہے اور جہالت بدبختی کو پیدا کرتی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

''اگر ممکن ہوتا' تو میں لوگوں کو علم سکھانے کے لئے اُن کے سروں پر کوڑے برساتا۔''

جبری حفظانِ صحت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جب حکومت کوئی بیماری پھیلنے کا خطرہ محسوس کرتی ہے' تو وہ جبراً لوگوں کے ٹیکے لگاتی ہے۔ یہ نہیں کہتی کہ کیا آپ ہمیں ٹیکے لگانے کی اجازت دیتے ہیں؟ بلکہ کہتی ہے کہ آپ ہمیں اجازت دیں یا نہ دیں ہم ٹیکے لگائیں گے کیونکہ ہم ایک منطقی کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ذوق اور پسند ناپسند کا مسئلہ نہیں ہے۔ یا کسی آدمی کی آنکھوں میں دانے نکلنے کی بیماری پیدا ہو جائے اور وہ

جاہل ہے' علاج نہ کرنے دے' تو کیا اُس کی بات مان لی جائے؟ آپ تاریخ پڑھئے۔ تاریخ کہتی ہے کہ جب پہلی مرتبہ چیچک کے لئے ویکسین ایجاد ہوئی' تو لوگوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انگلستان کے سب لوگ اس ٹیکے کی مخالفت کر رہے تھے اور اسے لگانے کو تیار نہ تھے۔ لیکن کیا سمجھدار لوگوں کو اس عوامی جہالت کے تابع ہو جانا چاہئے؟

دین اور خطرے سے بچنے کی ضرورت

اب ہم ایمان اور دین کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ دین سائنس' حفظانِ صحت و سلامتی بلکہ اس سے بھی بالاتر ایک ایسی حقیقت ہے جس کی انسان کو اپنی سلامتی کے لئے ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہے تو معاملہ مختلف ہے۔ میں جو ایک دیندار شخص ہوں' مجھے اپنی زندگی سے ایسے تعلقات ختم کر دینے چاہئیں جو میرے دین کو خطرے میں ڈالتے ہوں۔ اسی طرح اُن کے دین کو بھی جن کے بارے میں مجھ پر ذمے داری عائد ہوتی ہے' (یعنی) میری فیملی' خاندان' معاشرہ اور ساری دنیا کے لوگ۔

دین' طاقت اور جبر

جس طرح ہم آج افریقہ اور بیافرا کے بھوکوں کے لئے پریشان ہوتے ہیں اور اُن کی بھوک مٹانے کے لئے سوچتے اور کوشش کرتے ہیں' ایک اچھی بات ہے۔ اور اگر ہم دنیا کے بیماروں کی جانب سے فکرمند رہتے ہیں اور ان کے علاج معالجے کے لئے کوئی قدم اُٹھاتے ہیں' تو یہ ایک انسانی عمل ہے۔ دین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر ہم بے دینوں کے لئے پریشان ہوں اور زبردستی اُنہیں ایک حقیقی دین پہنچا سکیں' تو یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ دین کا سائنس سے اور خصوصاً حفظانِ صحت سے فرق یہ ہے کہ حفظانِ صحت کو زبردستی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کوئی ٹیکہ لگوانے پر تیار نہ ہو' تو اُسے زبردستی ٹیکا لگا دیتے ہیں یا بچے کے حلق میں زبردستی گولی ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ اسے نگل لے۔ لیکن دین طبیعتاً زبردستی قبول نہیں کرتا' اگر دین میں زبردستی کی جا سکتی' تو یہ اس قابل تھا کہ (زبردستی) کی جائے۔

البتہ اس بات کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرادوں کہ دین کے بعض امور میں زبردستی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً لوگوں تک حقائق پہنچنے کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں زبردستی ہٹایا جاسکتا ہے۔

مثلاً اگر کچھ لوگ کسی کافر ملک میں' جہاں حکومت دین دشمن ہو زندگی بسر کر رہے ہوں اور اس حکومت نے وہاں کے لوگوں کو زبردستی جکڑ رکھا ہو اور وہاں ہر نظریے کے راستے میں حائل ہوتی ہو تو ایسی صورتِ حال کے خلاف طاقت استعمال کی جاسکتی ہے اور تلوار کے ذریعے رکاوٹیں دور کی جاسکتی ہیں' تاکہ دین کی آزاد تبلیغ کے لئے راہ ہموار کی جاسکے۔ اس صورتِ حال میں' باوجود یہ کہ ہم دین کے بارے میں اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۱) یعنی دین میں جبر نہیں ہے' لیکن اسکے باوجود ابوجہلوں اور ولید بن مغیرہ جیسوں کی سونڈ کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ کیا اُن کے مکہ میں ہوتے ہوئے دین پیشرفت کرسکتا ہے؟ یا اُس زمانے میں ایران اور روم میں ایسی سونڈوں کی موجودگی میں دین کی اشاعت اور پھیلاؤ ممکن تھا؟ ایسے مواقع پر تلوار کے ذریعے زنجیروں کو کاٹ ڈالنا چاہئے' تاکہ رکاوٹیں دور ہونے کے بعد تبلیغ کے ذریعے لوگ دین کی خوبیوں کو جان سکیں۔

جہاد کا مسئلہ یہی ہے۔

جہاد کی بنیاد دو اصول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حفظانِ صحت کی طرح ایک حقیقت ہے' اسلام کی پیشرفت کے سلسلے میں ایک موثر حقیقت ہے اور دوسرا یہ کہ انسان دوسرے انسانوں کے بارے میں ذمے داری رکھتے ہیں' علم اور حفظانِ صحت کی تعلیم کی طرح۔ اگرچہ اسکے ساتھ ساتھ ایمان کے بارے میں ہمارے پاس لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا اصول بھی ہے۔

جہاد

رہی مسئلۂ جہاد کی بات' تو اس میں اسلامی معاشرے کے دوسرے افراد اور معاشروں کے

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶

ساتھ تعلقات وروابط کا مسئلہ داخل ہے۔ جہاد انفرادی طور پر فرد سے تعلق نہیں رکھتا۔ شیعہ اسلامی معاشرے میں جہاد کا حکم فقط امام معصوم یا نائب امام کو صادر کرنا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ جہاد امام یا نائب امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔ جہاد اسلامی معاشرے سے مربوط ہے' البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرد سے بھی مربوط ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک مسلمان کا دوسرے افراد سے تعلق ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ دین کے ایک حقیقت ہونے کا لازمہ دین میں ذمے داری کا حامل ہونا ہے' (خواہ یہ ذمے داری) خود اپنی ذات کے حوالے سے ہو اور خواہ معاشرے کے حوالے سے۔

ضوابط

روابط و تعلقات کے حوالے سے ہمیں کچھ ضوابط کی ضرورت ہے۔ یہ قوانین و ضوابط اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ وہ کون سی حدود ہیں جن میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان اور کسی غیر مسلم کے ساتھ روابط کے مابین کوئی فرق نہیں۔ انتہائی واضح ہے کہ اگر روابط ان حدود میں ہوں جہاں دین اسلام کے حوالے سے کوئی مثبت یا منفی اثر مرتب نہ ہوتا ہو۔

مثلاً کیا میرے لئے جائز ہے یا اسلامی معاشرے کے لئے صحیح ہے کہ فلاں عیسائی یا یہودی مملکت' یا فلاں ملک جو مسلک مادہ پرستی کا قائل ہے' اس سے تعلقات قائم کیے جائیں اور اس سے تجارت کی جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق دنیائے اسلام کے مفادات سے ہے۔ اگر کسی عیسائی ملک کے کسی اسلامی ملک کے ساتھ تعلقات ہیں اور وہ (عیسائی مملکت) اسلامی معاشرے سے حالت جنگ میں نہیں ہے' اور دونوں اسلامی اور عیسائی ممالک کے مابین باہمی احترام کا رشتہ قائم ہے' تو روابط قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں' (جبکہ ان روابط سے) اسلام اور اسلامی معاشرے کو کوئی معمولی سا خطرہ بھی نہ ہو۔

دوسرا سوال: ایک مسلمان فرد کے کسی غیر مسلم فرد کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کیا حکم

ہے؟ اگر کوئی غیر مسلم بھوکا ہو تو کیا ہمارے لئے اُسے کھانا کھلانا جائز ہے؟

جی ہاں! نہ فقط ہمارے لئے (اُسے کھانا کھلانا) جائز ہے بلکہ ہمارا یہ عمل باعثِ ثواب بھی ہے۔ لیکن اگر کسی موقع پر آپ کسی غیر مسلم کے ہاتھ میں چاقو تھمانا چاہتے ہوں کہ اس سے وہ کسی مسلمان کا سینہ چیر ڈالے تو یہ عمل جائز نہیں ہے' غلط ہے اور کسی مسلمان کو اس قسم کے عمل کا اور کسی غیر مسلم سے ایسے تعلقات کا حق حاصل نہیں۔ کسی وقت اگر آپ چاہیں کہ اسرائیل کو غذا فراہم کریں' تاکہ وہ سیر ہو کر اسلامی ممالک پر چڑھ دوڑے' تو یہ عمل قابلِ مذمت اور قبیح ہے۔ لیکن ممکن ہے کوئی یہودی مسلمانوں کے کسی محلّے میں رہ رہا ہو اور بھوکا ہو اور اُس سے کسی مسلمان اور مسلمان معاشرے کو کوئی خطرہ نہ ہو' تو اس صورت میں آپ اُسے سیر کر سکتے ہیں اور اُسے ضرور کھانا کھلائیں' یہ ایک پسندیدہ عمل ہے اور اس کا ثواب بھی ہے۔

قرآنِ کریم کہتا ہے:

"لَا یَنْھٰکُمُ اللہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ." (۱)

یعنی اللہ تمہیں اُن کافروں کے ساتھ نیکی کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے حالتِ جنگ میں نہیں ہیں اور جن کا تمہیں بے گھر کرنے میں ہاتھ نہیں تھے۔

"اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَ ظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ." (۲)

اللہ تم سے کہتا ہے کہ جو لوگ تمہارے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں اُن سے نیکی نہ کرو۔

کیونکہ اُن سے نیکی کرنے کا مطلب مسلمانوں کے ساتھ بُرائی کرنا ہے۔ فرض کیجئے دو آدمی آپس میں کشتی لڑ رہے ہوں۔ اگر آپ اُن میں سے کسی ایک کو قوت فراہم کریں گے تو لازماً

۱۔ سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۸   ۲۔ سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۹

دوسرے کو نقصان پہنچے گا۔

شادی بیاہ

پس اس مطلب کی حدود یہ ہیں کہ اگر اسلام کہتا ہے کہ (مثلاً) غیر مسلم خاتون سے دائمی نکاح بھی نہ کرو، تو اسکی وجہ وہ خطرہ ہے جو بہر حال آپ کے دین کو لاحق ہو سکتا ہے اور جو آپ کے دین کو اور اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچائے گا۔ اگرچہ نفسیات میں کہا جاتا ہے کہ عورت پر مرد کے عقیدے اور ایمان کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اور مرد بہت کم عورت کے عقیدے اور ایمان کا اثر قبول کرتا ہے۔ لیکن اسلام احتیاط کرتا ہے اور یہ بالکل حفظانِ صحت کا سا ایک عمل ہے اور بیماری سے بچنے کے لئے پرہیز کی مانند ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اہلِ تسنّن نے اس اصول کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اگر کوئی شخص اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کرے، تو دیکھے گا کہ ایسے بہت سے مواقع ہیں جہاں کسی مسلمان مرد نے کسی غیر مسلم خاتون سے شادی کی اور اسکے نتیجے میں اس مرد کے ایمان اور مسلمان معاشرے کو بہت سے نقصانات اٹھانے پڑے۔ اور کبھی تو فقط ایک مسلمان مرد کی کسی غیر مسلم خاتون سے شادی کے نتیجے میں مسلمان ملک ہی ہاتھ سے جاتا رہا۔ خود ہمارے ایران میں ایک بادشاہ تھا جس نے غیر مسلم عورت سے شادی کرلی تھی۔ پھر جب وہ اسکے حرم میں ایک محبوب بیوی بن گئی، تو ملک کا عقیدہ اور مذہب ہی تبدیل ہو گیا۔ اگر کوئی شخص گہری نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرے، تو وہ دیکھے گا کہ اس بظاہر نجی مسئلے (کہا جاتا ہے کہ شادی انفرادی اور نجی مسئلہ ہے) نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

اسپین کے زوال میں عورت اور شراب کا کردار

مثلاً اندلس جو ایک قدیم اور عظیم تہذیب یافتہ ملک تھا، آپ اُسے دیکھئے۔ بہت سے مسلمان حکما، ادبا اور فلاسفہ کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ بعد ازاں اسے عیسائیوں نے چھین لیا۔ اب بھی بڑی تاریخی اور عظیم مساجد وہاں پر موجود ہیں۔

عیسائیت نے وہاں کیسے غلبہ پالیا؟

اس نے سازش کی اور وہاں پر دو چیزوں کو رائج کیا۔ ایک بے پردگی اور دوسری شراب نوشی۔ اس سازش کے تحت انہوں نے فیصلہ کیا کہ انتہائی خوبصورت عیسائی لڑکیاں خوب سج دھج کر سڑکوں پر آیا جایا کریں اور مردوں سے آزادانہ تعلقات قائم کریں۔ تھوڑے ہی عرصے میں دل بستگیاں پیدا ہو گئیں، شادیاں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ بالائی سطحوں پر بھی یہی صورت پیدا ہو گئی اور پھر معاملہ تمام ہو گیا۔

اس ملک کے حکمرانوں میں سے ایک کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایک روز سمندر کے کنارے بیٹھا پانی کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک سجی بنی عیسائی لڑکی خراماں خراماں اسکے سامنے سے گزری۔ اس شخص میں اتنی بھی تاب نہ رہی کہ وہ اپنے غلاموں اور خادموں کو بھیجتا کہ اس لڑکی کو اسکے پاس لے آئیں۔ وہ خود اٹھ کر دوڑا اور لڑکی کو اپنی آغوش میں لے کر اپنے بستر پر لے آیا۔ جب اس واقعے کی خبر پوپ کو دی گئی تو اس نے کہا: بس اب ان کا کام تمام ہوا، ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔

سورۂ ممتحنہ کی آیات

پس یہ جزئی مسائل نہیں ہیں، بلکہ ایسے مسائل ہیں جو کسی معاشرے کی ترکیب کو بدل ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ مسلمان آپس میں ایک جسم کے اعضا کی طرح ہیں اور غیر مسلم دوسرا جسم ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ غیر مسلموں سے بدسلوکی کریں۔ جب وہ اسلامی معاشرے کے لئے کوئی خطرہ نہ ہوں تو ہمیں اُن کے ساتھ برا سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اُن کے خطرے کی طرف سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے۔

قرآنِ حکیم کی سورۂ ممتحنہ میں چند آیات ہیں، ضروری ہے کہ اس موقع پر ہم انہیں پڑھیں اور اُن کا ترجمہ کریں۔ سورہ ممتحنہ قرآنِ حکیم کے اٹھائیسویں پارے میں ہے اور سورہ حشر کے بعد ہے اور "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے شروع ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ

بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ." (۱)

پہلے ہم ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کی داستان

ایک شخص حاطب بن ابی بلتعہ نامی تھا۔ وہ مہاجر تھا اور اس کا شمار مکہ کے انتہائی غریب لوگوں میں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس کا کوئی نہ تھا' نہ کوئی دوست' نہ آشنا اور نہ ہم قبیلہ۔ یہ شخص مدینہ چلا آیا۔ یہی وہ وقت تھا جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کی طرف سفر اور اُسے فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ طے یہ تھا کہ اس فیصلے اور روانگی کے وقت کو خفیہ رکھا جائے تاکہ اہلِ مکہ کو آپ کے اس فیصلے کا علم نہ ہو اور مکہ خونریزی کے بغیر فتح ہو جائے۔

اس موقع پر حاطب کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا' جس کے زیر اثر اُس نے اس صورتِ حال کے بارے میں ایک خط لکھ کر ایک عورت کو دیا' کہ وہ اسے خفیہ طور پر مکہ لے جائے اور اہلِ مکہ' مکہ فتح کرنے کے پیغمبر کے فیصلے سے آگاہ ہو جائیں۔ گویا اُس نے جاسوسی کی (ایک مرتبہ ہم نے ایک مکان خریدا۔ اس سودے کا ڈیلر یزد سے تعلق رکھنے والا ایک شخص تھا۔ جب ہم مکان خرید چکے تو وہ ہم سے کہنے لگا: جناب! آپ نے اچھا کیا کہ یہ مکان خرید لیا کیونکہ اس مکان کے مالک کی بیوی کچھ کچھ بہائی تھی)۔ مختصر یہ کہ جس عورت

۱۔ ایمان والو خبردار میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بنانا کہ تم ان کی طرف دوستی کی پیش کش کرو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کر دیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے اور وہ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکال رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم واقعاً ہماری راہ میں جہاد اور ہماری مرضی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہو تو ان سے خفیہ دوستی کس طرح کر رہے ہو؟ جبکہ میں تمہارے ظاہر و باطن سب کو جانتا ہوں اور تم میں سے جو بھی ایسا اقدام کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ (سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۱)

کے پاس وہ خط تھا وہ صحرا میں سے مکہ کی طرف جا رہی تھی کہ رسول اکرم کو واقعے کا علم ہو گیا۔ ظاہراً آپ کو وحی کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی۔ آپ نے تین افراد کو مامور کیا کہ عورت کو تلاش کر کے اس سے خط حاصل کریں۔ یہ تین افراد حضرت مقداد' حضرت زبیر اور حضرت علی تھے۔ ان حضرات نے عورت کو ڈھونڈ نکالا لیکن اس نے اپنے پاس کسی خط کی موجودگی سے انکار کیا۔ انہوں نے اس کے سارے ساز و سامان کی تلاشی لے ڈالی' لیکن خط نہ ملا۔ اس نے قسمیں کھائیں کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ زبیر نے مقداد سے کہا: ہمیں واپس چلنا چاہئے کیونکہ اسکے پاس کوئی خط نہیں لیکن حضرت علی نے کہا کہ ممکن ہی نہیں کہ اسکے پاس خط نہ ہو' کیونکہ رسول اللہ جھوٹ نہیں بولتے۔ لہٰذا انہوں نے تلوار کھینچ لی۔ یہ دیکھ کر عورت سمجھ گئی کہ اسے کس کا سامنا ہے۔ علی مذاق نہیں کیا کرتے' انہوں نے واقعاً تلوار تان لی ہے۔ حضرت علی نے اُس سے کہا: یا تو خط حوالے کر' ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ عورت کہنے لگی: ذرا فاصلے پر چلے جائیں تاکہ میں خط نکال کر دے سکوں۔ اس نے اپنے بالوں کے گچھے میں سے خط نکالا اور اُن کے حوالے کر دیا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خط دیکھنے کے بعد حاطب کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگا: واللہ مجھ سے یہ عمل اپنے ایمان میں خلل کی وجہ سے سرزد نہیں ہوا ہے' بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ سب لوگوں کے دوست اور آشنا ہیں لیکن میرا مکہ میں کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ اس طرح سے (اہلِ مکہ کی) کچھ محبت اور توجہ حاصل کرلوں۔ ظاہراً وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ کیونکہ رسولِ اکرم نے اسے معاف کر دیا۔

ایک شخص مسلمان ہو اور کافروں سے دوستی بڑھائے؟!

قرآن کہتا ہے: اے اہلِ ایمان! میرے دشمن اور خود تمہارے دشمن (میرے دشمن ہیں' یعنی دین کے دشمن ہیں اور تمہاری سعادت کے دشمن ہیں) تم ان سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہو' جبکہ وہ کافر ہیں اور تمہاری آئیڈیالوجی کے دشمن ہیں؟ کیا تم اپنے دشمنوں سے دوستانہ روابط استوار کرتے ہو؟ یہ وہی تو ہیں جنہوں نے تمہارے عقیدے کے جرم اور گناہ میں

پیغمبر کو اور تمہیں تمہارے شہروں سے نکال باہر کیا۔ کیا اب ایسے لوگوں کے ساتھ میل جول قائم کرنا چاہتے ہو؟ ان کی کم سے کم خواہش یہ ہے کہ تم سے تمہارا عقیدہ چھڑوا دیں۔ تم مدینے میں کس طرح اُن سے دوستی کا تعلق قائم کرنا چاہتے ہو اور خفیہ طور پر اُن کے دوست بننا چاہتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں جو تمہارا خدا ہوں' ہر چیز سے آگاہ ہوں؟ جو ایسا کرے وہ راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔ یہ اگر آج تم سے دوستی چاہتے ہیں' تو اسلئے کہ تمہارے مقابلے میں کمزور ہیں۔ اگر کسی روز وہ طاقتور ہو جائیں اور پھر تم پر قابو پالیں' تو تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کی زبانیں بھی تمہارے خلاف چلیں گی اور ہاتھ بھی تمہارے خلاف اٹھیں گے۔ ان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔

"لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ." (۱)

اس میں حاطب کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا قیامت کے دن بیوی بچے انسان کے کام آئیں گے؟

بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ نقل کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: یہ بات ابراہیم اور ان کے پیروکاروں سے سیکھو' جو اپنی قوموں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: ہم تم سب سے اور تمہارے معبودوں سے بیزاری اختیار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان دائمی دشمنی ہے۔ سوائے اسکے کہ ایمان لے آؤ۔ ایمان کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارے تعلقات میں قربت پیدا کر سکے۔

پہلے پہل کمیونزم کا کہنا تھا کہ وہ امپریلزم کے ساتھ ہرگز اچھے تعلقات نہیں رکھ سکتا لیکن بعد ازاں صُلحِ کُل اور مفاد پرستی نے معاملہ بدل ڈالا اور کمیونزم اور امپریلزم کے باہمی تعلقات اچھے ہو گئے۔ حضرت ابراہیم نے پہلے استغفار کرنے کے سلسلے میں اپنے باپ کی بات اس امید پر مان لی کہ وہ ایمان لے آئے گا۔ لیکن جب وہ سمجھ گئے کہ کوئی فائدہ نہیں اور باپ ایمان نہیں لائے گا' تو انہوں نے اپنے باپ سے بیزاری بھی اختیار کر لی۔ ۞

۱۔ یقیناً تمہارے قرابتدار اور تمہاری اولاد روزِ قیامت کام آنے والے نہیں ہیں۔ (سورہ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۳)

انسان کی نجات اور آزادی☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصّلوۃ والسّلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ وحافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ و نبیّنا ومولانا ابی القاسم محمّد(ص) وعلی الہ الطیبین الطاھرین المعصومین.

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم

"قُلۡ یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" (۱)

☆ یہ تقریر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم بعثت کی مناسبت سے تقریباً ۱۹۷۱ء میں اصفہان میں "کانون" کے مقام پر کی گئی۔

۱۔ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک منصفانہ کلمے پر متفق ہو جائیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں، آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں۔ (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۶۴)

ہم نزولِ قرآن اور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے اس مبارک اور پرمسرت دن پر آپ سب دوستوں اور گرامی قدر مسلمانوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ اپنے موضوع پر بات شروع کریں' ہمیں آپ سے دو مختصر باتیں عرض کرنا ہیں۔ ان میں سے ایک اظہارِ افسوس ہے اور دوسری اظہارِ مسرت۔ وہ بات جو فی الجملہ افسوسناک ہے وہ یہ ہے کہ اس خطاب کا وقت کچھ اس طرح ہو گیا جو نمازِ مغرب یعنی مغرب کی نماز کا وقتِ فضیلت ہے۔ اور حق یہ ہے کہ مناسب اور پسندیدہ نہیں کہ مذہبی اجتماعات نماز کے وقت پر شروع ہوں۔ البتہ اس مسئلے کی طرف ''کانون'' کی محترم انتظامیہ پہلے ہی متوجہ تھی اور اس سلسلے میں انہیں جو مجبوری پیش آ گئی تھی وہ انہوں نے مجھ سے بیان کر دی ہے' اسکی وضاحت کی ہے اور میں نے ان کا عذر قبول کر لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ ایسی مجبوری پیش آئی ہے مجھے اس کا افسوس ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ ہمیشہ ایسے پروگرام اس طرح سے ترتیب دیئے جائیں گے کہ شعائر کی یہ تنظیم اس انتہائی بڑے شعار یعنی نماز کے وقت سے کسی صورت نہ ٹکرائے۔

تعظیمِ قرآن

البتہ جو بات میرے لئے اظہارِ مسرت کا باعث ہے اور جس پر واقعاً میں مسرور اور خوش ہوا ہوں وہ نئے نئے کام کرنے والے آپ کے شہر میں حفظِ قرآنِ مجید کے بارے میں کیا گیا کام ہے۔ یہ بہت لازم اور ضروری کام ہے۔ ہم مسلمانوں کو اور خاص طور پر ایرانی مسلمانوں کو اس بات کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ہم قرآنِ مجید کے معاملے میں واقعاً قصوروار ہیں۔ یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ' جو ہر طرح کی علمی وغیر علمی کتب حتیٰ غیر زبانوں میں لکھی گئی کتابیں تک پڑھ سکتے ہیں لیکن (حفظ تو دور کی بات ہے) اپنی مقدس آسمانی کتاب (قرآنِ کریم) نہیں پڑھ سکتے۔ جبکہ قرآنِ مجید کی دیگر خصوصیات کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت (جس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ رہی ہے) اس کی زیبائی اور فصاحت و بلاغت ہے۔ اس کی تلاوت اب آہستہ آہستہ ہمارے درمیان متروک ہو رہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ صرف عرب ممالک میں حافظِ قرآن زیادہ ہیں اور اس سلسلے میں اپنے ایرانیوں کا عذر یہ سمجھتا تھا کہ کیونکہ ہماری زبان عربی نہیں ہے' اس لئے ہم (حفظِ قرآن کے سلسلے میں) دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں لیکن اس سال میں نے ایک باخبر شخص یعنی استاد شیخ خلیل الرحمٰن سے ایک بات سنی ہے' وہ مسجدِ نبوی کے قاری ہیں۔ دراصل وہ پاکستانی ہیں اور حسینیہ ارشاد کی دعوت پر ایران آئے ہیں تاکہ قرآن' خصوصاً صحیح انداز سے قرأتِ قرآن اور تجوید قرآن سیکھنے کا شوق پیدا کیا جائے' یہ انداز ایران میں موجود نہیں ہے۔ الحمدللہ بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ بہت سے طالب علموں اور جوانوں میں شوق پیدا ہوا ہے کہ وہ قرآن کا صحیح تلفظ اور اسکی قرأت اور تجوید سیکھیں۔ انہوں نے پاکستان کے لوگوں کے بارے میں بتایا ہے (جہاں کے باشندوں کی زبان عربی نہیں ہے لیکن مسلمان' باعتقاد مومن اور قرآن سے محبت کرنے والے ہیں) کہ پاکستان میں حفظِ قرآن اور تعلیمِ قرآن کے مدارس غیر معمولی طور پر کثیر تعداد میں ہیں۔ وہ جو ایک باخبر شخص ہیں اور لاف زنی کے عادی نہیں' ان کا کہنا ہے کہ اس وقت پاکستان میں تقریباً ایک ملین افراد حافظ قرآن ہیں۔

ہم شیعہ جو ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام سے محبت پر فخر کرتے ہیں' ہمارے ہاں روایت ہے (البتہ یہ روایت اہلِ سنت کے یہاں بھی ہے اور ہمارے اور ان کے ہاں متواتر ہے) کہ رسولِ اکرم نے فرمایا:

"اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِی' لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ."

میں دو نہایت گراں قدر چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جاتا ہوں' ایک کتاب خدا ہے اور دوسری میری عترت واہلِ بیت' یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے۔

لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ قرآن کی تعظیم کی جائے اور عترت کی تحقیر کی جائے' یا عترت کی تعظیم کی جائے اور قرآن کی تحقیر کی جائے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے درد کا درماں کریں۔ ہم شایانِ شان طور پر قرآن کی تعظیم نہیں کرتے۔ خود قرآن کہتا ہے کہ رسول اللہ قیامت میں اپنی امت کے ایک گروہ

کے بارے میں شکایت کریں گے کہ:

"یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا."

"پروردگار میری اس قوم نے اس قرآن کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔"

(سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۳۰)

مجھے امید ہے کہ اس دارالایمان اور دارالعلم اصفہان (جو ایک زمانے میں واقعاً دارالعلم تھا اور مرحوم مجلسی کے بقول ہمارے زمانے میں اصفہان دارالعلم ہے اور ایک زمانے میں دارالایمان رہا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ اسی طرح اس دور میں بھی رہے گا) کے آپ جدت پسند افراد کا یہ نیا اقدام وسعت اختیار کرے گا۔ خود اس مقام پر زیادہ سے زیادہ حفاظ قرآن پیدا ہوں گے اور دوسرے مقامات پر بھی لوگ آپ سے سبق حاصل کریں گے۔

اب میں اپنے موضوع "انسان کی نجات اور آزادی" کی طرف آتا ہوں۔

میں نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا ہے؟

اس لئے کہ یہ دن (یعنی) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا دن واقعاً انسان کی آزادی اور نجات کا دن ہے۔

آزادی کا مطلب ہے انسان ایسی ہر قید و بند سے آزاد ہو جو اس کے رشد و کمال اور کمال کی طرف اس کے سفر میں حائل ہو۔ سوائے جمادات کے جنہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یعنی ایک جماد' ایک معدن' ایک طلا زمین کی گہرائیوں میں بھی اور بہت زیادہ دباؤ کے نیچے بھی وجود میں آجاتا ہے جبکہ جاندار چاہے وہ پودا ہو' حیوان ہو یا انسان اسے آزادی اور کھلی فضا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے پروان چڑھنے اور فعالیت کے لئے ضروری ہے کہ اسے کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو۔

جماد میں کیونکہ رشد و تکامل نہیں ہوتا اس لئے اسے آزادی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی جبکہ نبات' حیوان اور انسان (انفرادی و اجتماعی دونوں حوالے سے) چونکہ کمال پذیر' پھلنے پھولنے والے اور ارتقاپذیر وجود کے حامل ہیں' اس لئے ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ اور سدِراہ نہ ہو' تاکہ وہ اپنا راستہ طے کر سکیں۔

البتہ انسان اور نبات وحیوان میں ایک فرق ہے۔ نبات وحیوان کو آزادی کی ضرورت ہے۔ یعنی خارج میں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے اور دینی طلبا کی اصطلاح میں ''عدم المانع'' کافی ہے۔ ایک پھول گملے میں یا کسی باغیچے میں ہو تو رشد ونمو کے لئے' جڑیں پھیلنے کے لئے اور شاخ وبرگ نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ حیوان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ لیکن انسان کیونکہ ایک جوابدہ' ذمے دار' مختار اور آزاد وجود ہے اور ایک ایسا موجود ہے جس کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے: اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دے دی ہے' چاہے تو وہ شکر گزار بن جائے' چاہے تو کفرانِ نعمت کرنے والا۔ سورۂ انسان ۷۶۔ آیت ۳) لہٰذا خلقت و طبیعت جو کچھ نبات وحیوان کو بے مانگے دے دیتی ہے انسان کو اسے خود کسب کرنا اور وجود میں لانا ہوتا ہے۔ انسان کو خود آزادی کا طالب ہونا چاہئے۔ البتہ نبات وحیوان میں آزادی پسندی کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔

انسان کی آزادی پسندی کے معنی یہ ہیں کہ پہلے تو انسان میں سرکشی' نافرمانی اور نہ ماننے کی ایک روح ہونی چاہئے' تاکہ وہ رکاوٹوں کے خلاف جنگ کر سکے اور ان کا مقابلہ کر سکے۔

البتہ کیا اتنا ہی کافی ہے؟ نہیں؛

اگر انسانی روح فقط جھگڑالو جنگ کرنے والی اور نافرمان ہو اور اس میں کوئی اور خصوصیت نہ ہو تو وہ افراتفری اور ابتری پسند ہو کر رہ جائے گی۔ اسے اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے تسلیم' فرمانبرداری اور انضباط۔ جو نافرمانی' بغاوت اور جھگڑالو پن کی ضد ہے۔ یعنی انسان کو ایک ہی وقت میں جھگڑالو' نافرمان اور کافر (ہم نے خاص طور پر کافر کہا ہے کیونکہ یہ قرآن کی تعبیر ہے) بھی ہونا چاہئے اور مسلم مُسَلِّم' فرماں بردار اور منضبط بھی۔

آزادی کے دوار اکین

آج کے پرمسرت دن جو بعثت کا دن ہے' جب رسولِ اکرم کوہِ حرا سے اترے (اس

اضطراب اور ہیجان کی کیفیت میں، جبکہ آج پہلی مرتبہ آپ کی روح پر عظیم ترین نعمت الٰہی نازل ہوئی تھی) اور اپنی محبوب وعزیز (زوجہ) خدیجہ علیہا السلام کے پاس آئے۔ خدیجہ جو آپ کے لئے سکون اور حوصلے کا باعث تھیں، اور ان سے فرمایا: دَثِّرِینی دَثِّرِینی (مجھے ایک چادر اوڑھادیں) انہوں نے آپ کو چادر اوڑھادی۔ آپ آرام کرنا چاہتے تھے۔ وہی فرشتہ جو کوہِ حرا میں نازل ہوا تھا دوبارہ آیا (اور کہنے لگا:) یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ (سورۂ مدثر ۷۴۔ آیت ۱تا۵) اے وہ جس نے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا ہے! قیام کر! اٹھ کھڑا ہو، راحت و آرام کا وقت بیت گیا۔ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ۔

آپ نے سب سے پہلے جو صدا بلند کی وہ کیا تھی؟ قولوا لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحوا. کلمہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں (عربی ادب کی اصطلاح کے مطابق) ایک "مستثنیٰ منہ" ہے اور ایک "مستثنیٰ"۔ ایک نفی ہے اور ایک اثبات، ایک نہ ہے اور ایک ہاں، ایک سلب ہے اور ایک ایجاب، ایک فصل ہے اور ایک وصل، ایک عصیان و نافرمانی ہے اور ایک تسلیم و اطاعت۔ لیکن یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ "لا الہ الا اللہ" کوئی معبود، کوئی قابلِ پرستش اور کوئی قابلِ اطاعت نہیں، کسی موجود میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ انسان اس کے سامنے جھکے، خضوع و خشوع اور تسلیم کرے۔ اے انسان! ہر چیز کے مقابل سر اٹھا کے رکھ لیکن اللہ کے حضور سرِ تسلیم خم کر اور اس کا مطیع و فرمانبردار رہ۔

یہ ہیں آزادی کے دوارکین۔ اے انسان! کافر بن اور مومن بن۔

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی."

"دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اسکی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا ہے۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

فرماتا ہے: فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ کفر اور ایمان کو باہم دگر اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ غیر خدا اور سرکشی کے ہر مظہر سے کفر اور اللہ پر ایمان۔ اگر فقط سرکشی اور نافرمانی ہو اور کچھ

اصولوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ ہو (وہ اصول جن کا سرچشمہ خدا ہے) تو اسکا نتیجہ ہرج ومرج اور افراتفری ہے۔ لیکن اگر انسان فقط تسلیم ہو لیکن بغیر کسی عصیان ونافرمانی کے۔ یعنی میں حکمِ خدا کے سامنے بھی سرخم کرتا ہوں اور حکمِ غیر خدا کے سامنے بھی، نفس امارہ اور طاغوت وشیطان کی بات بھی مانتا ہوں، تو ایسا شخص وہ مرد حر وہ آزاد انسان نہیں جسے اسلام چاہتا ہے۔ یہ ہیں آزادی کے معنی اور یہی ہے آزادی کی طرف انسانی ضرورت کا راستہ اور یہ ہے انسان کی آزادی اور نبات وحیوان کی آزادی میں فرق۔

اسلامی آزادی

آزادی محض نعرہ اور شور وغل نہیں ہے، صرف زندہ باد اور مردہ باد نہیں ہے، فقط آزادی کا دم بھرنا نہیں ہے۔ آزادی کے کچھ اصول ومبانی ہیں۔ جب تک وہ اصول اور مبانی انسانی روح میں جاگزیں نہ ہوں، جب تک روح انسانی اور انسانی معاشرے میں وہ فارمولے اور پروگرام رو بہ عمل نہ آئیں آزادی صرف حرف اور لفظ ہے، یہ اس طرح کی آزادی ہے جس کا ڈھنڈورا فرنگی دنیا بھر میں پیٹتے ہیں۔ وہ آزادی سلب کرنے کے لئے آزادی کا نام لیتے ہیں، وہ آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن اس آزادی کے پردے میں غلامی اور بردگی ہے۔ ہم اسلامی آزادی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور کیونکہ ہمارے پاس وقت کم ہے اور ایک گھنٹے میں اس موضوع کی بقدر کافی وضاحت نہیں کی جاسکتی اس لئے ہم مختصر طور پر اپنی معروضات عرض کررہے ہیں۔

آزادی کی دو اقسام

آزادی اوّلاً دو قسم کی ہے اور جب تک انسانی معاشرے میں ہر دو طرح کی آزادیاں نہ پائی جائیں اُس وقت تک اس میں حقیقی معنی میں آزادی ہرگز وجود میں نہیں آسکتی۔ آزادی کی یہ دونوں اقسام ایک دوسرے سے وابستہ اور باہم جڑی ہوئی ہیں۔

یہ دو قسم کی آزادیاں ہیں: ایک روحانی ومعنوی آزادی اور دوسری اجتماعی آزادی۔

برٹرنڈ رسل نے کتاب ''نئی امیدیں'' میں ایک معروف بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان ہمیشہ تین چیزوں کے خلاف حالتِ جنگ میں رہا ہے' یا تین چیزیں انسان کے خلاف برسرِ پیکار رہی ہیں۔ ایک بے روح و بے جان طبیعت' سردی' گرمی' سیلاب' زلزلہ' موت' بیماری اور انہی کی مانند دیگر امور' اور دوسری چیز افرادِ بشر۔ انسان کو ہمیشہ دوسرے انسانوں اور اپنے ہم نوع افراد کی طرف سے مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے۔ انسان کو اپنے ہم نوع افراد کی طرف سے جن مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے وہ بے جان خلقت و طبیعت کی طرف سے اسے درپیش ہونے والی مزاحمتوں سے کم نہیں ہیں' بلکہ زیادہ ہیں۔ تیسری قسم وہ جنگ ہے جو انسان کو ہمیشہ اپنے نفس کے خلاف کرنا پڑتی ہے۔ البتہ وہ ایک اور مفہوم میں کہتا ہے جس کی بنیاد نفسیاتی ہے اور اس کے پیشِ نظر دوسری باتیں ہیں' لیکن اس کی اصل بات صحیح ہے۔ انسان اپنی روح اور اپنے نفس کے خلاف بھی ایک جنگ کرتا ہے۔

جس آزادی کے بارے میں ہم نے عرض کیا ہے' وہ ان دو اقسام سے مربوط ہے۔ معنوی آزادی' یعنی انسان کو اپنے اندر ایک آزاد موجود ہونا چاہئے۔ انسان نباتات کی مانند غذا حاصل کرنے' رشد و نمو کرنے اور تناسل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ حیوان کی طرح محسوس کرتا ہے' دیکھتا ہے' سونگھتا ہے اور لمس کرتا ہے۔ لیکن اس میں ایک اعلیٰ پائے کی فکر اور ارادہ بھی پایا جاتا ہے۔

کبھی کبھی انسان کی فکری آزادی خود اس کے اندر سے سلب ہو جاتی ہے۔ یعنی بعض خرافات پر اعتقاد کی وجہ سے' تعصب و جمود میں گرفتار ہو جانے کے نتیجے میں انسان کے باطن میں قوتِ عقل کے نام سے اللہ تعالیٰ نے جو فرشتہ رکھا ہے وہ اس فرشتے کی طرح جو کسی کنویں میں محبوس ہو جائے انسانی بدن میں محبوس ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کے لئے کسی مثال اور وضاحت کی ضرورت نہیں کہ مجھے کوئی مثال پیش کرنی پڑے کہ جب کوئی انسان خرافات میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کی عقل و فکر کس طرح محبوس اور قید ہو جاتی ہے' یا اگر کوئی انسان تعصب اور جمود میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسکی فکر کیسے محبوس اور اسیر ہو جاتی ہے۔ شاید یہ واضح چیزوں کی وضاحت کرنے کی مانند ہو اور ہمارے پاس اس وضاحت کے لئے وقت بھی نہیں ہے۔

روحِ انسانی میں پایا جانے والا دوسرا فرشتہ اس کا بلند عزم و ارادہ ہے۔ ارادہ شہوت سے

جدا چیز ہے۔ شہوت حیوان میں بھی ہوتی ہے اور حیوان اپنی شہوت کا اسیر ہوتا ہے لیکن انسان میں ایک اعلیٰ پائے کی صلاحیت پائی جاتی ہے جس کا نام ارادۂ انسانی یا ارادۂ اخلاقی ہے۔ ارادۂ اخلاقی کا تعلق اعلیٰ درجے کے امور سے ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاقی یا انسانی ارادے کا مطلوب حیوانی وابستگیاں نہیں' جاہ و مقام نہیں' عورت نہیں' مال و دولت اور تعیش نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد جیسے انسان کی ہدایت' بشریت کی سعادت' دوسروں کو سعادت تک پہنچانا' بھوکوں کو کھانا کھلانا وغیرہ ہیں۔ یعنی انسان کی خواہشات اور تمنائیں فردی اور شخصی حدود سے بلند تر ایک منزل ہو جاتی ہیں' انسان کی حیوانی و شہوانی وابستگیاں جتنی زیادہ ہوں گی اس کا انسانی ارادہ اتنا ہی کمزور و ناتواں ہوگا۔

پس ایسا انسان جو جہالت' خرافات' تعصبات اور جمود میں گرفتار ہو' اسے معنوی و عقلی آزادی میسر نہیں ہوتی۔ ایسا انسان جو شہوت پرست اور ہوس کا پجاری ہو اور جس کی حیوانی وابستگیاں زیادہ ہوں اسے ہرگز معنوی آزادی حاصل نہیں ہوتی' اور اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ واقعاً اس کی روح محبوس ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اس سلسلے میں کیا نفیس کلام کہے ہیں' ابھی ان کی باتوں کے بیان کا وقت نہیں آیا' فقط قرآن و حدیث سے چند جملے عرض کرتے ہیں۔

قرآن و حدیث میں معنوی آزادی

قرآن کریم ان چیزوں کو حقیقتاً قید و بند' غلامی اور بندگی قرار دیتا ہے: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (۱) کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے؟ یعنی وہ اپنی نفسانی خواہشات کا بندہ بن گیا ہے۔

میرے اپنی نفسانی خواہشات کا بندہ بن جانے سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ میری نفسانی خواہشات تو میری اپنی چیز ہیں' لہٰذا میں کسی اور کا بندہ نہیں ہوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: تمہارا اپنے آپ کو فقط یہ نفس اور نفسانی خواہشات سمجھ لینا تمہاری غلط فہمی ہے' تمہیں نہیں معلوم کہ تمہاری حقیقی و واقعی ''میں'' تمہاری اس نفسانی خواہش کی اسیر ہے۔

۱۔ سورہ جاثیہ ۴۵۔ آیت ۲۳

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب صفہ (۱) کے پاس تشریف لائے۔ آپ ان میں سے ایک سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس نے عرض کیا: یا رسولَ اللّٰہ اَقَدْعَزَفَتْ نَفْسی عَنِ الدُّنیافاَسْتَوٰیْ عِندی ذَہَبُہاوَحَجَرُہا (اے اللہ کے رسول! میری روح اس دنیا سے یکسر آزاد ہو چکی ہے (اس نے ایک اور پیرائے میں بات کی' کہا کہ میری روح بے رغبت ہو چکی ہے) اس طرح سے کہ اب اس دنیا کا پتھر اور سونا میرے لئے مساوی ہو گیا ہے۔ رسول اللہ نے اس سے فرمایا: اِذاَصِرْتَ حُرّاً (بس اب تم ایک آزاد مرد بن چکے ہو) اب میں کہہ سکتا ہوں کہ تم مرد حر ہو۔

حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

"اَلدُّنیادارُمَمَرٍّلادارُمَقَرٍّ. وَالنّاسُ فیھارَجُلانِ: رَجُلٌ باعَ نَفْسَہُ فَاَوْبَقَھاوَرَجُلٌ اِبْتاعَ نَفْسَہُ فَاَعْتَقَھا." (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۳۳)

فرماتے ہیں: یہ دنیا خرید و فروخت کا بازار ہے۔ جب انسان اس بازار میں آتا ہے تو کوئی تو خود کو بیچ کر چلا جاتا ہے اور کوئی اپنے آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں' جو وسائل میں ہے' فرمایا ہے: پانچ خصائل ایسی ہیں کہ اگر کسی انسان میں یہ خصلتیں (یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک خصلت) نہ ہوں تو وہ شخص اس قابل نہیں کہ اسکے ساتھ میل جول رکھا جائے' اسکے ساتھ نشست و برخاست رکھی جائے اور اس کے وجود سے استفادہ کیا جائے۔

یہ انتہائی قیمتی حدیث ہے: پانچ خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی انسان میں نہ پائی جائیں تو

۱۔ اصحاب صفہ چند غریب افراد تھے۔ البتہ مالی اعتبار سے فقیر اور روحانی اعتبار سے غنی تھے۔ پہلے مسجد النبی میں ہوتے تھے۔ بعد ازاں حکم آیا کہ مسجد سے باہر چلے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چبوترے کو ان کا مسکن قرار دیا' جو اب بھی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے حجرے کے شمال کی طرف ہے' وہ مقام جہاں معززین بیٹھتے ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک راستہ بھی ہے۔ رسول اکرم ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی مادی ضروریات بھی پوری کرتے تھے اور روحانی بھی۔

وہ انسان قابلِ معاشرت نہیں ہے اور اسکے وجود سے کوئی استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔

اَوَّلُهَا اَلْوَفَاءُ (پہلی خصوصیت وفا ہے)

بے وفا انسان' انسان ہی نہیں۔ اس کی انسانیت ناقص ہے۔

دوسری خصوصیت تدبیر' یعنی مدبر ہونا' غور و فکر اور معاملات میں حساب کتاب کے ساتھ چلنا ہے۔

اسلام کی نظر میں' تدبیر کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اِنّی لا اَخافُ عَلیٰ اُمّتِی الْفَقْرَ' وَلکِنْ اَخافُ عَلَیْھِمْ سوءَ التَّدبیرِ میں اپنی امت کے بارے میں اسکے کسی دن اقتصادی اعتبار سے فقر و افلاس میں مبتلا ہوجانے کی طرف سے خوفزدہ نہیں ہوں' ہاں اس جانب سے خوفزدہ ہوں کہ کسی روز میری امت تدبیر کے حوالے سے فقر کا شکار ہوجائے۔ جب اسکے پاس کوئی سوچ نہ ہو' جب کوئی منصوبہ نہ ہو' جب وہ مستقبل کو نہ دیکھ سکے اسے نہ سمجھ سکے اور اپنے لئے کوئی منصوبہ بندی نہ کرسکے۔

تیسری خصوصیت حیا ہے۔ ایسے لوگوں سے پناہ طلب کرنی چاہئے جنہوں نے حیا کا پردہ چاک کردیا ہے۔ اس وقت سے امان طلب کرنی چاہئے جب لڑکے اور لڑکیاں کسی سے حیا نہ کریں' نہ باپ سے نہ ماں سے اور نہ کسی بڑے سے۔ اس وقت سے پناہ مانگنی چاہئے جب رسائل و جرائد بچوں کو کسی ایمان کا معتقد بنائے بغیر انہیں مسلسل والدین کی نافرمانی اور سرکشی پر ابھارنے لگیں۔ اس دن سے امان مانگنی چاہئے جب حیا کو آؤٹ آف فیشن اور فرسودہ قرار دیا جانے لگے۔

چوتھی خصوصیت حسنِ خلق اور خوش اخلاقی ہے۔ مومن خوش خلق ہوتا ہے' تنک چڑھا اور ترش رو نہیں ہوتا۔ مومن میل جول اور معاشرت میں برا نہیں ہوتا۔

فرمایا: پانچویں خصلت ایسی ہے جو ان تمام خصوصیات کی جامع ہے (اور وہ خصوصیت ہے): اَلْحُرِّیَّۃ یعنی آزادمنشی اور حریتِ ضمیر۔

آج کی دنیا کی غلطی

معنوی آزادی کے حوالے سے بہت سے مسائل ہیں۔ ہم آپ سے صرف اس غلطی کے بارے میں عرض کریں گے جس کا آج کی دنیا شکار ہے (اب چاہے یہ غلطی حقیقی ہے یا بے جانے بوجھے' ہمیں نہیں معلوم) غلطی یہ ہے کہ آج کی دنیا سماجی آزادیاں مہیا کرنا چاہتی ہے لیکن معنوی غلامی پیدا کر رہی ہے۔ یعنی چاہتی ہے کہ انسان مفاد پرست' خواہشات نفسانی کا پجاری اور اپنے نفس کا غلام ہو' اس میں اخلاقی و انسانی ارادہ نہ ہو۔ اسکے باوجود اسے سماجی آزادی حاصل ہو۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ ٹیڑھا بھی رہ اور گر بھی نہیں۔ اس طرح کی چیز محال ہے۔

عدالت اور آزادی کے اپنے پروگرام میں انبیا کی کامیابی کی وجہ (یعنی وہ ایسے افراد معاشرے کے سپرد کر سکے جو واقعاً اور حقیقی معنی میں حریت پسند تھے۔ وہ ایسے انسان تھے جنہوں نے طاقت اور اقتدار ہاتھ میں آنے کے باوجود اس سے سوئے استفادہ نہیں کیا) یہ تھی کہ سب سے پہلے انہوں نے معنوی آزادی کے لئے کوشش کی۔ انسان کو اس کی اپنی نفسانی خواہشات' اس کی خرافات' اس کے تعصب و جمود' پست اور گھٹیا وابستگیوں اور اس کے حیوانی تعلقات سے آزاد کیا' اسکے بعد ایسا انسان سماجی آزادی کی اہلیت حاصل کرتا تھا۔ لیکن ایسا انسان جو روز بروز گمراہی میں غرق ہو رہا ہو اسکے لئے معاشرتی اور سماجی آزادی کا حصول محال اور ناممکن ہے۔

معنوی آزادی کے بارے میں ہماری گفتگو اسی مقام پر ختم ہوتی ہے۔

سماجی آزادی

ہم نے عرض کیا کہ سماجی اور معاشرتی آزادی یعنی قیود' پابندیوں' طرح طرح کی گھٹن' سخت گیریوں اور انسان کی اپنی ساختہ و پرداختہ رکاوٹوں سے آزادی۔ یہی وجہ ہے جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزادی انسان کے لئے خدا کی قیمتی ترین نعمت ہے' حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے کہ انسان کو حاصل نعمات اور اسکی ضروریات کے درمیان آزادی سب سے زیادہ قیمتی اور تمام دوسری

نعمتوں کی ماں ہو۔ ثقافت اور تربیتی عوامل جو مثبت عوامل ہیں (اور جنہیں مذہبی طلبا کی اصطلاح میں شرائط اعدادی کہا جاتا ہے) انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ امن وامان کی قدر وقیمت آزادی کے برابر ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ جو لوگ آزادی کی اس قدر اہمیت کے قائل ہوئے ہیں وہ اس کا حق رکھتے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جن باتوں کی وجہ سے کسی چیز کی قدر وقیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے ان میں سے ایک بات اس چیز کی کمیابی ہے۔ کیونکہ انسان کو یہ نعمت کم میسر آئی ہے' اس لئے وہ اس کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے۔

اسلام اس مسئلے کی غیر معمولی اور عجیب اہمیت کا قائل ہے۔ اپنی تقریر کے شروع میں ہم نے جو آیت پڑھی ہے اس کا مضمون یہی ہے۔ اسکے مخاطب اہلِ کتاب ہیں' البتہ ایسا نہیں ہے کہ فقط انہی کو خطاب کیا گیا ہے۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ کتاب کے لئے اپنی رسالت کا (جو سارے جہاں کے لئے ہے) یہ اعلان کیا ہے کہ:

"قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ." (۱)

اس حقیقت کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے لئے مساوی ہے۔ یعنی وہ ایسی حقیقت نہیں ہے جو صرف ہمارے لئے ہو اور ہم کہیں کہ تم ہم سے آملو' یا صرف تمہارے لئے ہو اور ہم تم سے مل جانا چاہیں' نسل اور قومیت سے تعلق رکھنے والا کوئی معاملہ نہیں ہے' جس کے متعلق ہم کہیں کہ تم ہم میں ضم ہو جاؤ' یا ہم آکر تم میں ضم ہو جائیں' (بلکہ) یہ ایسی حقیقت ہے جو سب کے ساتھ یکساں نسبت رکھتی ہے۔

یہ کیا ہے؟

۱۔ آپ کہہ دیں کہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمے پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں' اور آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں۔ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴)

یہ اللہ ہے۔ صرف اللہ کی پرستش کرو اور خدا کے سوا ہر چیز سے نافرمانی اور سرکشی کرو اور صرف اللہ کے اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور جسے خدا کے امر نے سمیٹا ہوا ہے اس کے سامنے سر جھکاؤ۔ اس کے بعد سماجی آزادی ہے: لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللهِ۔ یعنی استعمار کی نفی' دوسروں کو اپنا بندہ اور غلام بنانے اور دوسروں کا استحصال کرنے کی نفی اور اس کی نفی کہ کوئی فرد دوسرے فرد کا استحصال کرتے ہوئے اسے اپنی خدمت پر لگالے تاکہ اُس کی محنت کی کمائی کو اپنے لئے مخصوص کرلے اُس کی کسی خدمت کی غرض سے نہیں۔ یہ ہے قرآن کا پیغام۔

صدرِ اسلام کے مسلمانوں کا پیغام

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے صدر اسلام میں لڑی جانے والی آزادی بخش جنگوں میں (یعنی بنی امیہ کے برسر اقتدار آنے سے پہلے' گو کہ ان خلفا کے زمانے میں جنہیں اصطلاحاً راشدین کہا جاتا ہے امیر المومنین کے دور کے سوا مسئلۂ خلافت سے قطع نظر بھی انحرافات موجود تھے) جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ انہی جنگوں میں سے ایک جنگ میں (جو ساسانی ایران اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی) ایرانی فوج کے سپہ سالار رستم فرخزاد نے مسلمانوں کے نمائندے کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تمہارا مقصد کیا ہے' تم کیا کہتے ہو؟ پہلے تو اس نے انتہائی تجاہلانہ انداز میں ان سے کہا تھا کہ: یقیناً تم لوگ بہت بھوکے اور پیاسے تھے اور ہم نے تمہاری مدد نہیں کی' ہم تمہاری مدد کرنے کو تیار ہیں' مختصر یہ کہ ہم تمہیں ایک طرح کی رشوت دیتے ہیں' تم لوٹ جاؤ۔ (اس پر مسلمانوں کے نمائندے نے) بہت زبردست جواب دیا! کہا: واللہ ہماری حالت تو اس سے بھی کہیں بدتر تھی جو تم نے بیان کی ہے' لیکن زمانہ بدل گیا ہے' حالات تبدیل ہوگئے ہیں' وہ دن گزر گئے جب ہم اپنے شکم کے لئے روٹی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کیا کرتے تھے' اب ہم انسان کی نجات کے لئے ایک پیغام کے حامل ہیں۔

یہ سن کر رستم کو تعجب ہوا۔ کہنے لگا: تمہارا پیغام کیا ہے؟ (اب آپ قرآن کے تربیت یافتہ حضرات کو دیکھئے! ایک ہزار سال پہلے یہ بات تمام مورخین نے لکھی ہے اور واقعاً اگر یہ ایک ہزار

سال پہلے کی کتابوں میں نہ لکھی ہوئی ہوتی تو کوئی یقین نہ کرتا' سمجھتا کہ یہ بات ان لوگوں نے کہی ہے جنہوں نے حقوقِ انسانی کا چارٹر پڑھا ہے) کہا: اوّل توحید و رسالت محمدی کا اقرار' دوّم: "اخراج العباد من عبادة العباد الیٰ عبادة اللّٰہ" (یعنی) ہمارا دوسرا پیغام یہ ہے کہ ہم لوگوں کو سماجی آزادی سے ہم کنار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس لئے آئے ہیں تا کہ قید و بند میں جکڑے ہوئے طبقات اور یہ جو ایک گروہ پر دوسرا گروہ ظلم و ستم کر رہا ہے اور اس نے ان کی آزادی سلب کر رکھی ہے' اس صورتحال کا خاتمہ کریں۔ ہم آئے ہیں کہ قوموں کو حکومتوں کے مقابل آزادی دلائیں۔

قرآنِ کریم حضرت موسیٰ ابن عمران کی زبانی نقل کرتا ہے کہ: جب فرعون نے ان پر اپنا احسان جتایا اور کہا کہ تم وہی ہو جو ہمارے دامن میں پروان چڑھے۔ تو اس پر حضرت موسیٰ نے کہا: وَ تِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۲) تو ایسا شخص ہے جس نے دوسروں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ یعنی تو نے ان کی سماجی آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔

اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے خطبۂ قاصعہ میں کچھ باتیں کہی ہیں' کیونکہ یہ بیان خاصا مفصل ہے اس لئے اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اسلام میں بہت زیادہ باتیں ہیں۔ دراصل اسلام کی بنیاد ہی سماجی اور اجتماعی آزادی ہے۔ یعنی اسلام ہرگز کسی شخص کو دوسرے افراد کی آزادی سلب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کا قانون عادلانہ ہے اور اس میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ سب کو اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ تاہم قانون سے قطع نظر سب ایک دوسرے کے مقابل آزاد ہیں اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ کسی دوسرے شخص کو اپنے سامنے جھکائے اور اسے اپنا مطیع بنائے۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس حوالے سے اسلام کے پاس کیا پروگرام ہے۔

معنوی آزادی کے بارے میں اسلام کا پروگرام بہت واضح ہے۔ تمام حقیقی آسمانی ادیان ایسے ہی ہیں۔ اور بالخصوص اسلام میں وہ مسائل بہت زیادہ ہیں جو ایک طرف تو تزکیہ نفس اور عقل و فکر کو خرافات سے آزادی دلانے سے تعلق رکھتے ہیں' یعنی عقل کو تفکر کا عادی بنانا چاہتے ہیں اور دوسری

طرف عقل اور ارادے کو حیوانی تعلقات اور وابستگیوں سے آزادی دلانے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس بارے میں بھی ہم گفتگو نہیں کرتے۔صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سماجی آزادی کے حوالے سے اسلام کے اصول ومبانی کیا ہیں۔کیونکہ ہم نے عرض کیا ہے کہ آزادی فقط شور وغل اور نعرہ نہیں ہے' آزادی کے کچھ اصول ومبانی ہیں۔

سماجی غلامی کی دو جڑیں

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ سماجی غلامی واسارت کی جڑ کیا ہے؟

سماجی غلامی کی ہمیشہ دو جڑیں ہوتی ہیں۔ایک جڑ اس شخص کے اندر ہوتی ہے جو آزادی سلب کرنے والا ہے اور جو غلامی کو وجود میں لاتا ہے' اور دوسری جڑ اس شخص کے اندر ہوتی ہے جو ذلت اور غلامی کو قبول کرتا ہے۔اسلام نے دونوں ہی عوامل کے خلاف جنگ کی ہے۔

البتہ اس کی ایک جڑ اور ہے' جو خود معاشرہ اور معاشرتی قوانین ہیں۔یعنی طاقت اور دولت کا ارتکاز۔اسلام نے اسکے خلاف بھی جنگ کی ہے۔لیکن وہ جنگ جو اسلام مفاد پرستی کے خلاف کرتا ہے' اس مفاد پرست شخص کے حوالے سے (یہ بھی ادیان کی خصوصیات میں سے ہے اور ادیان کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتی) یہ ہے کہ وہ مفاد پرست شخص کے اندر سے اسکی مفاد پرستی کو روکتا ہے۔دین میں توبہ کروانے کی قوت چھپی ہوئی ہے۔دین میں ایک ایسا انسان پیدا کرنے کی قوت پوشیدہ ہے جو اپنی زندگی کو معاشرے کی خدمت کرتے ہوئے گزار دے۔آپ دنیا میں ایسے کتنے ہی افراد کو دیکھتے ہیں جنہیں مواقع میسر آئے (اور وہ ظلم وستم کے مرتکب ہوئے) اور پھر بغیر اس کے کہ طاقت سے انہیں بدلا جائے انہوں نے خود ایک روحانی طاقت اور معنوی جذبے کے تحت توبہ کر لی اور خود بخود گمراہی چھوڑ کر واپس پلٹ آئے۔

ظالم اور مظلوم کے لئے اسلام کا حکم

جو بات اہم ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام صرف ظالم سے نہیں کہتا کہ ظلم نہ کر۔اسلام ظالم کو ظلم

سے منع کرتا ہے اور پچاس فیصد سے زیادہ ظالم سے مخاطب ہو کر ظلم کی روک تھام کرتا ہے۔ انسانی وجود پر حاکم وہ معنوی قوت جو اسے ظلم سے روکتی ہے۔ آپ جو اس جگہ تشریف فرما ہیں اور آپ جیسے دیگر ہزاروں' لاکھوں افراد ہیں جن کے پاس اس بات کا امکان موجود ہوتا ہے کہ وہ ظلم' چوری اور زیادتی کریں' لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک حکم آ کے ان کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔

لیکن کیا اسلام نے صرف اسی پر اکتفا کیا ہے؟ کیا اسلام نے آ کر فقط ظالم سے کہا ہے کہ: اے ظالم! ظلم نہ کر؟ کیا تمام کے تمام ظالم اس فرمان پر کان دھرتے ہیں؟ بہت سے ظالم ایسے بھی ہیں جو نہیں سنتے۔ پس پھر اسلام کیا کرتا ہے؟ وہ ظلم قبول کرنے کی بنیاد کو بھی ختم کرتا ہے۔ وہ مظلوم سے کہتا ہے: اے مظلوم! ظلم کو قبول کرنا بھی ایک طرح کا ظلم ہے' ظالم کے خلاف سر اٹھاؤ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (سورۂ نساء۴۔ آیت ۱۴۸) قرآن کہتا ہے: کسی مسلمان کی پیٹ پیچھے اس کی برائی کرنا بری بات ہے۔ اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ انسان چیخ چلا کر برائی بیان کرے اور گالم گلوچ پر اتر آئے۔ لیکن یہی برائی ایک موقع پر جائز ہو جاتی ہے۔ یعنی جب تجھ پر ظلم کیا جائے تو برا کہہ' چیخ پکار مچا اور ظلم کے خلاف آواز بلند کر۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: فَوَاللّٰهِ مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِي عُقْرِ دَارِهِمْ اِلَّا ذَلُّوا (خدا کی قسم جن افراد قوم پر ان کے گھروں کی حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۷) پھر آپ فرماتے ہیں: لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ الذَّلِيْلُ وَلَا يُدْرَكُ الْحَقُّ اِلَّا بِالْجِدِّ (ذلیل آدمی ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام نہیں کر سکتا اور حق بغیر کوشش کے نہیں ملتا۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۹)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک جملہ ہے۔ یہ جملہ نہج البلاغہ میں موجود ہے' جو تیرہ سو سال سے زائد پرانا امیر المومنین کا کلام ہے اور جسے سید رضی نے جمع کیا ہے اور اسکی تدوین کو بھی ایک ہزار سال گزر گئے ہیں۔ یہی جملہ ایک ہزار سال پہلے لکھی جانے والی شیخ کلینی کی کتاب اصول کافی میں بھی موجود ہے۔ اگر آپ کو ایسا جملہ سترھویں' اٹھارویں' انیسویں اور بیسویں صدی

کے آزادی پسند فلسفیوں کے ہاں' اس دور سے جب حریت پسندی اور حریت پسندی کے فلسفے نے رواج پایا' جان لاک اور اسٹوارٹ میل سے لے کر دوسروں تک کے ہاں مل جائے تو بتایئے گا تاکہ میں اس سلسلے میں آپ کی بات مان لوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام جو فرمان لکھا ہے' اور جس کے مخاطب مالک اشتر ہیں (اس میں ان کے نام مصر کی گورنری کا فرمان ہے اور ان کے لئے دستورِ عمل بھی دیا گیا ہے) کہتے ہیں: مالک! لوگوں کو آزادی دینا' لوگوں کو تنقید واعتراض کا حق دینا' لوگوں کو سلامتی مہیا کرنا کہ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ جملہ سنا ہے' یعنی یہ ان جملوں میں سے ہے جنہیں رسول اللہ نے بار ہا ارشاد فرمایا ہے(۱):

"لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ حَتّیٰ یُؤْخَذَ لِلضَّعِیفِ فیھا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِیِّ غَیْرَ مُتَعْتَعٍ." (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳' معمولی فرق کے ساتھ)

ہرگز کوئی امت' ملت' گروہ' جمعیت مقامِ تقدس تک نہیں پہنچ سکتی (یعنی وہ مقام جہاں کسی ملت کی تقدیس وتمجید کی جائے' مقامِ افتخار) جب تک اس ملت میں بات یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ کمزور طاقتور کے مقابلے میں کھڑا ہو اور بے خوف اور بلاجھجک اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے۔

یہ جملہ نہج البلاغہ میں بھی ہے اور اصولِ کافی میں بھی۔ مضمون کی صحت کے اعتبار سے نہج البلاغہ ہماری معتبر ترین کتابوں میں سے ہے اور سند کی صحت کے لحاظ سے اصولِ کافی معتبر ترین ہے۔ پس یہ جملہ مضمون کی صحت اور سند کی درستی' دونوں لحاظ سے رسولِ اکرم سے ہم تک پہنچنے والے صحیح ترین جملوں میں سے ہے۔

اس سلسلے میں اسلام فقط اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ صرف ظالم سے کہے کہ وہ ظلم نہ کرے' اور

۱۔ یہ خود اس بات کو ایک اور اہمیت دیتا ہے۔ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی جملہ صرف ایک مرتبہ فرمایا ہے' لیکن ہمارے پاس بعض ایسے جملے بھی ہیں جو رسول اللہ نے بار ہا مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے ہیں' جیسے وہ حدیث جسے ہم نے اپنی اس گفتگو کی ابتدا میں پڑھا ہے: اِنّي تارِکٌ فیکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتي۔ یہ بات رسول اللہ نے صرف ایک مقام پر نہیں' بلکہ مختلف مواقع پر فرمائی ہے۔

اس پر بھی اکتفا نہیں کرتا کہ فقط مظلوم سے کہے کہ جاؤ اور طاقتور سے اپنا حق وصول کرو۔ یعنی صرف (تسلیم واطاعت یا) نافرمانی وسرکشی پیدا نہیں کرتا۔ اخلاق اور وعظ کی قوت سے ظالم کو جھکاتا ہے حق اور حقوق کی قوت سے مظلوم کی تقویت کرتا ہے۔ یعنی ظالم کو درسِ اخلاق دیتا ہے اُسے موعظہ کرتا ہے اور وعظ ونصیحت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جبکہ مظلوم کو وعظ نہیں کرتا بلکہ اسکے اندر اسکے حق کا احساس جگاتا ہے اسے جوش دلاتا ہے اور اس سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اٹھ کھڑا ہو قیام کر اور اپنا حق حاصل کر تجھے اپنا حق حاصل کرنا چاہئے۔

حق لینے والی چیز بھی ہے اور دینے والی چیز بھی

ہم نے عرض کیا کہ اسلام کہتا ہے کہ حق کو حاصل کرنا چاہئے۔ یقیناً آپ کے ذہن میں یہ جملہ آیا ہوگا کہ حق حاصل کیا جاتا ہے دیا نہیں جاتا۔ اسلام کی منطق کی رو سے یہ جملہ جھوٹ ہے۔ یہ جملہ ایسے لوگوں نے کہا ہے جن کی طاقت فقط اس حد تک محدود ہے کہ وہ مظلوم طبقے کو ظالم طبقے کے خلاف برانگیختہ کریں لیکن وہ یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ظالم کو آمادہ کریں کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ظلم سے ہاتھ کھینچ لے۔ لہٰذا انہوں نے کہا ہے کہ حق دینے والی چیز نہیں ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ حق دینے والی چیز بھی ہے اور لینے والی چیز بھی۔ پہلے درجے پر وہ کہتا ہے کہ حق دینے والی چیز ہے۔ وعظ ونصیحت کے ذریعے ظالم سے کہتا ہے کہ حق ادا کرے اس طرح سے وہ پچاس فیصد یا اس سے زیادہ (مواقع پر حق) لے لیتا ہے۔ اور جس موقع پر ظالم حق نہیں دیتا اس موقع پر مظلوم سے کہتا ہے: (اپنا حق) لے لے اور مظلوم طاقت کے ذریعے (اپنا حق) لے لیتا ہے۔ پس اسلام کی نظر میں حق لینے والی چیز بھی ہے اور دینے والی چیز بھی۔

یہی وجہ ہے جو ہم آج کے دن کو انسان کے لئے یومِ نجات اور یومِ آزادی کہتے ہیں۔ مراد عالمِ طبیعت سے نجات نہیں ہے اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ نہ ہی بیماریوں سے نجات ہے۔ البتہ غیر مستقیم (indirect) طور پر یہ دن بیماری سے بھی نجات کا دن ہے۔ جب اسلام انسان کو خرافات اور جہالت سے نجات دلاتا ہے تو وہ علم کی طرف جاتا ہے جب وہ علم کا رخ کرتا ہے تو علمِ طب اور

میڈیکل سائنس قوت اور وسعت حاصل کرتی ہے۔ میڈیکل سائنس ترقی کرتی ہے تو بیماری بھی ختم ہوجاتی ہے۔ سیلاب کا بھی یہی حال ہے۔ شاید رفتہ رفتہ زلزلے کے بارے میں بھی یہی کچھ ہوجائے۔ یہی حال (انسانی زندگی میں حائل) دیگر رکاوٹوں کا ہے۔ البتہ یہ غیر مستقیم تاثیر ہے۔

یہ دن کس شخص اور کس چیز سے انسان کی نجات اور آزادی کا دن ہے؟

یہ اس قید و بند اور ان پابندیوں سے انسان کی نجات و آزادی کا دن ہے جو خود انسان اپنی طرف سے اپنے لئے پیدا کرتا ہے۔ نیز اس قید و بند اور ان پابندیوں سے جو بعض افراد کی طرف سے دیگر افراد کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔

اگر آپ ان کا صحیح صحیح جائزہ لیں، تو دیکھیں گے کہ اسلام نے انسانی آزادی اور آزادیٔ بشر کے سلسلے میں جو تحریک برپا کی اور وہ تحریک جیسی موثر ثابت ہوئی اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ چند جملے دعا کے عرض کریں گے۔

و صلّی اللّٰہ علی محمّد و الہ الطاھرین.

نسئلک اللّھم و ندعوک باسمک العظیم الاعظم الاعزّ الاجلّ الاکرم یااللّٰہ . . .

یااللہ! ہمیں اسلام کے حقائق سے آشنا فرما۔ ہمیں اسلام اور قرآن کا قدردان قرار دے۔

خدایا! ایسے مذہبی و اسلامی مراکز اور ایسے اداروں کی اپنے لطف سے تائید و تقویت فرما۔ ہم سب کو ایسے مراکز کا قدردان قرار دے۔ ہمیں توفیق دے کہ پہلے سے بڑھ کر ایسے مراکز قائم کریں اور ایسے مراکز کی تقویت و تائید کے لئے کوشش کریں۔

خدایا! ہم تجھے تیرے مقربانِ درگاہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ ہم سب کو توفیقِ عمل اور خلوصِ نیت عطا فرما۔ مسلمانوں کو اس تفرقے اور اختلاف سے نجات دے۔ ہم سب کے مرحومین کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

رحم اللّٰہ من قرأ الفاتحۃ مع الصلوات

✿✿

تاریخی تغیرات میں دین کا کردار☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمدللّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصّلوۃ والسّلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ وحافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ و نبیّنا ومولانا ابی القاسم محمّد(ص) وعلی الہ الطیبین الطاھرین المعصومین.

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ۔"(۱)

درسہائے تاریخ میں ایک اہم ترین مسئلہ تاریخی تغیرات میں دین اور دین کو لے کر آنے

☆ یہ خطاب ۷ محرم کی شب ۱۹۷۳ء میں مسجد امیرالمومنین تہران میں کیا گیا تھا۔

۱۔ اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مراعات یافتہ لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہم تمہارے پیغام کا انکار کرنے والے ہیں۔ (سورہ سبا ۳۴۔ آیت ۳۴)

والوں کا کردار ہے۔ آج اجمالی طور پر اس بات کو ثابت شدہ شمار کیا جاتا ہے کہ دین و مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تاریخ۔ یعنی جہاں کہیں انسان اور انسانی زندگی کا کوئی سراغ ملتا ہے' وہیں دین و مذہب بھی نظر آتا ہے۔ تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی ایسا کوئی معاشرہ نہیں مل سکتا جہاں دین کا یکسر وجود ہی نہ ہو اور جس میں دینی رسوم کے عنوان سے کسی بھی شکل و صورت کے ایسے مراسم کا وجود نہ ہو جو تقدس و پرستش کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔

کیا ابتدا میں توحیدی ادیان تھے بعد میں حق پرستی اور خدا پرستی سے ایک انحراف کی صورت میں انحرافی پرستشیں اور بت پرستیاں پیدا ہوئی ہیں؟

اولیائے دین کی تعلیم کے مطابق جس وقت سے روئے زمین پر انسان نے قدم رکھا ہے خدائے متعال نے (اسکے لئے) حجت کو بھیجا ہے۔ دوسری طرف انسان کی اصل فطرت' فطرتِ توحیدی ہے اور دیگر عبادتیں حق پرستی اور خدا پرستی کی انحرافی اور مسخ شدہ شکلیں ہیں۔ یا جیسا کہ دوسروں نے کہا ہے' ابتدا ہی سے خدا پرستی اور یگانہ پرستی کا وجود نہ تھا۔ پہلے طبیعت (Nature) پرستی' اسکے بعد مذہب پرستی' روح پرستی اور ان جیسی چیزیں تھیں اور بعد میں یہ یگانہ پرستی پر منتج ہوئیں؟

فی الحال ہم اس بحث میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ جو چیز قطعی ہے وہ یہ ہے کہ عمومی معنی میں دین ہمیشہ انسان کے ساتھ رہا ہے۔ لہٰذا لازماً یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ طول تاریخ میں انسانی زندگی میں آنے والے تغیرات میں دین نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ کیا اس کا کردار قائدانہ' مصلحانہ' اور آگے لے جانے والا رہا ہے' یا روکنے والا اور جمود اور ٹھہراؤ پیدا کرنے والا رہا ہے؟

کم از کم بزرگ انبیا کے بارے میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تاریخی تغیرات میں ان انبیا کا کیا کردار تھا؟

اس موضوع پر گفتگو کے لئے ہمیں اس مقام پر تین اور موضوعات پر بات کرنا ہوگی' تاکہ وہ اس گفتگو کے لئے مقدمہ بن سکے۔

انسان کی معاشرتی زندگی میں کمال وارتقا

اس سلسلے کی ایک تمہیدی گفتگو یہ ہے کہ انسان جو اجتماعی زندگی کا حامل ہے اور اس اجتماعی زندگی کے نتیجے میں تہذیب وثقافت کو وجود میں لایا ہے' وہ ایک حال پر باقی نہیں رہا اور کہیں ٹھہرا نہیں۔ اسی طرح جیسے وہ انفرادی زندگی میں ضعف اور کمزوری سے آغاز کرتا ہے اور پھر کمال تک پہنچتا ہے' اجتماعی زندگی میں بھی پہلے وہ ضعف وتوحش اور بربریت کے دور میں رہا ہے' اور اسکے بعد قدم بقدم کمال کی طرف بڑھا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

حیوان کیوں انسان کی طرح نہیں ہیں کہ وہ بھی قدم بقدم آگے بڑھیں یا انسان حیوانات کی طرح کیوں نہیں ہے کہ اپنی پوری طویل تاریخ میں ایک ہی جیسی اجتماعی زندگی پر باقی رہا ہو؟

دیکھئے' انسانی تاریخ وسائلِ زندگی کے اعتبار سے پتھر سے پہلے کے زمانے' پتھر کے زمانے' لوہے کے زمانے اور ایٹم کے زمانے وغیرہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن یہ ادوار حیوانات کی زندگی میں (یہاں تک کہ اجتماعی حیوانات مثلاً شہد کی مکھی اور چیونٹی کی زندگی میں بھی) وجود نہیں رکھتے۔

اقتصادی روابط کے اعتبار سے انسانی زندگی کو اشتراک اولیہ' جاگیرداری کے زمانے' سرمایہ داری کے زمانے اور بورژوائی کے زمانے وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن حیوانات میں اس قسم کے ادوار نہیں ہیں۔ ان کا جو نظام آج ہے ہمیشہ سے یہی ہے۔ سیاسی نظاموں کے لحاظ سے بھی انسانی زندگی کی مختلف شکلیں رہی ہیں' اور آج بھی ہیں۔ طرح طرح کے اندازِ حکومت استبدادی حکومتیں' آئینی بادشاہت' غیر آئینی بادشاہی' جمہوریت وغیرہ۔ جبکہ اجتماعی حیوانات کی زندگی میں اول تا آخر ایک سے زیادہ طرزِ حکومت نہیں پائے جاتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے اور کیا وجہ ہے کہ انسان ایک مقام پر ٹھہرا نہیں رہتا اور حیوانات ٹھہرے رہتے ہیں؟

انسانی تہذیب وثقافت کا نقل وانتقال

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن ایک جگہ پر ٹھہری ہوئی نہیں' اس میں نقل وانتقال

کا عمل جاری رہتا ہے۔ تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان چند ہزار برسوں میں' کہ جب سے انسان ایک تہذیب کی تشکیل اور تمدن کی ایجاد میں کامیاب ہوا ہے ہر سو سال' دو سو سال' پانچ سو سال یا ہزار سال میں کسی ایک خطۂ زمین یعنی انسانوں کی کسی ایک نسل' انسانوں کے کسی ایک گروہ یا کسی ایک قوم نے انسانی تہذیب و تمدن کی مشعل بلند کی ہے۔ بعد ازاں (جس طرح سورج کچھ مدت تک ایک مقام پر رہ کر غروب ہو جاتا ہے' جہاں دن تھا وہاں رات ہو جاتی ہے اور کسی دوسرے مقام پر دن ہو جاتا ہے) رفتہ رفتہ یہ تہذیب و تمدن بھی اس مقام پر غروب ہو کر کسی دوسرے مقام پر طلوع ہوتی ہے۔ پھر وہاں بھی دو سو سال' پانچ سو سال' ہزار سال رہنے کے بعد غروب ہو کر کہیں اور طلوع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے قوموں کا عروج و زوال ہوتا رہتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ہر قوم کا ایک عروج ہوتا ہے اور اسکے بعد اسکی تہذیب و تمدن کے انحطاط کی نوبت آ جاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کسی وقت میں چین دنیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ ایک دور میں مصر' ایک دور میں ایران' ایک زمانے میں بابل تھا اور کسی اور دور میں کوئی اور سرزمین۔ ہمارے قریب کے زمانوں میں ایک وقت میں بغداد اسلامی تہذیب کا مرکز تھا اور ایک وقت اندلس کو یہ حیثیت حاصل تھی۔ اسلامی دور میں ایک عرصے تک مصر (اسلامی دنیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز) رہا ہے۔ خود ہمارا ایران بھی اسلامی دور میں ایک مدت تک مرکز رہا ہے۔ آج کل یورپ اور امریکہ دنیا کی تہذیب و تمدن کے مرکز ہیں۔

لیکن ذرا آپ اجتماعی حیوانات' مثلاً چیونٹی اور شہد کی مکھی کی زندگی میں جھانک کر دیکھیں' وہاں ایسی کوئی بات نہیں ملتی۔ کوئی نہیں کہتا کہ کسی زمانے میں شہد کی مکھی کی تہذیب ایران میں رہی ہے' کسی زمانے میں چین میں رہی ہے' ایک زمانہ تھا جب مصر میں رہی ہے' ایک زمانے میں ہندوستان میں رہی ہے' ایک دور میں یورپ میں رہی ہے' ایک زمانے میں امریکہ میں رہی ہے اور اب آج کل دنیا کے فلاں علاقے میں ہے۔ بلکہ شہد کی مکھی کی تہذیب دنیا کے جس خطے میں بھی رہی ہے ایک جیسی رہی ہے' اس میں عروج و زوال نہیں ہے۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں تنازع

تیسرا مسئلہ' جو ایک اہم مسئلہ ہے' وہ یہ ہے کہ آخر وہ کیا سبب ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کی اجتماعی زندگی میں مختلف صورتوں میں (جن میں سے ایک جنگ اور خونریزی کی شکل ہے) ہمیشہ تضاد' کشمکش' تصادم اور تنازعات موجود رہے ہیں اور اب بھی وجود رکھتے ہیں؟ کیا کوئی دن ایسا بھی آیا ہے جب دنیا میں کسی مقام پر کوئی کشمکش بلکہ جنگ اور خونریزی نہ ہوئی ہو؟ نہیں۔

قدیم زمانے میں ہر علاقے کو فقط اپنی خبر ہوتی تھی' دیگر علاقوں میں کیا ہو رہا ہے' اس سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ اگر پتا چلتا بھی تھا تو مدتوں بعد۔ مثلاً اگر مصر میں کوئی جنگ ہوتی تو ایران کے لوگوں کو اسکی کچھ خبر نہ ہوتی۔ ممکن تھا کہ ہزار ہا انسان مارے جائیں اور انہیں (باہر والوں کو) آخر عمر تک اسکا پتا نہ چلے۔ اسلامی اندلس پر عیسائیوں نے بڑے ظالمانہ طریقے سے قبضہ کیا۔ مسلمانوں کا ایسا قتلِ عام کیا! مسلمان جو ان کے ولی نعمت تھے (کیونکہ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ مسلمانوں کی وجہ سے تھا) ان کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا کہ گستاولبون فرانسیسی جو اپنے علاقے کے اعتبار سے عیسائی تھا (مجھے نہیں معلوم کہ وہ اعتقاداً بھی عیسائی تھا یا نہیں) کہتا ہے کہ دنیا میں ایسے ظلم کی مثال نہیں ملتی۔ یعنی مشرق میں منگولوں نے جو ظلم کیا وہ اندلس میں عیسائیوں کے ظلم کے مقابل کچھ بھی نہیں ہے' اور واقعاً ہے بھی ایسا۔ انہوں نے ایسی قساوت کے ساتھ قتلِ عام کیا کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا انسان اس قدر سنگدل بھی ہو سکتا ہے؟

وہ (اندلس کے) لوگ مسلمان تھے' عالمِ اسلام کا مشرقی حصہ اور خود ہم ایران بھی مسلمان تھے یہ صفوی عہد سے پہلے تقریباً تیموری عہد تھا' اسلام کے مشرقی حصے کی تاریخوں میں یکسر یہ چیز نظر نہیں آتی کہ ایسا کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رابطے کے ذرائع نہ تھے۔ البتہ غفلت اور سوئے ہوئے ہونا الگ مسئلہ ہے اور رابطے کے ذرائع کا نہ ہونا دوسرا معاملہ۔ (ایسے دور میں) جو لوگ دنیا کے دیگر خطوں میں زندگی گزار رہے ہوتے تھے' وہ کہتے تھے کہ دنیا میں امن و

امان ہے۔ لیکن آج باہمی رابطے کے ذرائع کم از کم انسانوں کو اس امر سے آگاہ کررہے ہیں کہ کوئی ایسا دن نہیں گزرتا جب انسانوں کے درمیان المناک خونریزیاں نہ ہوتی ہوں اور دنیا میں متعدد مقامات میدانِ جنگ نہ بنتے ہوں۔ اس قسم کی کشمکشیں ہمیشہ انسانوں کے مابین موجود رہی ہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کرنے اور انسان کو زمین پر بھیجنے کا ارادہ کیا' تو فرشتوں کو اسکی اطلاع دی: وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰) تو فرشتوں نے اسی تضاد اور تنازع کی طرف اشارہ کیا تھا جو انسانی زندگی کا ایک قاعدہ ہے (اب چاہے انہوں نے اسے انسانی سرشت میں دیکھ کر کہا ہو' یا اس وجہ سے کہا ہو کہ اس سے پہلے زمین پر دوسرے انسان زندگی بسر کرتے تھے اور فرشتے ان سے واقف تھے) انہوں نے تعجب کے ساتھ' سوال کی صورت میں اور شاید مخالفت کرتے ہوئے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰)

خدایا! ہمیں ایسی مخلوق کی ضرورت نہیں جو فسادی' فتنہ گر اور خونریزی کرنے والی ہے۔

یہ مخلوق کس کا خون بہاتی ہے؟

خود اپنا خون بہاتی ہے' فرشتوں کا تو خون نہیں بہاتی۔ ایک ایسا موجود جس کے وجود پر تضاد' تنازع' کشمکش اور خونریزی کے سوا کوئی اور چیز چھائی ہوئی نہیں۔ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (جبکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں)

خدایا! اگر تو کوئی مخلوق پیدا کرنا ہی چاہتا ہے' تو ہمارے جیسی مخلوق پیدا کر کہ ہمارے درمیان نہ کوئی جنگ ہے اور نہ تنازع' نہ اختلاف ہے اور نہ بحث اور نہ تو تکار' ہم سب آرام کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔

(اس پر) اللہ نے انہیں کیا جواب دیا؟

اللہ نے سادہ سے الفاظ میں فرشتوں کو یہ جواب دیا کہ: تمہاری عقل میں یہ بات نہیں

آ سکتی۔ تمہیں ایک چیز نظر آ رہی ہے سب کچھ نہیں۔ تم اس کے تضاد' تنازع' کشمکش' فساد اور خونریزی کو دیکھ رہے ہو' لیکن ایک اور چیز جسے تمہیں دیکھنا چاہیے وہ نہیں دیکھ رہے۔ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (فرمایا: میں وہ جانتا ہوں' جو تم نہیں جانتے ہو۔ سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰)

بعد میں اللہ نے ابوالبشر کا ایک امتحان لے کر فرشتوں پر ثابت کر دیا کہ یہی تنازع' تضاد' کشمکش اور خونریزی کرنے والا موجود اس مقام تک پہنچ سکتا ہے کہ تم فرشتے اس کے حضور سجدہ ریز ہوں۔

(یہی تنازع و تضاد) ہمیشہ انسانی زندگی کا ایک قاعدہ رہا ہے۔

کیا کوئی ایسا زمانہ بھی آئے گا جب انسان اس سطح تک آ پہنچے گا کہ پھر اس کے درمیان تنازع' کشمکش اور تضاد نہ رہے؟

کیا کوئی ایسا زمانہ ہے یا نہیں؟

وہ لوگ جو فلسفۂ تضاد کو بنیادی ترین فلسفوں میں سے قرار دیتے ہیں اور اسے انسانی معاشرے کی قوت محرکہ سمجھتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز اشتراک سے کیا تھا' اور وہ ایک ایسی سطح تک جا پہنچے گا جہاں تضادات یکسر ختم ہو جائیں گے۔

اب اگر (ان کے قول کے مطابق) دنیا اقتصادی لحاظ سے ایک مساوات اور ایک ایسی اجتماعی اشتراکی زندگی تک جا پہنچے گی جس میں ہر طرف مساوات کا دور دورہ ہو گا' تو کیا ان کے فلسفے کے مطابق یہ بشریت کی موت نہ ہو گی؟ کیونکہ اس طرح تو تحرک کا عامل ہی ختم ہو جائے گا۔

وہ کہتے ہیں کہ تضاد تحرک کا سبب ہے' جب تضاد ختم ہو گیا تو تحرک بھی ختم ہو جائے گا۔ تحرک کا سبب نہ ہو گا تو سکون ہو گا اور سکون ان کے بقول انسانی زندگی کے لیے موت ہے۔

قرآن کی نظر میں انسان کا مستقبل

قرآنِ مجید نے جس بات کو کلی طور پر بیان کیا ہے اور شیعہ مذہب میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' اس کی بنیاد پر بھی بات یہی ہے۔ یعنی انسان کا مستقبل ایک ایسا مستقبل ہے

جس میں درندے آپس میں امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔قرآن کہتا ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (اورہم نے ذکر کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔سورۂ انبیا۲۱۔آیت ۱۰۵)

ہم نے کتاب زبور میں اس بات کا ذکر کیا ہے (یعنی یہاں پھر اس کا ذکر کر رہے ہیں) کہ یہ زمین جس میں اب بھی متقی پاکباز افراد اور ناپاکیزہ لوگوں کے درمیان کشمکش جاری ہے (حق و باطل کی جنگ، وہ جنگ جسے قرآن حق وباطل کی جنگ قرار دیتا ہے) حق وباطل کی اس جنگ میں کامیابی اہلِ حق کو نصیب ہوگی اور وہ زمین کے مطلق وارث ہو جائیں گے ساری زمین حق پرستوں کے تصرف میں آجائے گی۔اور اہلِ باطل کا کوئی کردار نہ ہوگا: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (بلکہ ہم تو حق کو باطل کے سر پر دے مارتے ہیں، اور اس کا سر کچل دیتے ہیں، اور وہ مٹ جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی ہو کہ تم ایسی بے ربط باتیں بیان کر رہے ہو۔سورۂ انبیا۲۱۔آیت ۱۸)

قرآن حق وباطل کی جنگ کا اعتراف کرتا ہے لیکن حق کی قوتوں کو کامیاب قرار دیتا ہے اور آخر کار حق کامیاب ہوگا اور باطل ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائے گا۔

اس معاشرے میں، جو آئیڈیل اسلامی معاشرہ ہے (اس میں یہ تصور) حقیقت کا روپ دھارے گا۔یعنی حضرت ولی عصر (عج اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی حکومت میں يَصْطَلِحُ فِي مُلْكِهِ السِّبَاعُ وَالْبَهَائِمُ شیر اور بکری ایک گھاٹ سے پانی پئیں گے۔بھیڑیا اور بھیڑ بھی آپس میں آشتی سے رہیں گے۔یہ شاید انسانوں کے سباع اور بہائم کے لئے کنایہ ہے۔یعنی بھیڑیا صفت انسان، اپنی اس صفت سے محروم ہو جائیں گے اور بھیڑ کے اندر سے بھی بھیڑ کی خاصیت ختم ہو جائے گی۔یہ مستقبل سے متعلق باتیں ہیں۔

دنیا کے آغاز سے اب تک، انسانی زندگی کے اندر یہ تضاد، کشمکش اور تنازع موجود ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا حقیقی دستور یہی ہے اور انسان جب تک روئے

زمین پر رہے گا ایسا ہی رہے گا' اور تنازع کے علاوہ کوئی اور قاعدہ روحِ بشر پر حکم فرما نہیں ہوگا۔ حتیٰ تعاون کو بھی یہ لوگ تنازع کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ رفاقتوں' تعاونوں' صلحوں' آشتیوں' محبتوں ان سب کو غیر اصیل سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنگ' تنازع اور ایک دوسرے کی حق تلفی' انسانی زندگی کا قاعدہ ہے۔ تو پھر وہ صلحیں' محبتیں اور رفاقتیں کیا ہیں؟ ہم جو ایک گروہ کے بارے میں دوستی' رفاقت' مدد اور تعاون کا احساس رکھتے ہیں (یہ کیا ہے؟) وہ کہتے ہیں: یہ بھی جنگوں کے خوف کی وجہ سے ہے۔ انسان ہمیشہ بڑے دشمن کے خوف سے اپنے چھوٹے دشمن کا رفیق اور دوست بن جاتا ہے لیکن اس دوستی کو مدِ مقابل دشمنی (Antithesis) نے وجود بخشا ہے۔ دوستوں کے مقابل بڑا دشمن نہ ہو تو فوراً دوستیاں دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ دوستیاں ہمیشہ دشمنیوں کی پیداوار ہوتی ہیں' صلحیں جنگوں کا نتیجہ ہوتی ہیں' رفاقتیں دشمنیوں کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی میں تنازع اصل ہے۔

تضادات اور جنگوں کی ماہیت

بہرحال' انسانی زندگی میں ہمیشہ تضاد' تنازع اور کشمکش کا وجود رہا ہے۔ یہاں تک بات درست ہے' مانی ہوئی بات یہی ہے۔ اس تضاد کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جنگ کس کس کے مابین ہے؟ یہ جنگ کون کون سے گروہوں کے درمیان ہے؟ کیا افرادِ بشر کے درمیان موجود جنگیں اور تضادات ایک ہی جیسے ہیں' یا ان تضادات اور جنگوں کی مختلف اقسام ہیں؟ اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان تضادات اور جنگوں کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جنگیں کس مقصد کے لئے ہیں؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ تمام جنگیں مفادات کے لئے ہیں۔ مفادات کے سوا انسانی زندگی پر کسی اور چیز کا غلبہ نہیں ہے۔ اگر مفادات کے سوا کسی اور چیز کو عنوان قرار دیا جائے تو یہ مفادات کے اوپر پردہ ہوگا۔ تضادات اور جنگوں کی روح مفادات ہیں۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے: کل من فی الوجود یطلب صیداً ـــ (۱) آپ دیکھتے ہیں کہ (انسان نے) ایسے مسائل کو جو اپنی

۱۔ اس مقام پر کیسٹ میں خرابی ہے۔

ماہیت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں دام اور جال قرار دیا ہے۔ اب اس کے بقول کوئی مذہب کو دام بناتا ہے' کوئی قومیت کو اور کوئی اخلاق کو۔ یہ سب دام ہیں۔ انسان کی اصل یہ ہے کہ وہ شکاری ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ حضرت ابوذر اور حضرت عثمان کا تقابل کرتے ہوئے بات کریں' تو وہ کہے گا کہ ابوذر بھی عثمان کی طرح ہیں اور عثمان بھی ابوذر کی طرح۔ ابوذر بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو عثمان چاہتے ہیں' عثمان بھی اس شے کے طلبگار ہیں جو ابوذر طلب کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عثمان بلند عہدے پر ہیں۔ وہ ایسے منصب و مقام پر ہیں جہاں طاقت ان کے پاس ہے۔ ابوذر ایسے مقام پر ہیں جہاں ان کے پاس طاقت نہیں۔ ابوذر عثمان سے مختلف نہیں ہو سکتے اور عثمان ابوذر سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انسان بالجبر مفاد پرستی اور مفاد طلبی کے زیر اثر ہے۔

عمرو بن عبید نامی ایک شخص ایک متکلم ہے' وہ معتزلہ کے چوٹی کے افراد اور مکتب اعتزال کے بانیوں میں سے ہے۔ وہ مشہور شخصیت واصل بن عطاء غزال کا سالا ہے۔ واصل کو مکتب اعتزال کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود ایک غیر معمولی انسان ہے' ایک صاحب فکر شخص ہے اور اس مکتب کا بانی ہے۔ وہ جوانی میں منصور دوانیقی کے دوستوں میں سے تھا۔ منصور جوانی میں ایک عام آدمی تھا' مقہور اور بھگوڑوں میں شامل تھا اور بنی امیہ اسے تکالیف پہنچاتے تھے۔ اس وقت وہ اچھے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بعدازاں دنیا بدل گئی اور منصور خلیفہ ہو گیا۔ منصور کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا قدیمی دوست عمرو بن عبید کسی روز اس سے ملاقات کو آئے اور وہ اسکی کوئی خدمت کرے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے عمرو بن عبید کو بلایا' وہ آ گیا لیکن عمرو بن عبید منصور کے ساتھ بڑی بے رخی سے ملا۔ بالکل اسی پرانی روش کے مطابق۔ حتیٰ اس نے ایک ایسا جملہ کہا کہ منصور کا بیٹا مہدی جو وہاں بیٹھا تھا' ناراض ہو گیا۔ کہنے لگا: خلیفہ سے ایسے بات کیا کرتے ہیں؟ لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ آخرکار منصور کہنے لگا: میرا دل چاہتا ہے کہ تو مجھ سے کوئی چیز مانگ۔ اس نے کہا: میں تجھ سے فقط ایک چیز کی درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ کہ آئندہ مجھے زحمت نہ دینا اور مجھے بلانے کے

لئے کسی کو نہ بھیجنا۔ یہ کہا اور اٹھ کھڑا ہوا اور مضبوط قدموں سے چلتا ہوا واپس چلا گیا۔ منصور نے دیکھا کہ اس آدمی کے سامنے خود اس کی اپنی 'خلافت کی' حکومت کی اور اقتدار کی سب کی تحقیر ہوئی ہے اور واقعاً تحقیر ہوئی بھی تھی' اس نے حیرت سے اس پر نگاہ ڈالی اور پھر یہ شعر پڑھا جو منصور سے معروف ہے:

کلکم یطلب صید

کلکم یمشی رُوید

غیر عمرو بن عبید

''تم سب شکاری ہو (یعنی سب لوگ)' تم سب آرام آرام سے' محکم اور اطمینان کے ساتھ چلتے ہو' سوائے عمرو بن عبید کے' جسے میں شکاری نہیں کہہ سکتا۔''

اس فلسفے میں تضاد کی وجہ مفادات ہیں۔ آقائے طباطبائی کے الفاظ میں دوسروں سے خدمت لینے کی خواہش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔ ایک شخص دوسرے سے خدمت لینا چاہتا ہے' اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے' اس کے مفادات اپنے لئے وقف کرنا چاہتا ہے اور دوسرا بھی اپنے مفادات کا طالب ہے۔ یہاں سے جنگ اور تنازع پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام جنگوں' تنازعات اور تضادات کی بنیاد مفادات ہیں۔

حق و باطل کی جنگ

ایک اور نظریہ ہے جو کہتا ہے کہ ہماری زیادہ تر جنگیں مفادات کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ سے ہوتی ہیں لیکن تمام جنگوں کی وجہ مفادات میں ٹکراؤ نہیں ہوتی۔ حق و باطل کی جنگ بھی ہوتی ہے۔ یعنی انسان کمال کے اس مرحلے اور کمال کی ایسی بلندی پر پہنچ سکتا ہے کہ ایک حقیقت پر ایمان لے آئے اور پھر اپنے اس ایمان کی خاطر اور اپنے ایمان کے راستے میں جنگ کرے' تنازع اور پنجہ آزمائی کرے۔ یعنی ایک فریق اپنے ذاتی مفادات کا حصول چاہتا ہو لیکن دوسرا فریق مفادات کے حصول کا متمنی نہ ہو' بلکہ حقیقت اور اس کے لئے سرگرم عمل ہو' اپنے ایمان کی خاطر جدوجہد کرے'

یہاں تک کہ اپنے مفادات کو اپنے ایمان پر قربان کر دے۔ قرآنِ مجید اہلِ بدر کے بارے میں کہتا ہے:

"قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ."(۱)

فرماتا ہے: کہ اس جنگ میں اور معرکۂ بدر میں اس آمنے سامنے صف بستہ ہونے میں ایک درس موجود ہے، اگر تم نظر اٹھاؤ تو دیکھو گے کہ ایک گروہ صرف اللہ کے راستے میں اور ایمان و عقیدے کی راہ میں جنگ کرتا ہے لیکن (دوسرا گروہ کافر ہے) دوسرے کے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ: وَاُخْرىٰ فی سَبِیلِ الطّاغوت، فی سَبِیلِ الْاَصْنام، فی سَبِیلِ الْاَوْثان، کیونکہ وہ یہ بات نہیں مانتا کہ وہ لوگ عقیدے کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ بت تو ان کے لئے بہانہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے مفادات کے لئے جنگ کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے بارے میں کہتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان کے راستے میں جنگ کی تھی۔

بعض لکھنے والوں کی غلطی

کلی طور پر قرآن کی نظر میں یہ قاعدہ قابلِ قبول ہے۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ قرآن نے ایک اور بات کہی ہے: بعض افراد کے لئے غلط فہمی کا سبب بنی ہے، اور ابتدا یہ غلط فہمی عرب زبان کے مصنفین میں پیدا ہوئی جسے انہوں نے اپنی کتب میں لکھا کہ قرآن طبقاتی تضاد کے اصول کو انسانی زندگی کے بنیادی ترین اصولوں میں شمار کرتا ہے۔ طبقاتی تضاد، یعنی مفادات کی بنیاد پر تضاد۔ دراصل طبقاتی تضاد کے نظریے کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص خوشحال، مالدار اور طبیعی طور پر استحصالی طبقے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ جس نے منافع کو اپنے لئے مختص کر رکھا ہے اور دوسرا شخص محروم اور طبیعی طور پر استحصال زدہ طبقے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک کی طبقاتی وابستگی کا تقاضا ہے

۱۔ تمہارے لئے میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آنے والے ان دونوں گروہوں کے حالات میں ایک نشانی موجود ہے کہ ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کر رہا تھا اور دوسرا کافر تھا۔ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۳)

کہ وہ ایک خاص انداز سے سوچے اور دوسرے کی طبقاتی وابستگی اُس سے دوسرا انداز فکر اپنانے کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ دوسرے سے اپنا حق واپس لے اور دوسرا چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا نہ کرے۔

اس بات میں شک نہیں کہ طبقاتی تضاد دنیا کی ایک حقیقت ہے۔ یہ خود دنیا میں جنگ و جدال کا سبب ہے اور احقاقِ حق کا مسئلہ یعنی اپنے چھنے ہوئے حقوق کے لئے جنگ ایک ایسا اصول ہے جسے اسلام مکمل طور پر قبول کرتا ہے۔ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (اللہ مظلوم کے علاوہ کسی کی طرف سے بھی علانیہ برا بھلا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ نساء۴۔ آیت ۱۴۸)

البتہ قرآن کسی بھی صورت میں تمام تضادات کو طبقاتی تضادات میں محدود اور منحصر نہیں کرتا۔ یعنی قرآن انسانی معاشروں کا تاریخی تجزیہ اس بنیاد پر نہیں کرتا کہ دنیا میں جو بھی جنگ، کشمکش اور تنازع رہا ہے اس کی بنیاد طبقاتی ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ قرآن مسئلۂ تضاد کو قبول کرتا ہے۔ اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ آغاز میں جب ہم نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتے جو کچھ حقیقت سے باخبر تھے انہوں نے تضاد، تنازع اور خونریزی کا مسئلہ اٹھایا۔ لیکن اللہ نے (ان سے) کہا کہ ایک اور چیز ہے جسے تم نہیں جانتے ہو: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ.

اللہ نے ان کی بات کی نفی نہیں کی اور یہ نہیں کہا کہ تم یہ کیا بات کرتے ہو؟ یہ موجود جسے میں خلق کر رہا ہوں ہرگز فساد، خونریزی اور جنگ نہیں کرے گا' تم تو وقوع سے پہلے ہی گواہی دینے لگے ہو' بلکہ (اللہ نے اُن سے) کہا کہ ایک اور حقیقت بھی ہے' جسے تم نہیں دیکھ رہے۔

قرآن کی نظر میں جنگوں کا سبب

پس انسانوں کے باہمی تضاد' خونریزی اور جنگ کا اصول ایک ایسا اصول ہے جسے قرآن قبول کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ."(۱)

اگر اللہ بعض افراد کے ذریعے بعض دوسرے افراد کو نہ روکتا (یعنی دفاعی جنگیں نہ ہوتیں) تو زمین تباہ ہو چکی ہوتی اور زمین نہ رہتی۔ زمین کو بعض جنگوں نے بچایا ہے۔

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللهِ كَثِيْرًا."(۲)

گویا یہاں پر کشیش اور پادریوں کو مخاطب کیا گیا ہے' جو مذہب اور جہاد کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مذہب ہے تو پھر اسکے بعد جہاد کیا معنی رکھتا ہے؟

قرآن کہتا ہے' اگر فساد اور برائی کو روکنے کے لئے جہاد نہ ہوتے' تو حضرت عالی کے یہ معبد بھی نہ ہوتے۔ کلیسا جو عیسائیوں کے عبادت خانے ہیں' یہودیوں کے عبادت خانے' زردشتیوں کے عبادت خانے اور اسلامی عبادت خانے اور کلی طور پر تمام عبادت خانے اپنے وجود کے لئے جہاد و دفاع کے مرہون منت ہیں' وگرنہ معاشرے میں ہمیشہ موجود فاسد و مفسد افراد' جو کسی ایمان و عقیدے کے پابند نہیں ہوتے' اپنا کام کر گزرتے۔ ہم بھی اگر کہنے لگیں کہ دین و مذہب ان کاموں کا مخالف ہے! تو یہ ایسی ہی بات ہے کہ پتھر کو باندھ دیا جائے اور کتے کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔

تاہم اس سب کچھ کے باوجود قرآن اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ تمام جنگوں' تنازعات اور تضادات کی بنیاد طبقاتی ہے۔ طبقاتی اسباب کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور انہیں قبول کرتا ہے اور وجدانی' ایمانی اور مافوق طبقاتی اسباب کو بھی مانتا ہے۔ اسلام اپنی تعلیم و تربیت میں زیادہ توجہ ثانی الذکر سبب کی طرف رکھتا ہے۔ جہاں تضاد طبقاتی ہو وہاں اسلام کی نظر میں اسکی کوئی اہمیت نہیں' اسکی اہمیت اس وقت ہوتی ہے جب تضاد طبقاتی سے ماوراء ہو۔ یعنی جب حق و حقیقت کی خاطر ہو نہ

۱۔ اور اگر خدا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے نہ روکتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱)

۲۔ اور اگر خدا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے نہ روکتا تو تمام گرجے' اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے سب منہدم کر دیے جاتے۔ (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۴۰)

کہ خاص کیفیت اور اپنے خاص مفادات کی خاطر۔ جیسے حضرت علی علیہ السلام کا اپنے دشمنوں سے (تضاد) تھا۔ اگر کوئی شخص علی کا ایک روپے کے برابر بھی حق غصب کر لیتا' تو آپ آخر دم تک احقاق حق سے دستبردار نہ ہوتے۔ دیکھتے کہ دوسرے نے ظلم کیا ہے' میرا حق غصب کیا ہے' میرے لئے لازم ہے کہ اس سے اپنا حق واپس لوں۔ اور آپ اپنا حق لے بھی لیتے۔ لیکن کس لئے؟ کیا اس لئے کہ اس سے تم کیوں فائدہ اٹھاؤ' کیوں نہ میں استفادہ کروں؟ اور جب اپنا حق حاصل کر لیتے تو اسے اپنے اختیار سے مستحقین کے حوالے کر دیتے۔

لہٰذا علی اپنے حق کا دفاع کرتے تھے۔ حضرت زہرا علیہا السلام اپنے حق کا دفاع کرتی تھیں نہ کہ پیسے اور فدک کی زمین کا۔ یعنی (ان کی نظر میں) فدک کی زمین اس لحاظ سے اہمیت کی حامل نہ تھی کہ اس کی آمدنی بہت ہے اور اس کے چھن جانے سے وہ اسکی آمدنی سے محروم ہو گئی ہیں' بلکہ اس لحاظ سے اہمیت رکھتی تھی کہ میرا حق کیوں پامال ہو۔ اور اسلام کی نظر میں حق کا دفاع' مقدس' لازم اور ضروری ہے۔

اپنی معروضات کے آغاز میں ہم نے جس آیت کی تلاوت کی تھی: وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مراعات یافتہ لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہم تمہارے پیغام کا انکار کرنے والے ہیں۔ سورہ سبا ۳۴۔ آیت ۳۴)

یہ آیت اُن آیات میں سے ہے جو تضادات میں طبقات کے کردار کو بیان کرتی ہیں۔ قرآن کا بیان ہمیشہ جامع ہوتا ہے۔ ایک نکتہ بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ بارہا تضادات میں طبقات کے کردار کا ذکر کرتا ہے' البتہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں جو بھی جنگ ہے فقط اور فقط مفادات کی خاطر ہے۔ کم از کم ایک طرف طبقاتی اور مفاداتی پہلو کو مکمل طور پر پیش نظر رکھتا ہے۔

علی الوردی کا قول

یہی وجہ ہے کہ علی الوردی (جو باوجود یہ کہ ایک مارکسی ہے) اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ حق یہ

ہے کہ کارل مارکس سے ایک ہزار سال پہلے یہ مسئلہ قرآن نے اٹھایا ہے: وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مراعات یافتہ لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہم تمہارے پیغام کا انکار کرنے والے ہیں۔ سورۂ سبا ۳۴۔ آیت ۳۴)

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے جہاں بھی کوئی نبی بھیجا اور اس نے حق و عدالت کی آواز بلند کی، (کیونکہ قرآن کی رو سے انبیا حق اور عدالت دونوں کے منادی ہیں، وہ اللہ کی طرف بھی بلاتے ہیں اور عدالت کی طرف بھی) تو خوش حال لوگ، نعمتوں میں ڈوبے ہوئے لوگ ان کے مقابل کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے، یہ سب جھوٹ اور کذب ہے۔ ہم تمہیں نہیں مانتے، تم ایسے ہو ویسے ہو۔

وہ ایسا کیوں کہتے تھے؟

کیونکہ انبیا عدل و انصاف کی صدا بلند کرتے تھے اور امیر، خوشحال اور نعمتوں میں غرق طبقہ محسوس کرتا تھا کہ (اس دعوت سے) اسے نقصان پہنچے گا، لہٰذا وہ انبیا کے خلاف کھڑا ہو جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ ملا، مستکبرین اور مترفین کے نام سے ایک طبقے کا ذکر کرتا ہے۔ جس نبی کا بھی نام لیتا ہے، کہتا ہے کہ اس قوم کے ملا، مستکبرین اور مترفین اس کی مخالفت میں کھڑے ہوئے۔ البتہ قرآن ایک اور گروہ کا ذکر بھی کرتا ہے، جو ان ملا، مستکبرین اور مترفین کا فریب خوردہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے قرآنِ مجید کے بیان کی جامعیت ظاہر ہوتی ہے۔

لیکن کیا قرآن کی منطق یہ ہے کہ جو کوئی بھی خوشحال طبقے سے تعلق رکھتا ہے، لازماً اس کا وجدان دعوت انبیا کی نفی کرتا ہے۔ اور جو کوئی بھی محروم طبقے سے تعلق رکھتا ہے، وہ لازماً نہیں قبول کر لیتا ہے؟

نہیں، قرآن اس بات کو قبول نہیں کرتا۔

یعنی ہم پھر اس نکتے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن کی نظر میں انسان کا وجدان آزاد ہے۔ یہ جو اللہ

نے فرمایا ہے: اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ یعنی اے ملائکہ! تم نے انسان میں ایک چیز کو دیکھا ہے؛ لیکن میں نے انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں ایک ایسی چیز رکھی ہے جو انسان کے ان تمام خاکی پہلوؤں کے باوجود اسکے اندر حقیقت کا چراغ روشن رکھتی ہے۔ ممکن ہے ایک انسان مادی لحاظ سے مالا مال ہو۔ یعنی اس کے پاس اعلیٰ پیمانے پر وسائل و امکانات موجود ہوں لیکن حق پرستی اور حقیقت پرستی اسے حق و حقیقت اور مظلوم کا حامی بنا دے۔ اسکے طرزِ زندگی اور حالات و شرائط نے اسے ظالم طبقے میں رکھا ہو لیکن اس کے وجدان نے اسے مظلوم کا حامی بنا دیا ہو۔ قرآن اس اصول کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

تاریخی مثالیں

موسیٰ بن عمران علیہ السلام وہ ہیں جنہیں حالاتِ زمانہ نے فرعونِ وقت کا اکلوتا بیٹا بنا دیا۔ یعنی فرعونِ وقت کا منہ بولا بیٹا اور مصر کا خوشحال ترین جوان۔

فرعون کے خاندان کو دریائے نیل سے ایک بچہ ملا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے اسے اپنے گھر میں پالا۔ وہ تمام وسائل جو اس زمانے میں کسی انسان کے لئے ممکن تھے موسیٰ کو میسر تھے۔ لیکن اس طبقاتی کیفیت اور فرعون کے منہ بولے بیٹے موسیٰ کا یہ طرزِ زندگی ہونے کے باوجود حق و حقیقت کی حمایت انہیں فرعون سے جدا کر دیتی ہے۔ فرعون اور موسیٰ کے مابین جنگ، تضاد اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے، انتہائی خونین صورتحال اختیار کر لیتی ہے۔ یہ وہی موسیٰ ہیں جو فرعون کے طبقے میں زندگی گزارتے رہے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ طبقاتی اثرات کے علاوہ دوسرے اثرات کا بھی ذکر کرے۔

موسیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ جس طبقے میں زندگی گزار رہے ہیں اس کے ترجمان بن جائیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے افراد ہیں۔ شاید اسکے بعد کی نشست میں، جس میں ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ کے تغیرات میں انبیا و اولیا کے کردار کے بارے میں گفتگو کریں، اس سلسلے میں دیگر مثالیں ذکر کر سکیں۔ دراصل اخلاقی حوالے سے تاریخ کا سبق (تاریخ ہمیں بلند درجے کا

درسِ اخلاق دے سکتی ہے) یہی ہے' وگرنہ اگر تمام تضادات طبقاتی تضادات ہوں' تو اخلاق لحاظ سے سبق آموزی کے قابل نہیں ہو سکتے۔

حسین ابن علی علیہم السلام کا قیام بھی ایسا ہی قیام ہے۔ یعنی حسین ابن علی نے اپنے مفاد کے خلاف قیام کیا۔ (حکمران) خلافت کے سوا ہر چیز انہیں دینے کو تیار تھے۔ یہ بات دشمن نے کہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ خلافت کے سوا آپ جو چاہیں ہم آپ کو دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ معاویہ نے جب پہلے یہ مسئلہ اٹھایا تھا تو کہا تھا کہ نام کی خلافت یزید کے لئے ہوگی اور حقیقی خلافت آپ کے پاس۔ میں ابھی سے اپنے بیٹے کو پابند کر دیتا ہوں کہ وہ کوئی بھی کام آپ کی رائے اور مشورے کے بغیر انجام نہ دے اور جس قدر بھی مالی وسائل آپ چاہیں آپ کے سپرد کر دے۔ اس صورت میں امام حسین' ان کی اولاد اور خاندان کی جان محفوظ رہتی اور آپ حضرات اچھی زندگی گزارتے۔

سانحۂ عاشورا کیوں سبق آموز ہے؟

(یہ سانحہ) اس لحاظ سے (سبق آموز ہے) کہ اگر امام حسین ایک محروم انسان ہوتے۔ یعنی یزید کے خلیفہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر چیز سے محروم ہو جاتے اور یزید کی خلافت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ امام حسین ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے' تو پھر لوگ کہتے کہ امام حسین کیونکہ محروم تھے' اس لئے انہوں نے اپنی محرومیت کی وجہ سے قیام کیا۔ اس صورت میں اس (قیام) کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ اس (قیام) کی گرانقدری اس بات میں ہے کہ یہ قیام ایمان اور عقیدے کی راہ میں تھا۔ (امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:)

"اَلاَ تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لَایُعْمَلُ بِهِ وَالْبَاطِلَ لَایُتَنَاهیٰ عَنْهُ لِیَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِی لِقَاءِ اللّٰهِ حَقّاً۔"

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا؟ نہیں دیکھتے کہ فساد و منکر کس قدر زیادہ ہے اور کوئی نہی از منکر کرنے والا نہیں؟

امام حسین علیہ السلام کے قیام کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں:

"لاأرى الموت الاسعادة والحياة مع الظالمين الابرما."(۱)

یہ بات آپ کے قیام کو قدر و قیمت عطا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک زندگی کی وقعت اور قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ میں کسی ظلم اور ظالم کو نہ دیکھوں۔ میں کسی جھونپڑی میں رہ لوں اور محرومیت کے ساتھ زندگی بسر کرلوں لیکن اپنے معاشرے میں عدالت قائم کردوں' تو یہ زندگی مجھے گوارا ہے۔ لیکن اگر میں بہترین محلات میں رہوں جبکہ دوسروں کو ظلم کی چکی میں پستا دیکھوں' اور ظالم کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ میری نظر میں اس زندگی سے موت بہتر ہے۔

نہ صرف امام حسین علیہ السلام کی زندگی' بلکہ (کربلا کے) بہتر افراد میں سے ہر ایک کی زندگی کے بارے میں تاریخ نے اسی حقیقت کو رقم کیا ہے۔

ایک شخص جس کا نام بشیر حضرمی ہے' انہی دنوں میں جب وہ کربلا میں تھا (یعنی دو محرم تا دس محرم کے درمیان) اسے اطلاع ملی کہ اس کا جوان بیٹا ایک اسلامی سرحد پر کفار کے ہاتھوں اسیر ہوگیا ہے۔ ایک شخص جب یہ سنے کہ اس کا جوان بیٹا کفار کے ہاتھوں میں قید ہوگیا ہے' تو بہت پریشان ہوتا ہے' خصوصاً جب اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اگر کوئی وہاں چلا جائے اور کچھ ہدیہ یا رقم لے جائے تو اسے نجات دلا سکتا ہے' ورنہ وہ ان کے پاس پڑا رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے قتل کردیں یا غلام بنالیں' معلوم نہیں اس کا کیا بنے گا۔ یہ آدمی بہت پریشان ہوا اور اسے یہ حق پہنچتا تھا۔ کسی نے حضرت اباعبداللہ علیہ السلام سے عرض کیا: آپ کے ساتھیوں میں سے فلاں شخص کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے۔ حضرت نے فوراً اسے بلایا اور ایسی قیمتی چیزیں اسے دیں جن کے عوض رقم حاصل کی جاسکتی تھی اور فرمایا: فوراً اس سرحد کی طرف جاؤ اور اس رقم کے ذریعے اپنے بیٹے کو نجات دلاؤ۔ اس شخص نے ایک ایسا جملہ کہا کہ پھر حضرت اباعبداللہ اس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکے۔ عرض کیا: اکلتنی السباع حیا ان فارقتک (درندے مجھے زندہ کھا جائیں اگر میں آپ کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کی تلاش میں چلا جاؤں)

۱۔ میں ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو ذلت اور موت کو سعادت سمجھتا ہوں۔

اس طرح سے انسان اپنے ذاتی اور انفرادی مفادات کو ٹھوکر مار کے گزر جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو قدر و قیمت کی حامل ہے۔

(کربلا میں) ایک ماں تھی جس کا جوان بیٹا تھا' اس کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اتفاق سے وہ اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا (۱)۔ یہ جوان حضرت ابا عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپ سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کی جوان بیوی اس کا دامن پکڑ لیتی ہے اور کہتی ہے: تم کہاں جاتے ہو؟ اور مجھے کس کے سپرد کرتے ہو؟ فوراً اس کی ماں آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے: بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کی باتوں میں آ کر فرزند رسول کی مدد سے ہاتھ کھینچ لو۔ کیونکہ یہ خدا کی طرف سے ایک آزمائش ہے۔

یہ ہے وہ بات جو اس عمل کو قدر و قیمت عطا کرتی ہے اور اس سانحے کو سبق آموز بناتی ہے' کہ اگر مزید ہزارہا برس لوگ بیٹھ کر اس کا تذکرہ کرتے رہیں' تب بھی اس قابل ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے' اس سے سبق حاصل کریں اور اس سے تعلیم و تربیت پائیں۔

وہ جوان جاتا ہے اور آخرکار شہید ہو جاتا ہے۔ اس نے کئی ایک افراد کو قتل کیا اور پھر خود قتل ہو گیا۔ جب اس کی ماں کو خبر ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا مارا گیا' تو وہ ایک لکڑی اٹھا لیتی ہے اور چاہتی ہے کہ جنگ کرے کہ حضرت ابا عبداللہ فرماتے ہیں: اے خاتون! پلٹ آؤ' تم عورتوں پر جہاد ساقط ہے۔ مولا کے حکم پر اس عورت نے کہا: اچھا' اور لوٹ آئی' جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا یہ عمل جذبات کے زیر اثر نہیں تھا۔

دشمن نے جب دیکھا کہ وہ اس کی ماں ہے' تو اس نے اس جوان کے بدن سے سر جدا کر کے اس کی طرف پھینک دیا (اس ماں نے جوان کا سر ان کی طرف واپس پھینک کر کہا کہ: ہم جو چیز راہ خدا میں دے دیتے ہیں اسے واپس نہیں لیا کرتے)۔ (۲) ✿

۱۔ کربلا میں چار پانچ افراد ایسے تھے جو اپنی بیویوں کے ساتھ آئے تھے۔ مرحوم شیخ محمد ساوی نے کتاب ''ابصار العین'' میں ان کے نام اور کوائف ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی والدہ بھی ہمراہ تھیں۔

۲۔ آخری چند سیکنڈ کا کیسٹ خراب ہے۔

اسلامی تاریخ کے تغیر میں واقعۂ کربلا کا کردار ☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمدللّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصّلوۃ والسّلام علی عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ وصفیّہ وحافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ و نبیّنا ومولانا ابی القاسم محمّد(ص) وعلی آلہ الطیبین الطاهرین المعصومین.

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم

"نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَ زِدۡنٰهُمۡ هُدًى وَّرَبَطۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۟ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا." (۱)

☆ یہ خطاب ۱۹۷۳ء میں شب عاشور مسجد امیرالمومنین تہران میں کیا گیا۔

۱۔ ہم آپ کو ان کے واقعات بالکل سچے سچے بتا رہے ہیں۔ یہ چند جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کے دلوں کو مطمئن کر دیا تھا اس وقت جب یہ سب یہ کہہ کر اٹھے کہ ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم اس کے سوا کسی خدا کو نہ پکاریں گے کہ اس طرح ہم بے عقلی کی بات کے قائل ہو جائیں گے۔ (سورہ کہف ۱۸۔ آیت ۱۳، ۱۴)

اسباق تاریخ کے حوالے سے ہماری گفتگو تاریخ کے تغیر میں انبیا کے کردار تک پہنچی۔ ہم اس حوالے سے گفتگو کر رہے تھے کہ اس بات کا اقرار و اعتراف سب لوگ کرتے ہیں کہ دین اور انبیا (جو دین کے لانے والے ہیں) ہمیشہ تاریخ میں ایک حیران کن اور عظیم قوت رہے ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ انہوں نے بہت بڑی قوت تشکیل دی' اور وہ معاشرے کے درمیان صرف ایک تکلفاتی اور خیالی وجود نہیں تھے۔ بحث اس بات پر ہے کہ اس قوت نے کس سمت میں کردار ادا کیا ہے؟ کیا تاریخ کے ارتقا و پیش رفت کی سمت میں اور انسانوں کے کمال کی جانب اس کا رخ تھا یا اس کی مخالف سمت میں؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض افراد (یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مطالعے کی بنیاد پر بلکہ نوآموز افراد کو گمراہ کرنے کے لئے) اپنے پاس سے دین اور انبیا کی تحریک کے لئے ایک فلسفہ گھڑ لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس فلسفے کی بنیاد پر بہر کیف دین ہمیشہ لوگوں کو زندگی سے منہ پھیرنے اور اسے نجس سمجھنے کی دعوت دیتا رہا ہے۔ اس بارے میں کافی گفتگو ہو چکی ہے۔

گزشتہ نشست میں ہم نے ایک جملہ عرض کیا تھا' جس کے بارے میں بعض دوستوں نے ہم سے خواہش ظاہر کی ہے کہ اس حوالے سے مزید گفتگو کریں۔ وہ جملہ یہ تھا کہ: اس میں تو کلام نہیں کہ گزشتہ زمانے میں دین ایک عظیم قوت کی صورت میں تھا' بات دو اور موضوعات کے بارے میں ہے۔ ایک یہ کہ کیا مستقبل میں بھی دین اور انبیا پر ایمان ایک عظیم قوت کی صورت میں باقی رہے گا' یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں دین اور مذہب کا مستقبل کیا ہو گا؟ اور دوسرا موضوع یہ کہ گزشتہ زمانے میں یہ ایک طاقت رہا ہے تو اس کی جہت کیا تھی؟

ہم اس بارے میں گفتگو کرنے پر مائل تھے کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا؟ اور اس کی پیش بینی کیسے کی جا سکتی ہے؟ لیکن ہم صرف اس قدر ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ یہ موضوع بہت اچھا' مفید اور ضروری موضوع ہے اور ایک موقع پر ایک شہر میں ہم اس موضوع پر بات بھی کر چکے ہیں لیکن ان دو باقی ماندہ راتوں میں ہم اس موضوع کا آغاز نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ مستقبل میں جلد ہی دس راتوں میں انشاء اللہ خدا کی مدد اور قوت سے دین و مذہب کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

تاریخ میں ایک شخص کا داخل ہونا

ہماری آج رات کی گفتگو موقع کی مناسبت سے بھی کہ شب عاشور ہے اور گزشتہ دو راتوں کی گفتگو کے تسلسل میں بھی اسلامی تاریخ کے تغیر میں واقعۂ کربلا کے کردار کے بارے میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں امام حسین علیہ السلام اپنی بپا کردہ اس تحریک کے ذریعے آیا تاریخ اسلام میں داخل ہوئے یا نہیں ہوئے؟

یہ جو ہم نے عرض کیا کہ تاریخ اسلام میں داخل ہوئے یا نہیں' اس معنی میں ہے کہ ایک فرد اگر اپنے زمانے کی تاریخ میں ایک موثر عامل نہ ہو اور اس کا کوئی موثر کردار نہ ہو اور وہ مستقبل ساز نہ ہو' تو وہ عملاً تاریخ میں داخل نہیں ہے اور نہیں ہوتا ہے۔

ہمیشہ۔ مین پر کروڑوں اور آج کی طرح اربوں انسان موجود رہے ہیں لیکن ان انسانوں کی اکثریت تاریخ میں داخل نہیں ہوتی' وہ تاریخ میں گم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے زمانے میں ایک انتہائی محدود اور چھوٹے سے دائرے میں' ایک چھوٹی سی کرن اور پانی پر پیدا ہونے والے بلبلے کی طرح ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کے والدین' بہن بھائی' ہمسائے' کاروباری شریک' ہم جماعت' مکہ کے ہم سفر اور ایک محدود حلقے کے لوگ انہیں پہچانتے ہیں۔ وہ دوسروں کے لئے صرف اسی قدر ہوتے ہیں کہ اگر وہ مر جائیں تو ممکن ہے چند سال تک ان کا نام لیا جاتا رہے' سو سال گزرنے کے بعد کوئی انہیں نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ اگر ان کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے پوچھیں تو وہ بھی یکسر واقف نہیں ہوتے کہ کوئی ایسا آدمی دنیا میں موجود تھا یا نہیں تھا۔ یعنی وہ تاریخ میں گم ہو جاتے ہیں۔

آپ گزشتہ تاریخ میں (جب سے تاریخ کا سراغ ملتا ہے سے اب تک کی تاریخ کے ادوار میں) کتنے افراد کا نام و نشان بتا سکتے ہیں؟ ایسے افراد بہت کم ہیں۔ انبیا ہیں جن کے نام باقی ہیں' چند فلاسفہ ہیں جو تاریخ میں شامل ہو گئے ہیں' کچھ علما' موجدین اور تخلیق کار ہیں جو تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں' کچھ سردار ہیں جن کا نام تاریخ میں درج ہو گیا ہے۔ ہر ایک علم میں متعدد افراد تاریخ

کا حصہ بنے ہیں' اُن کا نام اور چھوٹا بڑا کردار تاریخ میں باقی ہے لیکن باقی سب لوگ تاریخ میں گم ہو گئے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام ایک انتہائی بلند منارہ ہیں اور انسانی تاریخ بنانے والے عظیم انسانوں میں سے ہیں۔ آپ نے تاریخِ اسلام میں ایک نہایت عظیم تحول پیدا کیا۔ یعنی ایک ایسا کام کیا جس کی انجام دہی کسی امام ہی کے شایانِ شان ہے' کسی نبی کا سا کام ہے۔

رسول اور امام کا فریضہ

جو کام ایک نبی انجام دیتا ہے وہ ہے کفر و شرک کا براہِ راست مقابلہ' ظلم و بے عدالتی' خرافات اور کفرِ صریح کے خلاف براہِ راست جنگ۔ نبی ایک تحریک وجود میں لاتا ہے' آج کی اصطلاح میں ایک انقلاب بپا کرتا ہے' جو ایک نئی صورتحال کو جنم دیتا ہے۔

امام کی ذمے داری کیا ہے؟

ہم عام طور پر امام کی ذمے داری کے بارے میں کہتے ہیں کہ امام نبی کی وجود میں لائی ہوئی تحریک کا محافظ و نگہبان ہوتا ہے۔

یہ بات درست ہے' لیکن معاملے کی شکل کیا ہے؟

آیئے دیکھیں کہ کس طرح کے معاملات پیش آتے ہیں اور کیسی کیفیت رونما ہوتی ہے جس میں امام کی ضرورت پڑتی ہے اور علی ابن ابی طالب اور حسین ابن علی جیسے افراد کو میراثِ نبوی کی حفاظت کرنا ہوتی ہے۔

یہ محافظت کیسی ہوتی ہے؟

ممکن ہے بعض لوگ یوں خیال کریں کہ نبی ایک ایسے شخص کی مانند ہے جس نے ابتدا میں اس مسجد کو بنایا ہے۔

امام کون ہے؟

امام ایسا شخص ہے کہ جب بانی گزر جائے تو وہ اس عمارت کا محافظ و نگہبان بن جائے۔ اگر

حفاظت ونگہبانی اسی حد تک ہوتی تو ایسی حفاظت عام افراد بھی کر لیتے اور یہ کام زیادہ مشکل نہ ہوتا۔

فکری اور انقلابی تحریکوں میں نفاق کا خطرہ

دنیا میں وجود میں آنے والی فکری' اعتقادی اور ایمانی تحریکوں اور الٰہی اور غیر الٰہی انقلابات کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہ ہے جسے قرآن ''نفاق'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو تحریک وجود میں لائے' لازماً وہ ایک روح اور ایک حقیقت کی مالک ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کہ اسکی ایک روح' حقیقت اور باطن ہے اس کا ایک ظاہر' شعائر اور کھال بھی ہے۔

انسانی تاریخ وطبیعت اور تاریخی تجربات وآزمائشیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جب بھی ایک صحیح' مفید اور انسان کی خدمت گزار تحریک پیدا ہوتی ہے اور جب دشمن محسوس کرتا ہے کہ اس کا مقابلہ اور سامنا کرنے سے وہ کوئی نتیجہ حاصل نہیں کرسکتا تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس سے وابستہ ہوجائے اور خود اس تحریک میں شامل ہوجائے۔ لیکن اس میں شامل ہوکر وہ اس کے چھلکے کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے اندر کو خالی کر دیتا ہے اور کھا جاتا ہے۔ ظاہر کو محفوظ رکھتا ہے اور باطن کو بدل دیتا ہے' یہاں تک کہ تقریباً تمام ہی لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ حقیقت ان کے ہاتھوں میں باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ روح نہیں ہوتی لیکن کھال' جسم اور ہیکل محفوظ ہوتا ہے۔ وہ رنگ آمیزی کے ذریعے ایک مردے کو زندہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اسے اندر سے اس قدر خالی کر دیتے ہیں اور باطن کو ایسا کھوکھلا کر دیتے ہیں کہ وہ ایک عرصے تک بظاہر باقی رہتا ہے لیکن ایک کھوکھلے اخروٹ کی طرح۔ جب باطن ختم ہوجائے (تو کیونکہ کھال اور چھلکا تو اندر کی چیز کی وجہ سے باقی رہتا ہے اور ظاہر کو باطن ہی بچاتا ہے) لہٰذا ایک مدت کے بعد ظاہر بھی خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

امام یعنی وہ نہایت بابصیرت نگاہ جو واقعات کی گہرائی میں اتر جاتی ہے۔ اصطلاحاً کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو جو چیز آئینے میں نظر نہیں آتی' امام اسے خشت خام میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ دیکھ لیتا ہے کہ باطن۔ ہے یا نہیں' حقیقت ہے یا نہیں' حقیقت کی جگہ کس قدر تظاہر آ گیا ہے' کس قدر جو فروشی اور گندم نمائی ہے' گندم دکھا کر لوگوں کو جو بیچ دیتے ہیں۔

یہ چیز فقط دینی تحریکوں اور دینی انقلابات ہی میں نہیں ہوتی۔ دنیا کے تمام انقلابات ایسے ہی ہیں۔ یورپی دنیا میں حریت پسندی کے جو انقلابات پیدا ہوئے' آئینی حکومت کے انقلابات جو ہمارے اور دنیا کے دیگر ممالک میں برپا ہوئے' سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلابات جو دنیا میں آئے ہیں' ان سب کا یہی حال ہے۔

وہ خود بھی اسے قبول کرتے ہیں۔ وہ مدعی ہیں کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً آزادی اور جمہوریت کے اندر ایک (خفیہ) سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے' لوگ بھی (اس کے) حامی ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں اس انقلاب کی شکل تو باقی رہتی ہے اور کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ واقعاً ان کے پاس حقیقت (باقی) ہے لیکن اس طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی کہ ممکن ہے یہ انقلاب اندر سے ختم ہو گیا ہو۔ لہٰذا وہ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس باطن بھی ہو؟ یا انہی کمیونسٹ اور اشتراکی تحریکوں میں جو کم از کم مساوات کی بنیاد پر ہوتی ہیں' کیا عملاً یہ حقیقت ان میں ہے یا نہیں ہے' وہ لوگوں کو معلوم ہوئے بغیر اپنا راستہ بدل لیتی ہیں' پھر وہی استبداد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی روح وہی روح ہے اور شکل انہی کی شکل۔ چینی' جو ہر تھوڑے عرصے بعد کہتے ہیں کہ ہم اپنے انقلاب کی تجدید کر رہے ہیں اور اسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قدرتی طور پر ہر انقلاب کے اندر ایک مشکل کھڑی ہو جاتی ہے (ان کا دعویٰ ہے کہ سوویت یونین کا کمیونسٹ انقلاب خود ایک تجربہ ہے) جس کی وجہ سے انقلاب خود بخود اپنا رخ بدل لیتا ہے' جبکہ اس کا ظاہر محفوظ ہوتا ہے اور اس کا باطن ختم ہو جاتا ہے (ہم اس مشکل کا خاتمہ کر رہے ہیں) ان کا دعویٰ ہے کہ ہم صرف ظاہر اور چھلکے کی حفاظت نہیں کر رہے' بلکہ اس کے باطن کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں' اسے ویسا رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ وہ در حقیقت ہے۔

بعد از رسول منافقانہ تحریک کی جانب قرآن کا اشارہ

بہت عجیب ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ایک بات اشارے کے طور پر آئی ہے' بعد ازاں تفاسیر میں یہ بات بیان ہوئی ہے اور تاریخ بھی تائید کرتی ہے کہ یہ حقیقت ہے:

"وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا کَبِیْرًا۔"(۱)

قرآن کریم اجمالاً نشاندہی کرتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوتے ہوئے ایک خواب دیکھا اور (اسے دیکھ کر) پریشان ہو گئے۔ یہ خواب ایک الٰہی خواب تھا۔ یعنی نیند کے عالم میں رسول اللہ کو ایک حقیقت دکھائی گئی جو رسول اللہ کی پریشانی کا سبب ہوئی۔ تفاسیر میں اس طرح لکھا ہے کہ: رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی مسجد میں جبکہ مسلمان آپ کے منبر کے اردگرد بیٹھے ہیں بندروں کا ایک جتھا (جو دھوکے اور فریب دہی میں ضرب المثل ہے) ان کے منبر پر چڑھ اتر رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک جا کے ان کی جگہ پر بیٹھتا اور نیچے آتا ہے اور لوگ جن کا چہرہ تو منبر کی طرف ہے لیکن وہ الٹے چل رہے ہیں۔ (یہ خواب دیکھ کر) پیغمبر اکرم پریشان ہو گئے اور سمجھ گئے کہ یہ ان کے دین پر آنے والی کوئی مصیبت ہے اور یہ مصیبت اس صورت میں آئے گی کفار باہر سے آ کر اسلام کو جڑ سے ختم نہیں کریں گے' اسے تہس نہس نہیں کریں۔ (کیونکہ) اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (آج کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۳)

یہ بہت عجیب آیت ہے (اس کا مفہوم یہ ہے کہ) آج اسلام اس مرحلے پر آ پہنچا ہے کہ اب باہر کی دنیا سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے' کفار اسلام کی طرف دست درازی سے مایوس ہو گئے ہیں' اُن سے نہ ڈرو' مجھ سے ڈرو' یہ میں ہوں کہ ممکن ہے تم سے اسلام کو واپس لے لوں۔

یہ بہت بڑی بات ہے' اسلام لے کر آنے والے کا خدا کہہ رہا ہے کہ اپنے دین کے بارے میں کفار سے نہ ڈرو' مجھ سے ڈرو' جس نے تمہیں یہ سب نعمتیں دی ہیں اور تم پر عنایتیں کی ہیں' کہیں میں تم سے یہ واپس نہ لے لوں۔

۱۔ اور جو خواب ہم نے آپ کو دکھلایا ہے وہ صرف لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہے' جس طرح کہ قرآن میں قابل لعنت شجرہ بھی ایسا ہی ہے اور ہم لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی سرکشی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۶۰)

یہ کیسے ہوگا؟

خود قرآن نے بیان کیا ہے۔ میں جو خدا ہوں' میرے کام سنت اور قانون کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے کہہ رکھا ہے: اِنَّ اللهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱) اللہ اس وقت تک لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لیں۔ "مجھ سے ڈرو" یعنی خود اپنے آپ سے ڈرو۔ اپنے اندر اور داخل سے ڈرو۔ تمہارے خدا کی کسی سے رشتے داری نہیں ہے۔ اگر تم گمراہ ہو گئے تو اللہ تم سے نعمتیں واپس لے لے گا۔ وہی خدا جس نے رسولِ اکرم کے وجود کے اثر سے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں' وہ فساد اور برائی کے اثر سے تم سے وہ نعمتیں واپس لے لے گا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عالمِ خواب میں یہ کیفیت دیکھی اور غم زدہ ہو گئے۔ جبرائیل امین نے آپ کے لئے اس (خواب) کی تفسیر کی کہ یہ بنی امیہ ہیں جو آپ کے بعد آپ کی امت پر مسلط ہو جائیں گے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب پرانے شعائر کے ذریعے' بت پرستی کے نام پر اور ہبل' لات اور عزیٰ کے نام پر اسلام کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا' مکمل طور پر اسلامی شعائر کی حفاظت کریں گے' اللہ اکبر کی صدا گلدستۂ اذان سے بلند ہوگی' مساجد میں نماز جمعہ و جماعت ادا ہو رہی ہوگی' اسلامی جہاد اور اسلامی سرحدوں کے باہر کفار سے بظاہر جنگ بھی ہو رہی ہوگی لیکن اسلام کی حقیقت اور اسکی روح' جو حقیقی ایمان ہے' خدا ہے' حقیقت ہے اور اسلامی معاشرے کے اندر عدالت' انصاف' انسانیت اور عدم امتیازات ہے۔ یہ چیزیں جو اسلام کی روح اور باطن ہیں وہ ان کے ہاتھوں ختم ہو جائیں گی۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ ان حقائق اور روحوں کو اسلام سے نکال لیں اور اسلام کو ایک کھوکھلے خول' باطن کے بغیر ایک ظاہر' اور ایک اندر سے خالی جسم کی صورت دے دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ ظاہر بھی باقی نہیں رہے گا۔

۱۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱

بنی امیہ حضرت علی کی نظر میں

حضرت علی علیہ السلام نے بنی امیہ کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا:

"اَلا اِنَّ اَخوف الْفِتَنِ عِنْدی عَلَیْکُمْ فِتْنَۃُ بَنی اُمَیَّۃَ فَاِنَّھافِتْنَۃٌ عَمْیاءُ مُظْلِمَۃٌ عَمَّتْ خُطَّتُھاوَ خَصَّتْ بَلِیَّتُھاوَ اَصابَ الْبَلاءُ مَنْ اَبْصَرَفیھا وَ اَخْطَأَ الْبَلاءُ مَنْ عَمِیَ عَنْھا...... وَلایَزالُ بَلاؤُھُمْ حَتّیٰ لایَکُونَ اِنْتِصارُ اَحَدِکُمْ مِنْھُمْ اِلاّ کَاِنْتِصارِ الْعَبْدِ مِنْ رَبِّہٖ وَ الصَّاحِبِ مِنْ مُسْتَصْحِبِہٖ." (۱)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں اپنے بعد جس عظیم ترین فتنے سے ڈرتا ہوں اور مجھے جس کا خوف ہے وہ بنی امیہ کا فتنہ ہے۔ یہ ایک اندھا اور تاریک فتنہ ہے۔ یعنی لوگوں کو ایک مبہم حالت سے دوچار کردے گا کہ انہیں سرے سے کسی چیز کا احساس ہی نہ ہوگا اور وہ اندھیرے میں رہیں گے۔ اسکے اثرات ہر شئے پر چھائیں گے لیکن اس کی بلا اور مصیبت اہل حقیقت کے ایک معین گروہ کے لئے مخصوص ہوگی بالخصوص ان میں سے ایسے افراد کے لئے جو بصیرت و دانائی کے حامل ہوں گے۔ جس کسی کے ذہن میں بھی انہیں تھوڑی سی روشنی کا پتا چلے گا اُس کے تن پر اس کا سر باقی نہ رہے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بنی امیہ کے مستقبل میں ان کے مقابل تمہاری حالت یوں ہوگی جیسے آقا کے سامنے غلام کی ہوتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کریں گے۔

خود حضرت علی علیہ السلام نے اپنے زمانے میں (حضرت علی حضرت عثمان کے بعد خلیفہ بنے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں ظاہری طور پر تو وہ حکمراں تھے لیکن حقیقت میں بنی امیہ کی

۱۔ میرے نزدیک تمہارے لئے سب فتنوں سے زیادہ خوفناک بنی امیہ کا فتنہ ہے۔ جسے نہ خود کچھ نظر آتا ہے اور نہ اس میں کوئی چیز سجھائی دیتی ہے۔ اسکے اثرات تو سب کو شامل ہیں لیکن خصوصیت سے اسکی آفتیں خاص ہی لوگوں کے لئے ہیں۔ جو اس میں حق کو پیش نظر رکھے گا اس پر مصیبتیں آئیں گی اور جو آنکھیں بند رکھے گا وہ ان سے بچا رہے گا۔۔۔۔ اور ان کی مصیبت اسی طرح چھائی رہے گی کہ ان سے داد خواہی ایسی ہی مشکل ہو جائے گی جیسے غلام کے لئے اپنے آقا سے اور مرید کی اپنے پیر سے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۹۱)

حکومت تھی اور انہی کا حقیقی اثر و نفوذ تھا جس کی وجہ سے انتہائی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا) دنیائے اسلام کے باہر سے بالکل آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ حالانکہ ایک سیاستدان ایسے حالات میں لوگوں کو مطمئن کرنے اور داخلی مشکلات سے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے اُنھیں باہر کی طرف متوجہ کرتا ہے اور لوگوں کو فریب دینے کے لئے کہتا ہے کہ: اے لوگو! ہم چین' ترکستان' مغرب اور یورپ میں دشمن سے جنگ کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ جبکہ حضرت علی نے اپنی خلافت کے پہلے ہی دن اعلان کر دیا کہ میں اندرونی حالات کی اصلاح کروں گا۔

ایسا اسلام جس کا ظاہر باقی ہو اور باطن اور روح نہ ہو وہ ساری دنیا کو بھی فتح کر لے تب بھی اس کی کوئی قیمت نہیں۔ قیمت اس اسلام کی ہے جس میں روح اور معنویت موجود ہو۔ ایسا اسلام جس کا حکمراں معاویہ جیسا فرد ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شدید داخلی مسائل اور مشکلات کے باوجود حضرت علی کی خلافت تاریخ اسلام میں ایک اہم موڑ (turning point) کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ اسلام کے اندر' دنیا کی نسبت سے نہیں' تاریخ اسلام میں۔ یعنی اندر کے معاملات پر توجہ' داخلی اصلاحات اور داخلی دشمنوں کی طرف توجہ کے لحاظ سے۔

یہ اہم موڑ حسین ابن علی کی تحریک میں اپنے عروج پر جا پہنچا۔ امام حسین علیہ السلام نے اس وقت تحریک برپا کی جب معاویہ کو خلیفہ کے عنوان سے برسر اقتدار آئے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے (۱)۔ معاویہ اس سے پہلے بیس سال تک شام پر حکومت کرتے رہے تھے۔ وہ خلیفہ نہیں تھے' لیکن حکومت انہی کی تھی۔ ان کی حکومت نے ان بیس برسوں میں ایک طرح سے اور اس کے بعد خلافت کے بیس برسوں میں دوسرے انداز سے حقیقتاً ایک ایسا کام کیا جس نے اسلام کو اندر سے خالی اور کھوکھلا کر دیا۔ لیکن باہر اُن کی لشکر کشیاں بہت شاندار تھیں اور اُن کی فتوحات بڑی عظیم تھیں' اور ان تمام باتوں نے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ باہر تو انہوں نے فتوحات کیں لیکن اندر

۱۔ اس مقام پر چند سیکنڈ کی کیسٹ خراب ہے۔

وہ خود اسلام سے برسرِ پیکار رہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ آخر عمر تک ان کے اندر سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کینہ نہ گیا تھا' چہ جائیکہ دوسرے افراد سے۔ امتیازی سلوک کا جو سلسلہ حضرت عثمان کے دور سے شروع ہوا تھا وہ معاویہ کے دور میں اپنے عروج تک جا پہنچا۔ یعنی وہ اسلام جس میں سیاہ و سفید' عرب و عجم' غنی و فقیر نہیں' جس میں اونچ نیچ نہیں ہے۔ انہوں نے آ کر ایک ایسا طبقاتی اسلام بنا ڈالا جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہ ہو۔ واقعاً اگر علی' حسین ابن علی اور ائمہ' اظہار مقابلہ نہ کرتے تو انہوں نے ایک ایسا اسلام گھڑ لیا تھا کہ کوئی کفر بھی جس کے برابر نہ ہوتا۔

اسلام کی تباہی کے لئے ان کے اقدامات

اُن کا پہلا کام یہ تھا کہ اسلام نے جس عربی قومیت وملیت کے تعصب کا گلا گھونٹا تھا' انہوں نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ: جہاں تک ہو سکے اپنے بچوں کو شعر یاد کرواؤ۔ دورِ جاہلیت کے وہ اشعار جو عربوں کے زمانہ جاہلیت کی ثقافتی میراث تھے۔ وہ لوگوں کو جاہلیت کے اخلاق و عادات کی طرف لوٹانا چاہتے تھے۔ اُن کے امتیازی سلوک کا سلسلہ یہاں تک جا پہنچا کہ انہوں نے لکھا کہ جب تک کوئی عرب موجود ہو کسی غیر عرب کو جماعت کی امامت کا حق نہیں ہے اور جب تک کوئی عرب موجود ہو کسی غیر عرب کو جماعت کی پہلی صف میں شرکت کا حق نہیں اور ایسے ہی دوسرے امتیازی اقدامات۔ انہوں نے وہ تمام عوامل جو دنیائے اسلام میں تھے انہیں اپنے مفاد میں اور دراصل حقیقتِ اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ جب حضرت عثمان قتل ہو گئے تو ابتدا میں خلیفہ' مظلوم کی حمایت کے نام پر نہایت چالاکی سے گریہ کرتے اور آنسو بہاتے تھے۔ وہ کہتے تھے: لوگو! اسلام گیا' خلیفۂ رسول کو مسندِ خلافت پر مار دیا گیا۔

حضرت علی نے ایک مکتوب میں انہیں لکھا: حضرت عثمان کے قتل کے سب سے پہلے ذمے دار تم خود ہو (وہ پہلا شخص جس نے حضرت عثمان کے قتل میں معاویہ کے دستِ جرم کی نشاندہی کی علی ہیں اور آج تاریخ اس رائے کی تائید کرتی ہے) جب تک تم زندہ عثمان سے فائدہ اٹھا سکتے تھے تم زندہ عثمان کے حامی تھے اور جس دن تم نے محسوس کیا کہ تم مردہ عثمان سے بہتر فائدہ اٹھا سکتے ہو

تو تم نے عثمان کو چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ تم نے تحریک دی اور کوشش کی کہ عثمان قتل ہو جائیں۔ تا کہ تم ان کی لاش سے بہتر فائدہ اٹھا سکو۔ اور تم نے ایسا ہی کیا۔

وہ سب لوگ جو صفین میں جمع ہو گئے تھے ان کی اکثریت علی ابن ابی طالب سے ''قربۃً الی اللہ'' جنگ کر رہی تھی۔ ان کا شعار یہ آیت قرآن تھی: وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا. (۱)

آیتِ قرآن ہے کہ: اگر کوئی مظلوم قتل ہو جائے تو اس کے ورثا کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کے خون کا مطالبہ کریں۔ معاویہ حضرت عثمان کے رشتہ دار اور ان کے نزدیکی ترین فرد بن کر اب ان کے خون کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے: قاتلینِ عثمان علی کے ارد گرد موجود ہیں انہیں میرے حوالے کیا جائے۔ وہ خود علی کو بھی طلب کر رہے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ قاتلینِ عثمان کے نام پر حضرت علی کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

عجیب یہ ہے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک علی زندہ تھے' معاویہ ہمیشہ قاتلینِ عثمان کا ذکر کرتے تھے اور جب حضرت علی کی شہادت واقع ہو گئی تو پھر اس سلسلے کو چھیڑنا بنی امیہ کی سیاسی مصلحت کا تقاضا نہ تھا۔ وہ قاتلینِ عثمان جن کے نام پر انہوں نے جنگِ صفین برپا کی تھی' چودہ ماہ تک یہ جنگ لڑی گئی اور دسیوں ہزار افراد خونِ عثمان کے مطالبے اور قاتلینِ عثمان کے تعاقب کے نام پر قتل ہو گئے اور جب علی' جو معاملے کا موضوعِ اصلی تھے باقی ہر چیز بہانہ تھی' جب وہ چلے گئے تو معاویہ نے ایک دم سکوت اختیار کر لیا اور قاتلینِ عثمان کا نام تک نہ لیا اور یہ نہ کہا کہ اب جب اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے تو ہم ایک کمیٹی تشکیل دیں گے تا کہ واضح ہو جائے کہ قاتلینِ عثمان کون لوگ تھے۔ پھر انہوں نے اس بارے میں ایک جملہ تک نہ کہا۔ اور ان لوگوں کو بھی احساس نہ ہو سکا کہ قاتلینِ عثمان کے نام پر جو اس قدر خون بہایا گیا ہے' اب جب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے تو انہیں سزا کیوں نہیں دیتے؟ وہ کہتے تھے: اس وقت اسلام کی مصلحت تقاضا نہیں کرتی۔

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۳

انہوں نے روحانی عناصر سے بھی فائدہ اٹھایا۔ یعنی صحابۂ رسول میں سے چند افراد جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی اور انہیں لوگوں کے درمیان ایک معنوی و روحانی احترام حاصل تھا۔ معاویہ نے ان کی خدمات حاصل کیں (ان میں سے جو لوگ مالِ دنیا کے اسیر وہ شیفتہ تھے) ان پر پیسہ خرچ کیا اور انہوں نے معاویہ کی مرضی کے مطابق احادیث رسول گھڑنی شروع کردیں۔ معاویہ نے حدیث سازی اور جعلی احادیث کا کارخانہ قائم کردیا۔ ایک ذلیل شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آیت: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنی جان کو اللہ کی رضا کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۰۷) عبدالرحمٰن ابن ملجم کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

وہ ہستی جس سے معاویہ سب سے زیادہ ڈرتے تھے' یہاں تک کہ اس کی شہادت کے بعد بھی اس سے خوفزدہ رہتے تھے' یعنی جس کی یاد بھی انہیں دہشت زدہ کردیتی تھی' وہ علی تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علی قتل ہو کر ختم نہیں ہوگئے ہیں' وہ قتل ہونے کے بعد ایک قوت کی صورت میں اسلامی معاشرے میں ظاہر ہوئے ہیں' یہاں تک کہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ قوی ہوگئے ہیں۔ یعنی لوگ آپ کی زندگی میں آپ کی قدر نہ جان سکے تھے لیکن اب وہ علی کی قدر جان چکے ہیں۔

خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا: جب تک میں زندہ ہوں تم میری قدر نہ جانو گے لیکن جب میں چلا جاؤں گا تو اسکے بعد میری آرزو کیا کرو گے۔

معاویہ نے حضرت علی پر سب و شتم کو رائج کیا' تاکہ علی کا نام ذہنوں سے نکل جائے' بلکہ ایک بری یاد کے طور پر تبدیل ہو جائے۔ کیونکہ نامِ علی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پس ذہنوں میں اس کی صورت الٹ ہو جائے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں اس نسل سے سروکار نہیں' ہمیں ایسا کام کرنا چاہئے کہ آئندہ نسلیں متفقہ طور پر علی کو اسلام کا دشمن نمبر ایک سمجھیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہر نمازِ جمعہ میں منبروں پر' یہاں تک کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول پر علی ابن ابی طالب پر قربۃً الی اللہ سب و شتم اور لعنت کی جائے۔

انہوں نے جو دوسرا کام کیا وہ زہر دے کر مارنے کا نہایت گھٹیا' ناپاک اور بزدلانہ عمل تھا' جس کی اسلام میں کسی صورت کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ دنیائے اسلام میں اس کام کے لئے معروف ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو'ان دشمنوں کو جن کے لئے انہیں کوئی دوسرا راستہ نہیں ملتا تھا' زہر دے کر ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ اس طریقے سے شہید کیے جانے والوں میں سے ایک امام حسن مجتبیٰ تھے' اسی طرح آپ کی اولاد اور خدمت گاروں میں سے بھی چند افراد تھے۔ یہاں تک کہ لکھا ہے کہ سعد بن ابی وقاص کو بھی معاویہ نے زہر دیا تھا۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو۔ معروف سردار خالد بن ولید کا ایک بیٹا عبدالرحمٰن نامی تھا۔ عبدالرحمٰن بھی خلافت کا خواہشمند تھا۔ معاویہ نے جب یہ دیکھا کہ اسکے سر میں خلافت کا سودا سمایا ہوا ہے' تو اسے زہر دے کر ختم کر دیا۔ مالک اشتر نخعی جب کوفہ سے مصر جا رہے تھے' تو ان کے لئے معاویہ نے اپنے جاسوسوں کو مقرر کیا۔ ان جاسوسوں نے راستے میں ایک منزل پر میزبان بن کر مالک اشتر کی دعوت کی اور زہر ملا شہد مالک کو کھلا کر انہیں مار ڈالا۔

ایک اور برا کام دشمن کا سر نیزے پر چڑھانا تھا۔ یہ وہ قساوت تھی جسے صرف عرب کی جاہلیت ہی پسند کرتی تھی۔ دنیائے اسلام میں اس بری سنت کو معاویہ نے جاری کیا۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے عمرو بن حمق خزاعی کو قتل کیا اور ان کا سر مقدس نیزے پر چڑھایا۔ بعد ازاں یہی کام یزید نے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں کیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ انہی نے بنی امیہ کی اصل سیاست کا اجرا کیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان بوڑھا ہو چکا تھا اور نابینا تھا۔ ایک محفل میں اس نے پوچھا: یہاں ہمارے اپنے سوا تو کوئی موجود نہیں؟ ایک شخص نے کہا: نہیں ہے' حالانکہ چند دوسرے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ پکارا: یابنی اُمیّة تلقفوھا تلقّف الکُرۃ اما والّذی یحلف بہ ابوسفیان لاجنّۃ ولانار مازلتُ ازجوھالکمُ ولتصیرنّ الی صبیانکم وراثۃ۔ یعنی: اے بنی امیہ! خلافت کی گیند تمہارے ہاتھ آ گئی ہے' اب فقط ایک دوسرے کی طرف اس کا پاس دینا۔ اسے اپنے سے باہر نہ نکلنے دینا۔ ان باتوں میں نہ آنا کہ کوئی جنت ہے اور جہنم ہے

اور آخرت ہے' کچھ بھی نہیں ہے' مطمئن رہو' ملک ہے اور سلطنت ہے' اسے ہمیشہ اپنے لئے محفوظ رکھنا۔ خلافت کو اپنی وراثت بنالینا۔ اب شوریٰ وغیرہ کا سلسلہ بالکل ختم ہو جانا چاہئے۔

معاویہ نے اپنے باپ کی اس وصیت کو اپنے زمانے میں جاری کیا۔ انہوں نے پہلی بار موروثی خلافت کو عملی شکل دی' جس کے مطابق ایک باپ اپنے بیٹے کو مقرر کرتا ہے اور خلیفہ اس کے ذاتی تعین سے بنتا ہے نہ کہ حاکمیت کے ذریعے۔ یہاں تک کہ اس جھوٹے دعوے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی کہ خدا نے اسے معین کیا ہے (کیونکہ ممکن تھا کہ بعض لوگ یقین کر لیتے اور قبول کر لیتے کہ یزید کو اللہ نے مقرر کیا ہے) بلکہ انہوں نے کہا کہ میں نے معین کیا ہے اور تم اسے قبول کرو۔

اب دیکھئے کہ تاریخ اسلام میں کیسے حالات پیدا ہو گئے ہیں اور کس طرح اسلام کا ظاہر مکمل طور پر محفوظ ہے اور اس کا باطن اس طرح عیب دار ہو رہا ہے۔

امام حسین کی تحریک تاریخِ اسلام کا ایک اہم موڑ

ایسے حالات میں حسین ابن علی نے قیام کیا اور اپنے قیام کے ذریعے تاریخ اسلام میں ایک تغیر پیدا کیا۔ انہوں نے لوگوں کو بیدار کیا' انہیں بتایا کہ اسلام وہ نہیں جو بنی امیہ بتاتے ہیں' یہ اسلام کا ظاہر ہے باطن نہیں۔ آٹھ ذی الحجہ کو جب سب لوگ حج کی طرف آ رہے تھے' وہ حج جو بنی امیہ کے قبضے میں تھا' وہ حج جو بظاہر حج تھا لیکن بباطن حج نہیں' امام حسین عین اسی وقت مکہ سے رخ موڑ کر کربلا کی طرف کر لیتے ہیں۔ جس روز مدینہ میں آپ کو بیعت کے لئے بلایا گیا اور آپ بیعت کے لئے تیار نہ ہوئے' حالانکہ مروان بن حکم نے بڑا زور لگایا اور کہا کہ اگر حسین آج یہاں پر بیعت نہ کریں تو انہیں یہیں قتل کر دو' ان کا خاتمہ کر دو۔ مدینہ کا گورنر جو نسبتاً نرم مزاج آدمی تھا' وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ امام حسین نے اسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ ایسے خطرے کا امکان ہے۔

امام حسین علیہ السلام مسجد مدینہ میں تھے۔ عبداللہ ابن زبیر بھی مسجد میں بیٹھا تھا۔ حاکم مدینہ کے کارندے نے ان دونوں کو حاکم کے پاس آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا: تم جاؤ' ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔ عبداللہ ابن زبیر نے امام سے پوچھا کہ اس وقت انہوں نے ہمیں کس

لئے بلایا ہے؟ امام حسین نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ان کا طاغوت مر گیا ہے اور ہمیں بیعت کے لئے بلا رہے ہیں۔ ہاں' ایسا ہی تھا۔ انہوں نے امام حسین کو اپنے گھر میں بلایا تھا۔ امام حسین نے اندازہ کر لیا تھا کہ ممکن ہے وہاں وہ آپ سے بیعت طلب کریں۔ اور ان کے انکار کی صورت میں یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں باہر نکل کر یہ ہمارے خلاف کھڑے نہ ہو جائیں بہتر یہ سمجھیں کہ انہیں یہیں ختم کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ امام حسین بنی ہاشم کے چند افراد کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ ان سے فرمایا: تم دروازے کے پیچھے کھڑے رہنا اور اگر دیکھو کہ میری آواز بلند ہوئی ہے تو اندر داخل ہو جانا۔ لیکن اس کی ضرورت نہ پڑی۔ اولاً خود حاکم مدینہ تیار نہ ہوا' ثانیاً امام حسین نے پہلے سے جو اندازہ لگایا تھا اور اسکے تدارک کا اہتمام کر رکھا تھا اس نے انہیں موقع نہ دیا۔ معاملہ الٹ ہو گیا۔ جوں ہی مروان نے یہ جملہ کہا' ابا عبداللہ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا اور کہا: تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟ اس طرح یہ ماجرا ختم ہوا۔

ایک روز یہی مروان ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر حضرت ابا عبداللہ پر پڑی۔ نزدیک آیا اور بہت نرمی کے ساتھ سلام و اکرام کے بعد کہا: یا ابا عبداللہ! میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں' میری بات سنیں' اگر آپ یزید کی بیعت کر لیں تو آپ کو ہر چیز میسّر آ جائے گی۔ آپ کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں۔

امام حسین نے اسے کیا جواب دیا؟

یہ نہیں فرمایا کہ میری ذاتی مصلحت کا یہ تقاضا نہیں' بلکہ فرمایا: اگر بیعت کر لوں تو پھر اسلام کا کیا بنے گا؟

"وَعَلَى الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ."

"اور پھر اسلام پر سلام ہے اگر امت یزید جیسے حکمراں کی حکومت میں مبتلا ہو جائے۔" (مقتل حسین' مقرم۔ ص ۱۴۶)

یعنی یہ جو تو کہہ رہا ہے کہ میں یزید سے صلح کر لوں اور اس کی بیعت کر لوں' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ کے لئے اسلام کی بربادی کے پروانے پر دستخط کر دوں' اور ایسا ناممکن ہے۔

اسلام اور اسلامی خلافت میں جدائی

یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ امام حسین کی تحریک تاریخ اسلام کا ایک انتہائی اہم موڑ ہے۔ اس دن سے خلافت اور امورِ مسلمین پر مسلط لوگوں کا مسئلہ مکمل طور پر اسلام سے جدا ہو گیا۔ اور یہ عالمِ اسلام میں ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بعد سے دنیائے اسلام کے اندر اسلام کے حق میں اور مرکزِ خلافت کے خلاف تحریکیں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ خلافت ایک طرف ہو گئی اور اسلام دوسری طرف۔ خلافت کے چہرے پر پڑی نقاب اُلٹ گئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ اسلام اور خلافت کو ایک نہیں سمجھنا چاہیے۔ حقیقتِ اسلام کہیں اور ہے۔ بلکہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہی لوگ ہیں جو اسلامی خلافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں۔

اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو جو قومیں اسلام کی طرف آئیں تھیں، وہ اگر رسولِ اسلام کے خلفا کو اس شکل میں دیکھتیں تو کہتیں کہ ہمیں کیا معلوم، شاید خود پیغمبر (نعوذ باللہ) ایسے ہی ہوں۔ کیونکہ ہم اُن کے خلفا کو تو ایسا ہی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب آلِ رسول، اولادِ رسول اُن خلفا کے مقابل اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کی مخالفت کرنے لگی، تو مسلمان سمجھ گئے کہ اسلام اور اسلامی خلافت کے مابین فرق کرنا چاہیے۔ یہ فرق حسین ابن علی نے راہِ اسلام میں اپنا خون دے کر قائم کیا۔

ایرانیوں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اسلام کے وفادار ہونے کے باوجود بنی امیہ کے خلاف جنگ کیوں کی؟ اسکی وجہ وہ حقیقت تھی جو علی اور حسین ابن علی کے ذریعے لوگوں کو سمجھائی گئی تھی، اور وہ یہ کہ اسلام ایک چیز ہے اور اسلامی خلفا ایک جدا چیز ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانیوں نے قیام کیا۔ البتہ اُن کا خیال تھا کہ اگر بنی عباس خلیفہ ہو گئے تو وہ حقیقتِ اسلام کا اجرا کریں گے۔ بنی عباس نے بھی ایسے بہت سے وعدے کیے تھے۔ لیکن جب خلافت ان کے ہاتھ میں آ گئی تو انہوں نے بھی بنی امیہ کی روش اختیار کر لی۔ اسی بنا پر بعد میں ایرانیوں نے اپنی سیاسی آزادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اسی دور سے وہ دامنِ اسلام سے اور زیادہ وابستہ ہو گئے اور اپنے آپ کو مرکزِ خلافت سے علیحدہ کر لیا۔ واقعاً آزادی کے ساتھ اسلام کی طرف مائل ہوئے۔

ایرانیوں نے اپنی سیاسی آزادی کے زمانے میں یعنی اس دور میں جب انہوں نے خلافت کو مسترد کر دیا تھا اسلام کی زیادہ خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ بنی عباس بنی امیہ سے کہیں بڑھ کر سیاستدان' دھوکا باز اور منافق تھے اور انہوں نے بہت حد تک دنیا پر یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ان کی خلافت تقدس کا پہلو رکھتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی جگہ کے عہدیدار' امراء اور حکام کو لوگ اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک عباسی خلیفہ کا پروانہ ان کے پاس نہ ہوتا۔ یعنی خلیفہ اُن کی خلافت کی تائید کرتا تو لوگ مانتے۔ اگرچہ خلیفہ کے حکم کی حیثیت رسمی سی ہو کے رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ بعد ازاں ایک نہایت روشن فکر شیعہ عالم پیدا ہوا جس نے اس جھوٹی علامت کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ تھے خواجہ نصیر الدین طوسی۔ انہوں نے کہا: اس خلافت کو کوئی تقدس حاصل نہیں۔ انہوں نے یہ جھوٹی (قداست) گھڑ رکھی ہے۔ البتہ سعدی یہ غلطی کر بیٹھے اور کہا:

آسمان بر حق بود گر خون ببارد بر زمین
از برای مرگ مستعصم امیر المؤمنین

جبکہ خواجہ نصیر الدین طوسی کہتے تھے کہ آسمان خون نہیں برسائے گا اور اس کا حق بھی نہیں کہ خون برسے۔ وہ ایک شیعہ عالم تھے' انہوں نے اس قدر جرأت کی کہ اس غاصبانہ اسلامی خلافت کا اسلام کے حق میں خاتمہ کریں' خواہ یہ کام منگولوں کے ہاتھوں ہی ہو۔ کیونکہ کفر صریح' کفر مستور پر انتہائی فوقیت رکھتا ہے۔ مستعصم میں اور چنگیز اور منگولوں میں (درحقیقت) کوئی فرق نہ تھا' سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے چہرے پر اسلام کی ایک جھوٹی نقاب چڑھا رکھی تھی' جبکہ ان کے پاس یہ نقاب نہ تھی۔ جس کے چہرے پر یہ نقاب نہ ہو اس کا خطرہ اس سے کم ہے جس نے یہ نقاب پہن رکھی ہو۔ ان کا یہ اقدام حسین ابن علی سے حاصل کیے ہوئے اسی سبق کا نتیجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام نے اپنے چہرے پر جو ماسک پہن رکھا ہے اسے نوچ ڈالا جائے۔

نویں محرم کی عصر کے واقعات

آج ہی کی طرح کی ایک عصر تھی کہ عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے کربلا میں ایک دو ٹوک

حکم پہنچا۔ عمر سعد ایسے افراد میں سے تھا جو خدا کو بھی چاہتے ہیں اور خرما کو بھی' دین کو بھی چاہتے ہیں اور دنیا کو بھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس سے جو وعدے کئے گئے ہیں وہ بھی پورے ہو جائیں ملک "رے" بھی اسے مل جائے اور حسین ابن علی کے خون سے بھی اس کے ہاتھ آلودہ نہ ہوں۔ وہ پے در پے خطوط لکھ رہا تھا اور سفیر پر سفیر بھیج رہا تھا تا کہ معاملے کی کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ جنگ بھی پیش نہ آئے اور اس کا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اس نے عبیداللہ ابن زیاد کے نام جو آخری خط لکھا وہ ایک ایسا (موثر) خط تھا کہ قریب تھا کہ عبیداللہ ابن زیاد' عمر سعد کی تجویز قبول کر لیتا۔ ان میں سے ایک آدمی شمر ابن ذی الجوشن جو اس مجلس میں ایک طرف بیٹھا تھا' اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا: اے امیر! عمر سعد کی تجویز درست نہیں ہے۔ حسین کو نہ چھوڑ' اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا اور ان کے قیام اور تحریک کا دامن پھیل گیا اور ساری دنیائے اسلام کو خبر ہو گئی' تو پھر وہ قوی ہو جائیں گے اور تم کمزور۔ یہ سن کر ابن زیاد کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کوئی آدمی نیند سے جاگ اٹھتا ہے' کہنے لگا:

اَلْیَوْمَ قَدْ عَلِقَتْ بِهِ مَخَالِبُنَا

یَرْجُو النَّجَاةَ وَلَاتَ حِینَ مَنَاصٍ

یعنی: آج حسین ہمارے چنگل میں ہے اور ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ حسین اب ہمارے چنگل سے نکلنا چاہتا ہے؟ ایسا محال ہے۔

اسے عمر ابن سعد پر بھی غصہ آیا کہ وہ یہ کیسی تجاویز دے رہا ہے۔ اس نے اسکے نام ایک خط لکھا کہ ہم نے تجھے اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ تو ایسی بے ہودہ باتیں لکھ کر بھیجتا رہ۔ تو اگر حسین سے جنگ کے لئے تیار ہے' تو میرا یہ خط جوں ہی تجھے ملے فوراً جنگ شروع کر دے۔ اور اگر تو تیار نہیں تو ایک طرف ہو جا اور لشکر کی کمان اس شخص کے سپرد کر دے جو یہ خط لے کر آ رہا ہے۔ نیز اس نے ایک خفیہ خط شمر کو بھی دیا' کہا کہ اگر تو دیکھے کہ وہ جنگ کے لئے تیار نہیں' تو تو خود کمان سنبھال لے اور فوراً عمر ابن سعد کی گردن اڑا کر اس کا سر میرے پاس روانہ کر دے۔

نویں محرم' عصر کا وقت تھا کہ ابن زیاد کا یہ شدید اور سخت مکتوب عمر ابن سعد کے پاس پہنچا۔

اس نے اس کا مطالعہ کیا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے شمر کی طرف دیکھا اور کہا: میرا خط موثر ہو سکتا تھا لیکن تو نے نہ ہونے دیا۔ شمر بولا: بہر حال یہ بتا کہ اب تیرا کیا ارادہ ہے؟ امیر کے حکم کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں؟ کہنے لگا: ہاں' خود اس پر عمل کروں گا۔ (شمر نے کہا) میں کیا کروں؟ تو پیادہ فوج کی کمان سنبھال لے۔ اسی وقت اس نے ایک عام حکم جاری کر دیا: یا خیل اللہ ارکبی و بالجنۃ ابشری۔ ہمیں ابھی اسی وقت حملہ کرنا چاہئے' حسین ابن علی کو مطلع کئے بغیر۔

غروب کا وقت قریب ہے' امام حسین ایک خیمے کے باہر اس حالت میں تشریف فرما ہیں کہ شمشیر اُن کے زانوؤں پر رکھی ہے' ہاتھ شمشیر کے اوپر ہیں اور سر ہاتھوں کے اوپر رکھے محو خواب ہیں۔ حضرت زینب علیہا السلام لشکر کے ہمہمے' گھوڑوں کی ٹاپوں اور اسلحوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز سن کر خیمے سے باہر آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ سمندر کی لہروں کی طرح ایک فوج گھیرا تنگ کر رہی ہے۔

بولیں: بھیا! بھیا! شور سن رہے ہیں؟ امام حسین نے سر اٹھایا۔ ایک نظر ڈالی لیکن زیادہ توجہ دیئے بغیر فرمانے لگے: میں نے ابھی ابھی خواب میں اپنے نانا رسول اللہ کو دیکھا ہے' وہ مجھ سے فرما رہے تھے: حسین! عنقریب تم مجھ سے آملو گے۔ بھائی ابی الفضل! فوراً جاؤ' دیکھو کیا نئی خبر ہے' یہ کیا چاہتے ہیں؟ ایسا تو طے نہ پایا تھا' کیا نئی بات پیش آگئی ہے؟

جناب ابی الفضل سپاہ حسینی کے چند سرداروں کے ہمراہ فوراً سوار ہوئے اور لشکر کے سامنے گئے۔ کہنے لگے: کیا خبر ہے؟ کیا کوئی نئی بات پیش آئی ہے؟ میرے بھائی حسین کہتے ہیں کہ اس وقت جنگ کی بات تو نہیں ہوئی تھی' کیا کہتے ہو؟

وہ کہنے لگے: امیر کا حکم پہنچا ہے کہ جونہی خط پہنچے تو یا جنگ یا تسلیم۔ جاؤ اپنے بھائی کو بتا دو' کیا وہ تیار ہیں کہ اسی وقت سر تسلیم خم کر دیں تاکہ ہم انہیں ابن زیاد کے حوالے کر دیں؟ اور اگر وہ اس پر آمادہ نہیں' تو ہم ابھی اسی وقت جنگ کریں گے۔ فرمایا: میں تمہارا پیغام اپنے بھائی تک پہنچاتا ہوں اور ان سے جواب لیتا ہوں۔ حضرت ابی الفضل فوراً کیلئے واپس گئے۔ دوسرے اصحاب وعظ و نصیحت کرنے لگے' خطاب کرنے لگے۔

(حضرت ابی الفضل نے جا کر بتایا کہ) بھیا! یہ لوگ ایسی بات کر رہے ہیں۔ فرمایا: سرِ تسلیم خم کرنا تو محال ہے' کیا میں ان کے سامنے سر جھکا دوں تا کہ میری قسمت کا فیصلہ وہ کریں؟ واللہ میں ان سے جنگ کروں گا۔ لیکن ایک چھوٹی سی خواہش ہے' دیکھو وہ قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ میری خواہش یہ ہے کہ وہ کل تک صبر کرلیں' کل جنگ کریں گے۔ اسکے بعد اس التوا کی وجہ بیان کرنے کی غرض سے فرمایا: اللہ جانتا ہے کہ مجھے اس سے مناجات کرنا کتنا پسند ہے' میری خواہش ہے کہ آج کی رات میں اپنے اللہ کے ساتھ راز و نیاز میں بسر کروں۔

جناب ابی الفضل آئے اور فرمایا: میرے بھائی کہتے ہیں کہ میں تم سے جنگ کروں گا' سر نہیں جھکاؤں گا۔ لیکن میرے بھائی کی تم سے ایک خواہش ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کل تک صبر کرلو۔

ایک گروہ جو اپنے آپ کو نظم وضبط کا بڑا پابند ظاہر کر رہا تھا' کہنے لگا: امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔ امیر کا حکم ہے کہ خط ملتے ہی جنگ کا آغاز کردو۔ اب جبکہ خط پہنچ چکا ہے ہم اسکی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ لیکن دوسرا گروہ جو ان کی نسبت کچھ آزاد سوچ رکھتا تھا' کہنے لگا: حق یہ ہے کہ ہمیں مہلت دینا چاہئے۔ وہ پہلا گروہ اصرار کر رہا تھا کہ نہیں' ہم صبر نہیں کریں گے۔ یہ گروہ زور لگا رہا تھا کہ ہمیں صبر کرنا چاہئے۔ اچانک ان میں سے ایک شخص عمر ابن سعد کے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ عمر ابن سعد! تیری شرم وحیا کہاں چلی گئی؟ ہم کفار اور مشرکین سے جنگ کرتے رہے ہیں' اگر انہوں نے ہم سے ایسی مہلت مانگی ہے تو ہم نے انہیں یہ مہلت دی ہے' اب ہمارے اپنے نبی کا بیٹا ہم سے ایک رات کی مہلت مانگ رہا ہے' تو کیا ہم اسے یہ مہلت نہ دیں؟ عمر ابن سعد نے دیکھا کہ اب ایک حقیقی اختلاف شروع ہو جائے گا اور ممکن ہے اس اختلاف کا نتیجہ خود اس کے خلاف تمام ہو۔ لہذا کہنے لگا: ٹھیک ہے' کل۔ (۱)

۱۔ خطاب کا کچھ آخری حصہ ریکارڈ نہیں ہوسکا۔

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکر و نظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
فقہِ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
عبادت و نماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
سیری در سیرۂ نبوی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
عدلِ الٰہی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)
گفتار ہائی معنوی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)

Cultural Centre of the Islamic Republic

دار الثقلین

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

استاد مرتضیٰ مطہریؒ فروری ۱۹۱۹ء میں ایران کے صوبہ خراسان کے فاریمان نامی قصبے میں پیدا ہوئے جو مشہد مقدس سے بہتر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کے والد حاجی شیخ محمد حسین مطہری ایک ممتاز عالم دین اور بلند کردار بزرگ تھے۔ استاد مطہری نے دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کی۔

بارہ سال کی عمر میں مرتضیٰ مطہری حوزۂ علمیہ مشہد میں داخل ہوئے اور وہاں پانچ سال تک حصول علم میں مشغول رہے۔ بعد ازآں وہ دینی تعلیم کے عظیم مرکز قم چلے گئے جہاں پندرہ سال تک مشہور عالم فلسفی علامہ محمد حسین طباطبائی اور مجاہد کبیر آیت اللہ روح اللہ خمینیؒ سمیت کئی جید علماء کے زیر تربیت رہے اور اسلامی عقائد اور فقہ کی تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ قم سے تہران منتقل ہو گئے۔

تعلیم کے دوران استاد مطہری نے محسوس کیا کہ کمیونسٹ اسلام کے خلاف ایک خفیہ منصوبے پر عمل پیرا ہیں اور وہ اپنے ناپاک ملحدانہ نظریات اسلامی فلسفے میں شامل کر کے اور آیات قرآنی کی مادی تعبیر کر کے اس مقدس دین کو مسخ کرنے اور اس کی روح کو برباد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس عظیم فتنے کا سد باب کرنے کے لئے انہوں نے مارکسی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا تا کہ اس نظریے کا پورا پورا علم حاصل کر کے اس پر صحیح تنقید کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کے کچھ حصے ازبر کر لئے۔

بلاشبہ مارکسزم وہ واحد چیز نہ تھی جس کی جانب استاد مطہری ن
اپنی توجہ مبذول کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تحری
میں تفسیر قرآن، فلسفہ، اخلاقیات، عمرانیات، تاریخ اور کئی ایک
موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی تمام تصانیف کا حقیقی مقصد اسلا
کئے گئے اعتراضات کا جواب دینا اور دوسرے مکاتب فکر کی خامیا
اور اسلام کی عظمت واضح کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے
انہوں نے مخالف نظریات رکھنے والوں کو بحث و مباحثے کی دعوت بھ
دی۔ تاہم استاد مطہری کا عقیدہ تھا کہ مارکسزم اور اسی جیسے دوسر
نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان پر علمی اند
میں تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا حقیقی چہرہ بھی پیش کیا جائے۔

ملحدانہ مکاتب فکر کے پیروکاروں کے لئے استاد مطہری ک
سرگرمیاں ناقابل برداشت تھیں چنانچہ انہوں نے آپ کو دہشت
گردی کے ذریعے منظر عام سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ اپ
مذموم مقاصد میں کامیاب ہوئے اور استاد مطہری یکم مئی ۱۹۷۹ء ک
شہید کر دیئے گئے۔

استاد مطہری کی شہادت ایسا عظیم سانحہ تھی جس پر موت العالم
موت العالم کا مقولہ صادق آتا ہے۔ امام خمینیؒ نے جب یہ روح فر
خبر سنی تو شدت جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں
نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ ”میں اپنے ایک عزیز فرزند س
محروم ہو گیا ہوں۔ میں اس شخص کی موت کا سوگ منا رہا ہوں جو میری
زندگی کا حاصل تھا۔“

ہزاروں فرزندان توحید نے شہید کے جلوس جنازہ میں شرکت کی۔ انہیں حرم معصومہ قم کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

استاد مطہری ایران کے دینی اور ادبی حلقوں کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ وہ ایک عرصے تک تہران یونیورسٹی میں شعبہ الٰہیات اور معارف اسلامی کے سربراہ رہے۔ شہادت کے وقت وہ اسلامی جمہوری ایران کی دستور ساز کونسل کے صدر کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بہت سی معرکتہ آراء کتابیں لکھی ہیں جو فارسی، عربی، ترکی، اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔